فروری 2015

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

دو سلسلے وار تحریریں

لاوارث - چمگادڑ

معاشرتی ناول

وقت شناس

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

MEMBER
APNS
CPNE

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیر اعلیٰ: عامر محمود
مدیر: محمد شفیع

چمگادڑ
8 — ایم اے راحت

زندگی کے نشیب وفراز اور عروج وزوال کی ایک انوکھی داستان جولمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی

خونی کھیل
32 — ایم الیاس

پتھر دل انسانوں کی کہانی جو بڑے سفاک اور درندہ صفت تھے

گڑبڑ جھالا
87 — احمد صغیر صدیقی

امریکا کے رابرٹ، دہشت، جرائم اور پراسرار کہانیوں کے عظیم لکھاری سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا ایک پرتجسس، افسوں بھرا، حیرت انگیز ناولٹ

لاوارث
108 — غزالہ جلیل راؤ

ایک ایسے نوجوان کا قصہ، جس کے باپ کا پتا نہیں تھا.... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آ گیا تھا

روح کا قرب
133 — زبیر احمد

ایک پراسرار کہانی جو ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے اس تصویر کی تکمیل میں صرف رنگ ہی نہیں خون بھی شامل رہا۔

ترقی
147 — محمد بدر منیر

ایک صحافی کی کہانی جو جاسوسوں والی تمام خصوصیات کا بھی حامل تھا

واردات
163 — آر کے ثناگر

سچے جذبوں کو جھوٹے سکوں میں تولنے والے ماہر بیوپاریوں کا قصہ

فروری 2015ء ❁ قیمت 40 روپے ❁ جلد 44 ❁ شمارہ 10

آنکھیں

176 — ایم اے عظیم

ایک نابینا شخص کے احساسات پر بنی
دل کو چھو لینے والی کہانی

ساتھی زندگی کا

182 — سردار احمد نازش

محبت جیسے لازوال رشتے پر بنی دلوں کو چھو
لینے والی کہانی

شاطر

195 — حسن علی

قدم قدم پر خطرے اور جاسوسی سے بھرپور کہانی

باحوصلہ عورت

214 — ماریہ عرفان

ایک باحوصلہ عورت کی عام ڈگر سے
ہٹی ہوئی معاشرتی کہانی

لاش کا انتقام

226 — کاشف اقبال

ایک شخص جو قتل ہو چکا تھا لیکن ------- اچانک ایک
دن وہ قاتل سے بدلہ لینے واپس آ گیا اور پھر -----

مَتی

236 — کرشن چندر

میری اولاد میں صرف لڑکے ہی لڑکے ہوئے' لڑکی کوئی نہیں ہوئی
پر اب متی کے آ جانے سے لگتا ہے' جیسے وہ کمی پوری ہو گئی ہو مگر۔

وقت شناس

242 — سیدہ عطیہ زاہرہ

ایک محبت --- ایک دھوکا --- اور دو قتل کی کہانی

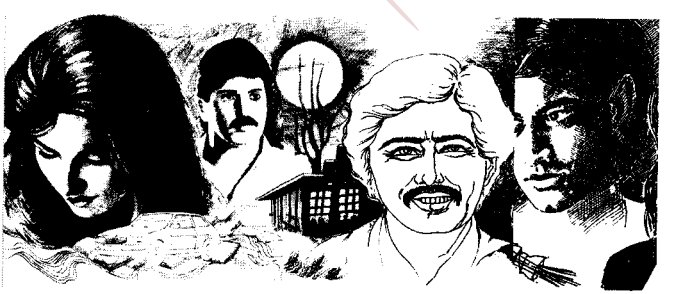

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی

دسویں قسط

چمگادڑ

ایم اے راحت

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کا شکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔

زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ اپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی۔

عمران ڈائجسٹ کا پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکوں اور درختوں کے خوش گوار سایوں نے استقبال کیا۔ دریا کے پار دوسرے کنارے ایک عجیب سی آبادی نظر آرہی تھی۔ کچے پکے مخصوص طرز کے مکانات یہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ہمارے وحشی نگہبانوں نے ہمیں دریا پر پانی پینے اور منہ دھونے کی اجازت دے دی لیکن ہمارے ہاتھ نہیں کھولے گئے تھے۔ بہرحال اس کی ضرورت کوئی بھی محسوس نہیں کررہا تھا۔ پھر ہم دریا پار کی طرف چل پڑے۔ ایک جگہ لکڑی کا ایک بہت بڑا پل بنایا ہوا تھا۔ وہ اسی پل سے گزر رہے تھے۔ پل بہت مضبوط اور کسی خاص تکنیک پر بنایا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم دریا عبور کرکے دوسری جانب پہنچ گئے۔ انوکھی سی بستی آباد تھی۔ جس کا طرز تعمیر بھی مختلف تھا۔ ہماری تعداد چونکہ بہت زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے ہمیں ایک بڑے سے احاطے میں پہنچا دیا گیا۔ ہمیں مخاطب کرکے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ الفاظ تو اب بھی سمجھ میں نہیں آسکے تھے لیکن اشارہ سمجھا جاسکتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے ہاتھ بے شک کھول دیے ہیں لیکن اگر ہم نے کوئی حرکت کی تو ان رائفلوں سے ہماری زندگیاں ختم کردیں گے۔ ہم جانتے تھے کہ ہم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ چنانچہ ہم نے زور، زور سے گردن ہلا کر انہیں اس بات کا اطمینان دلایا کہ ہم ان کے خلاف کوئی بھی عمل نہیں کرسکتے۔

غرض وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ اس بڑے سے احاطے میں کچی دیواروں اور فرش کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم سب خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ چلا گیا اور ہم نے اپنے آپ کو کسی قدر بہتر حالت میں محسوس کیا تو آقا نوشیرواں نے کہا۔

''محسوس کررہے ہو عمران۔۔۔! اور تم لوگ بھی۔۔۔ یہ یقینی طور پر کورنیان قبائل کے لوگ ہیں اور ہمیں جو کچھ بھی سمجھا ہو انہوں نے لیکن بہرحال ہم بری حالت میں ہیں۔ اب اس کے بعد جو بھی قدم اٹھانا ہے وہ سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔''

''لیکن قدم کیا اٹھانا ہے۔'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی کچھ بھی نہیں۔ ہر شخص کو ہدایت کرو کہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھیں۔ اگر کسی کو زندگی کھونے سے دلچسپی ہے تو وہ کوئی عمل کرے، ورنہ سب احتیاط رکھیں۔''

میں نے اس دوران اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہوئے پایا تھا اور خصوصی طور پر اس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس احساس کے ساتھ کہ ان قبائلیوں کو دیکھ کر اس کے اندر کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے یا نہیں، لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی ان سے ناواقف اور خوف زدہ ہے۔

بہرحال وقت گزرتا رہا۔ ہم خاموشی سے بیٹھے رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد مزید تحریک ہوئی۔ وہ لوگ ہاتھ میں لکڑی کے بنے ہوئے پیالے لائے تھے اور ان کے ساتھ ہی بڑے بڑے برتن بھی تھے۔ انہوں نے پیالوں میں کوئی چیز ڈالنا شروع کردی۔ یہ چاول کا شوربہ اور کسی جانور کے گوشت کی بوٹیاں تھیں۔ یہ پیالے ہمیں غذا کے طور پر پیش کیے گئے تھے۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا میرے لیے تو ابھی اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ میں یہ غذا کھاؤں۔ باقی افراد نے بھی وہ چیز لے تو لی تھی، لیکن کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔

وقت گزرتا رہا، اس کے بعد ہمیں غذا وغیرہ بھی دی گئی، لیکن یہ غذا ہمارے کھانے کی نہیں تھی اور ہم سب پریشانی کا شکار تھے کہ اب آگے کیا ہوگا۔ پھر رات ہوگئی اور ہماری پلکیں جڑنے لگیں۔ دن بھر کی تھکن رنگ دکھا رہی تھی۔ ہم سب بھی اسی حالت میں تھے۔ لیکن نیند نے جیسے ہم پر حملہ کردیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ نیند گہری ہوگئی۔ اگرچہ سب ہی کے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ لیکن نیند اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی نیند کی گرفت سے دور نہ رہ سکا۔

دوسرے دن سورج کی روشنی نے ہی ہمیں جگایا

تھا۔ ہم جاگنے کے بعد ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں۔ وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ سب ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ وہ لوگ زیادہ خوف زدہ تھے جن کا تعلق ہم سے نہیں تھا۔ یعنی وہ جنہیں آقا نوشیرواں نے کسی طرح اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔ لڑکیاں واقعی کچھ زیادہ ہی خوف زدہ نظر آ رہی تھیں اور وہ لڑکی بھی کسی قدر پریشان نظر آ رہی تھی۔ میرے پاس بھی اس صورت حال کا کوئی حل نہیں تھا۔

ہمیں دوپہر کا کھانا دیا گیا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے وہ کھانا قبول کر لیا تھا۔ اس کھانے میں بس ایک خاص فرق تھا۔ وہ یہ کہ سیب نما ایک پھل بھی ساتھ رکھا گیا تھا اور کئی گھنٹے کے بعد یہ پھل میں نے معدے میں اتارا تو بدن میں پھرتی سی توانائی محسوس ہوئی۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے چھٹکارا حاصل ہی نظر آتا ہے۔ کوئی بات بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن دوپہر کے بعد جب سورج ڈھل رہا تھا اچانک کچھ افراتفری مچی اور اس کے بعد گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں، سب چونک پڑے تھے، کہیں شور مچ رہا تھا اور آبادی کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ یہ کیا ہوا تھا۔ لیکن ہم خوف زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ آنے جانے والے لوگ برق رفتاری سے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ایک تصور پیدا ہوا، ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ جو پہرے دار ہم پر پہرہ دے رہے تھے۔ وہ کچھ غافل ہوگئے ہیں اور اب دوسری مشکل کا شکار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ کیوں نہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ کیا ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں کسی سے کچھ کہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ بہرحال اپنے طور پر تو فیصلہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ ان لوگوں کو چھوڑ کر جانے کا تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ باہر کا جائزہ لوں اور میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس احاطے کے آخری حصے کے قریب پہنچ گیا۔

آقا نوشیرواں اور دوسرے لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا، لیکن کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پایا کہ کیا کرنا ہے۔ میں اس وقت یہ محسوس کر رہا تھا کہ باقی لوگ اگر جان بچانے کی کوشش کر بھی لیتے تو ان لڑکیوں کا مسئلہ تھا۔ اسی وقت ناصری دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا، اس نے کہا۔

''فرزان! کیا کرنے جا رہے ہو؟''

''اگر تم مناسب سمجھو تو میرا ساتھ دو۔''

''مطلب۔۔۔''

''تھوڑا سا اندازہ لگانے کی کوشش کرنی ہے کہ ہمارے فرار کا کیا راستہ ہو سکتا ہے ورنہ کیا ان ہی کے درمیان وقت گزارتے رہو گے۔''

ناصری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''کیا میں باقی لوگوں کو اس بات سے آگاہ کروں؟''

''پھرتی کے ساتھ وقت نہیں ہے۔''

ناصری نے آقا نوشیرواں اور عصران سے اس بارے میں کچھ کہا اور عصران دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا تھا۔

''کیا آپ لوگ اس احاطے میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔مگر۔۔۔''

''تھوڑا سا جائزہ تو لیا جائے کہ صورت حال کیا ہے۔''

''اگر تم مناسب سمجھو تو میں ان لوگوں کے ساتھ رہوں۔'' ناصری نے کہا۔

''جیسا آپ لوگ مناسب سمجھیں۔''

''تم واپس آؤ گے نا۔'' عصران نے سوال کیا۔

میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا اور اس کے بعد احاطے سے دوسری جانب کود گیا۔ یہ خطرہ میں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ لیکن اسے مول لیے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ کم از کم

پتا تو چلے کہ کیا صورت حال ہے اور یہ بھی پتا چلے کہ فرار کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں یہ افراتفری تھم جائے تو شاید وہ لوگ میری کمی محسوس نہ کریں۔ میرا مطلب ہے وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گرفتار کیا تھا۔ چنانچہ میں احاطے سے باہر نکل آیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ لوگ اسی سمت جا رہے ہیں اور نہ جانے کس پر گولیاں برسا رہے ہیں۔ بہرطور میں نے بھی ان ہی کے انداز میں بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ ایک صحیح عمل تھا۔ ورنہ اگر مجھے تنہا بھاگتے ہوئے دیکھا جاتا تو کوئی بھی گولی میرے بدن کو چاٹ سکتی تھی اور پھر میرے پاس تو ہتھیار نام کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ میں اس طرف پہنچ گیا جہاں وہ لوگ بری طرح چیخ رہے تھے اور گولیاں برسا رہے تھے اور پھر میں نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا، وہ بینی کین اور ہیلاشیگا کا گروپ تھا جو نہ جانے کس طرح یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اب یا تو اس نے جان بوجھ کر ان لوگوں پر حملہ کیا تھا جو میرے اپنے خیال میں دیوانگی کے مترادف تھا یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گرفتار ہو کر آئے ہوں اور اب فرار کا راستہ چاہتے ہوں۔ لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ وہ مسلسل مقابلہ کر رہے تھے اور آبادی کے لوگ شاید انہیں قابو میں نہیں کر پا رہے تھے۔

میں ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا اور پھر اچانک ہی میں نے ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک مناسب راستہ تلاش کرلوں تو یہاں سے سب کو نکالنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں تھوڑا سا آگے بڑھ گیا، لیکن اچانک ہی کچھ گولیاں میرے آس پاس سے گزریں۔

میں نے دہشت بھری نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا۔ قبائلیوں میں سے دس، بارہ افراد میری جانب دوڑے چلے آ رہے تھے۔ غضب ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچا۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہے اور اب شاید وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ میں نے پھرتی سے وہاں سے آگے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ مسلسل گولیاں چلا رہے تھے اور کوئی بھی لمحہ ایسا ہوسکتا تھا کہ کوئی گولی میرے بدن کو چھو جاتی۔ یہ بھی صرف تقدیر ہی کی خوبی تھی کہ میں اتنے سارے لوگوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے بچ رہا تھا۔ اب یہ دیکھنے کا موقع نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ بس دوڑ رہا تھا اور وہ لوگ بھی دیوانگی کے عالم میں میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

کچھ دیر کے بعد جنگل نے میری مدد کی اور میں گھنے درختوں میں گھس گیا۔ لیکن ان کی چلائی ہوئی گولیوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ گولیاں درختوں کے تنوں میں لگ رہی تھیں۔ شاخیں ٹوٹ رہی تھیں۔ لیکن میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں کتنی دور نکل آیا۔ اچانک ہی میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کوئی پانچ فٹ نیچے گرا تھا اور اس کے بعد پیروں کے نیچے نرم اور گیلی زمین آ گئی تھی۔ یہ غالباً خشک جوہڑ تھا جس میں، میں گر گیا تھا اور اسے گھاس نے ڈھکا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی چند لمحوں کے بعد وہ لوگ یہاں پر بھی پہنچ جائیں گے، بلکہ ممکن ہے دوڑتے ہوئے وہ بھی جوہڑ میں ہی آ کودیں۔

لیکن بہرحال میں نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا اور آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ میرے کان ان کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے اور اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس جوہڑ کے اوپری حصے سے گزرے ہوں وہ مسلسل گولیاں برسا رہے تھے اور آگے چلے جا رہے تھے۔ شاید انہیں اس گڑھے کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا تھا اور وہ نہیں سمجھ پائے کہ میں گڑھے میں گر گیا ہوں۔ میرا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا لیکن میں آخری حد تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے ایک عجیب چبھن کا

احساس ہوا۔ میں نے ایک دم اندازہ لگانے کے لیے دیکھا کہ یہ چبھن کیسی ہے۔ وہ دو، دو، تین، تین انچ لمبی سرمئی رنگ کی جونکیں تھیں جو مجھ پر حملہ آور ہوگئی تھیں۔ میری پنڈلی کے علاوہ گردن اور کلائی پر بھی دو، تین جونکیں چمٹ گئی تھیں۔ میں نے دیوانوں کی طرح ان جونکوں سے جسم کو جدا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس طرح جسم میں پیوست ہوگئی تھیں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ جب میں انہیں کھینچتا تو وہ ربڑ کی طرح لمبی ہو جاتیں، لیکن کھال سے الگ نہ ہوتیں۔ جونکوں کے بارے میں مجھے یہ علم تھا کہ وہ خون چوستی ہیں۔ میری کوئی کوشش انہیں اپنے آپ سے جدا کرنے میں کارگر نہیں ہوئی اور میں خوف زدہ نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا اور مسلسل گولیاں برس رہی تھیں اور [illegible] ہو رہا تھا [illegible] نے اتنا خون پی لیا [illegible] لیکن اس [illegible] میں جانے کتنی جونکیں ہوں گی۔ یہ تو خون [illegible] سارا خون چوس لیں گی۔ چنانچہ یہاں سے نکلنا ضروری تھا اور میں نے گڑھے سے نکلنے کی کوششیں شروع کردیں۔ موٹی گھاس کی جڑوں نے میری مدد کی، ورنہ اس گڑھے سے نکلنا بھی آسان کام نہیں ہوتا۔ بمشکل تمام میں اس سے نکلا تھا۔

باہر بھی خطرہ تھا اور نیچے، لیکن نیچے کا خطرہ زیادہ خوفناک تھا۔ اگر موت ہی آنی ہے تو کم از کم ایسی گندی جگہ تو نہ آئے۔ چنانچہ میں وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر گھنی جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں ان جھاڑیوں میں جگہ بناتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور کافی فاصلہ اسی طرح طے کرلیا۔ میرے دائیں جانب ایک بلند ٹیلوں کا سلسلہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اسی طرف رخ کیا اور آگے بڑھتا رہا۔ اب صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔ اتنا زیادہ حوصلہ شاید کوئی بھی نہ کرسکے کہ اپنی زندگی بلاوجہ داؤ پر لگادے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اگر میں واپسی کا سفر طے کروں تو کیا صورت حال پیش آئے۔ وہ لوگ مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔ اب تو وہ لڑکی بھی میرے ساتھ نہیں تھی۔ ایک طرح سے میں تنہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اگر واپسی کا سفر طے کیا تو زندگی اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

میرا ذہن خواب کی سی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ اب بہت کچھ اوجھل ہوگیا تھا نگاہوں سے اور سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ ایک تو بھوک کی نقاہت، دوسرے کم بخت جونکیں اتنا خون پی گئی تھیں کہ بدن میں ایک سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔ نجانے کتنی دور نکل آیا تھا۔ اب میرے اطراف میں گھنا جنگل تھا اور یہ جنگل ضرورت سے زیادہ گھنا تھا۔ درخت ایک دوسرے میں پیوست تھے اور ان کی شاخیں آپس میں اتنی جڑی ہوئی تھیں کہ دن کی روشنی مشکل سے جنگل کے اندر پہنچ پا رہی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور فاصلے طے ہوتے رہے۔ مختلف مقامات پر جانوروں کی گلی سڑی ہڈیاں اور آنتیں پڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ دن کا وقت تھا، لیکن مچھر اتنے تھے کہ خدا کی پناہ، مرطوب آب و ہوا کے باعث ان کے بادل کے بادل ایک جگہ سے اٹھتے اور دوسری طرف جاتے دکھائی دیتے۔

نہ جانے کتنا فاصلہ اسی طرح طے ہوا۔ اس کے بعد فضا میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ میں جنگل کے اس انتہائی دشوار گزار اور گھنے حصے سے باہر نکل آیا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ جس سے یہ اندازہ لگانے میں بالکل دشواری نہیں ہو رہی تھی کہ کوئی دریا جنگل کے قریب ہے۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے ایک کھلا میدان دکھائی دیا۔ جس کے دوسری جانب سرمئی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جو شمال سے جنوب تک تاحد نظر چلا گیا تھا۔

سرمئی پہاڑوں کے اس طویل سلسلے کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر یہاں تک پہنچ جاؤں تو شاید زندگی کی کوئی امید بندھ جائے۔ چنانچہ میں آگے بڑھتا رہا۔ ان لوگوں کے بارے

میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا جو میرے پیچھے دوڑے تھے۔ بہرحال اس طویل ترین فاصلے کو طے کرتے ہوئے وہ مجھے نظر نہیں آئے تھے۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ پھر اچانک ہی کہیں دور سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ پھر دوسرا اور تیسرا فائر اور میں ایک دم سے زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن وسیع و عریض میدان میں کہیں بھی کوئی حرکت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گولیاں کون چلا رہا تھا اور کس پر چلا رہا ہے۔ خاصی دیر اسی طرح گزر گئی اور اس کے بعد پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ آہ! میں کیا کروں۔ کیا کرنا چاہیے مجھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب حواس آہستہ آہستہ جواب دیتے جا رہے تھے اور دل چاہ رہا تھا کہ ماحول سے بالکل بے نیاز ہو جاؤں، جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ البتہ یہ اندازہ مجھے اچھی طرح ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں اور میری مسلسل تلاش کی جا رہی ہے۔

نہ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ آہستہ آہستہ پھر ہمت ساتھ دینے لگی تھی۔ اب اس طرح تو اپنے آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جس حد تک آگے بڑھ سکتا ہوں، بڑھتا رہوں۔ چنانچہ میں آگے بڑھنے لگا۔ دور، دور تک کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں کب اور کس طرح پہاڑوں کے نزدیک پہنچا۔ اب مجھے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ لیکن پہاڑوں کے دامن میں درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے جنہیں میں دور سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ ان درختوں کے درمیان گھرا ہوا ایک چٹانی سرا مجھے نظر آیا۔ جس کے دامن میں ایک بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ جگہ بہت حسین تھی، لیکن اس وقت اس جگہ سے لطف لینے کی ہمت نہیں تھی، بس میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی ایسا پرسکون گوشہ مل جائے جہاں میں کچھ وقت گزار کر اپنے آپ کو بہتر حالت میں لا سکوں۔ چنانچہ یہ اندازہ لگائے بغیر کہ اس غار میں کیا ہو سکتا ہے، اس میں داخل ہو گیا۔

غار کی سطح ہموار تھی۔ وہ بالکل تاریک تھا، لیکن اس میں آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میرا تو اندازہ یہ ہی تھا کہ وہ صرف چھوٹا سا ایک غار ہے، لیکن اندر داخل ہو کر پتا چلا کہ وہ کوئی غار نہیں بلکہ شاید کوئی وسیع سرنگ تھی۔ پتا نہیں اس سرنگ کا اختتام کہاں ہو۔ میں سوچنے لگا، لیکن چلتا رہا اور دل میں یہ خیال قائم کیے رہا کہ اس سرنگ کو عبور کر کے مجھے اس کے دوسرے سرے پر نکلنا ہے۔ بس یہ ہی ایک بہتر طریقہ ہے، میں آگے بڑھتا رہتا۔

رفتہ رفتہ آنکھیں تاریکی سے شناسا ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے دائیں بائیں سرنگ کی دیواریں تھیں جن میں بعض جگہوں پر ایسے پتھر ابھرے ہوئے تھے کہ اگر میں ان سے ٹکرا جاتا تو زخمی ہو سکتا تھا۔ لیکن بہرحال میں ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتا رہا۔ پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ سرنگ میں گھٹن نہیں ہے، جبکہ کسی غار کے سوراخ میں اتنی دور تک نکل آنے کا مقصد ہو سکتا ہے کہ وہاں ہوا کا گزر نہ ہو اور سانس گھٹ جائے، لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کار اس سرنگ کا اختتام ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض ہال میں پایا، جس میں چاروں طرف خوف ناک دیواریں مجھے گھور رہی تھیں۔ گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن اب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اور جو کچھ میں نے اس ہال میں دیکھا اسے دیکھ کر ایک بار پھر میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔

یہ سب کچھ اجنبی، انوکھا، ناقابل یقین تھا۔ جن راستوں کو عبور کر کے ہم یہاں تک پہنچے تھے اس کے بعد ایسے پراسرار پہاڑی سلسلوں میں اس طرح کی کوئی چیز نظر آنا ناقابل یقین تھا۔ ہال کی پتھریلی دیواروں کے ساتھ بڑی بڑی پیٹیاں، کارٹن چنے ہوئے تھے اور ان کی تعداد غیر معمولی تھی۔ اتنا عظیم الشان سامان ان پہاڑی علاقوں تک پہنچانے کا کیا

ا، یہ ہوسکتا ہے۔ کس طرح یہ سب کچھ یہاں تک ماھا اور اسے یہاں لانے والے کون ہوسکتے ہیں۔ ں پر خیال نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور ے ذہن میں چرخیاں سی چلنے لگیں۔ بہت سے ات دل میں آرہے تھے۔ آخری بات میں نے وچی تھی کہ چونکہ کونیان قبائل حکومت کے صف آرا ہیں اور اس وقت دنیا کا ایک ہی یہاں بھی جو کچھ ہورہا ہوتا ہے، اس میں کسی ملک کا ہاتھ ہوتا ہے۔ معصوم لوگوں کو اسلحہ لیے کوئی ایسی کارروائی کردی جاتی ہے جس نا پر وہ مشتعل ہوجائیں اور مشتعل ہوکر ہتھیار یں اور اس کے بعد ظاہر ہے جنگ وجدل کے اوہ اور کیا رہ جاتا ہے اور جب ہتھیار پاس ہوتے خونریزی کے علاوہ اور کیا، کیا جاسکتا ہے۔ مجھے کیا کہ جن وحشی قبائل نے آقا نوشیرواں وغیرہ پر پالیا تھا وہ جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ یقیناً یہ ہی کا ذخیرہ ہے۔

میں یہ تمام باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی میں آہٹیں محسوس ہوئیں اور میں نے گردن ھمائی۔ ایک بار پھر مجھ پر حیرت کے جھٹکے لگے تھے۔ آدمی تھے، لیکن انہوں نے سر سے پاؤں تک ک کا ایک عجیب سا خول پہنا ہوا تھا۔ جس کے نظر آسکتا تھا۔ بس ان کے پیروں کی جگہ کھلی ں اور پلاسٹک کے خول میں سوراخ تھے۔ جن ان کی عجیب وغریب انداز کی گنیں جھلکتی نظر ھیں۔ ان گنوں کی نالیں کوئی دو انچ چوڑی ویسے پلاسٹک کے خول کے اندر ان کے ھی نظر آرہے تھے اور چہرے بھی۔ انہوں نے آپ کو اس پلاسٹک کے خول میں شاید کسی خاص ے لیے قید کررکھا تھا۔ میں خشک ہونٹوں پر زبان انہیں دیکھتا رہا۔ کسی کے منہ سے کوئی آواز نہیں پھر عقب سے بھی یہ ہی آوازیں نکلیں اور پھر میں گھوم گیا۔ ادھر بھی چھ ہی افراد تھے۔

یں یہ بات جان گیا تھا کہ وہ مجھے قید کرنا چاہتے ہیں اور غالباً انہوں نے یہ خول جو پہنے ہوئے ہیں۔ یہ بلٹ پروف ہوں گے اور گولی ان پر اثر انداز نہ ہوتی ہوگی۔ لیکن مجھے ہنسی آنے لگی۔ میرے پاس تھا ہی کیا۔ بلاوجہ ان لوگوں نے اتنی کاوش کی تھی، چنانچہ میں نے دونوں ہاتھ بلند کردیے۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنی گن کا رخ تبدیل کیا اور اچانک ہی اس سے ایک ہلکا سا غبار نکلا جو ایک شعاع کی شکل میں میرے چہرے کی جانب بڑھا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ ایک ہلکی سی آواز ہوئی تھی، جس طرح کسی بوتل کا کارک کھلتا ہے، لیکن میں جانتا تھا کہ یہ غبار کا گولہ بے مقصد نہیں ہے اور نشانہ میرا چہرہ ہے۔ ایک لمحے کے اندر میں اس غبار کے جال میں گرفتار ہوگیا۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ میرا پورا بدن بھیگ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے پانی میں ڈبودیا ہو اور پھر میں نے اپنے بدن کو جنبش دینے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں مفلوج ہوگیا ہوں اور اپنے اعضا کو جنبش نہیں دے سکتا۔ لیکن میرے دل ودماغ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بس بدن ساکت ہوگیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں موجود تھیں۔

حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے مجھ پر اور میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اب آہستہ آہستہ مشینی انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ اندازہ تو مجھے بخوبی ہوگیا تھا کہ وہ روبوٹ نہیں ہیں۔ لیکن ان کے چلنے کا انداز ایسا ہی تھا اور غالباً اس کی وجہ ان کے جسموں پر موجود پلاسٹک یا اس جیسی کسی چیز کے خول تھے۔ پھر انہوں نے قریب سے مجھے دیکھا اور اس کے بعد مطمئن ہوگئے۔ انہوں نے گنیں زمین پر رکھیں اور سارے خول اتار دیے۔

میری زبان میرے ہونٹوں پر گردش کررہی تھی۔ غالباً گردن سے اوپر کا حصہ ہی متحرک تھا۔ باقی جسم میرا اپنا جسم نہیں رہا تھا اور اس وقت بھی میں نے دلچسپی سے اپنے آپ کو دیکھا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ یہ قوی ہیکل آدمی تھا اور اس کے چہرے پر نرمی کے آثار

تھے۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ اس نے مجھے اٹھایا تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرا پورا جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا ہے۔ پاؤں پھیلے ہوئے ہیں۔ گویا اب میں ایک بے جان مجسمے کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن ایسا مجسمہ جو سوچ سکتا ہے، محسوس کرسکتا ہے۔

وہ مجھے لیے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ایک اور سوراخ میں داخل ہوکر وہ ایک لمبی سرنگ سے گزرے اور آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ سرنگ کشادہ تھی، روشن تھی اور میں تمام چیزوں کو دیکھ دیکھ کر ششدر تھا۔ ذہن بدستور کام کررہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کورنیان قبائل جو کچھ کررہے ہیں وہ کسی بہت بڑی طاقت کی ایما پر کررہے ہیں اور اس طاقت نے یہاں اپنے طور پر ایک پورا کارخانہ حیات بنا کر رکھا ہے۔ یہاں سے وہ اپنے مشن کو کنٹرول کررہی ہے اور بڑے اعلا پیمانے پر کام ہورہا ہے۔ یہ تو دنیا بھر میں ہورہا ہے۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی کسی قسم کا جال پھیلائے ہوئے موجود ہے اور معصوم لوگ ہمیشہ آلہ کار بنتے ہیں۔

سرنگ کا خاتمہ بھی غاروں ہی کے ایک سلسلے میں ہوا۔ آہستہ آہستہ میری حیرت دفع ہوتی جارہی تھی اور اب میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اصل قصہ کیا ہے۔ چنانچہ اس ہال میں داخل ہونے کے بعد وہ لوگ مجھے ایک ایسی جگہ لے گئے جسے کمرا کہا جاسکتا تھا۔ پتھروں سے آراستہ تھا اور اس میں بستر وغیرہ پڑا ہوا تھا۔ بڑی عمدگی سے اس جگہ کو آراستہ کیا گیا تھا۔ مجھے ایک بستر پر لٹا دیا گیا اور میں خاموشی سے اپنی جگہ لیٹ گیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ لوگ چلے گئے تھے۔ انہیں اس بات کا اعتبار تھا کہ اب میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ جب بدن ہی مفلوج ہوجائے تو پھر باقی انسان اور کیا کرسکتا ہے۔

جب وہ چلے گئے اور چاروں طرف مکمل خاموشی طاری ہوگئی تو میں نے اپنی نئی افتاد کے بارے میں سوچا اور دل ہی دل میں ہنسنے لگا، میں نے کہا۔

''مائی ڈیر! ابھی تو دیکھو، نہ جانے زندگی کے کون کون سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ویسے ایک دلچسپ بات ہے اور اگر انسان خوش ذوق ہو تو سوچ سکتا ہے کہ زندگی میں کیا، کیا دلچسپیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ کیسے کیسے مسائل سے انسان گزرتا ہے وہ تو گویا زندگی نہیں گزارتے جو ایک جگہ پیدا ہوتے ہیں، نوکریاں کرتے ہی، شادیاں کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، بوڑھے ہوجاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ بس زندگی کی کہانی اگر اتنی ہی مختصر ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں تو ہزاروں زندگیوں کا مالک تھا۔ میری زندگی میں تو اتنے واقعات آچکے تھے کہ اب اگر میں انہیں جمع کرنے کی کوشش کرتا تو شاید اس میں میری یادداشت میرا ساتھ نہ دے پاتی۔ میں کافی دیر تک وہاں لیٹا ان تمام باتوں پر غور کرتا رہا۔

وقت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا۔ بدن بے جان تھا، دماغ متحرک اور سوچوں کے علاوہ میرے پاس کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ بھوک وغیرہ کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ نہ کسی شے کی طلب محسوس ہورہی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں وقت کا تعین نہیں کرسکتا تھا۔ دو آدمی آئے تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں کھانا وغیرہ موجود تھا۔ ان میں سے ایک نے میرے قریب پہنچ کر میرے جسم کو سیدھا کیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا پستول میری جانب کرکے فائر کردیا۔ ہلکی ہلکی نرم شعاعیں میرے بدن کی جانب لپکی تھیں اور چند ہی لمحوں میں میرے بدن میں خون کی روانی متحرک ہوگئی۔ بدن میں ایک شدید سنسنی کا احساس ہورہا تھا، لیکن یہ لمحات بہت مختصر تھے اور مجھے کسی ناگوار کیفیت کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر میرا بدن جنبش کرنے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کیفیت اسی خاص ذریعے سے ختم کردی گئی ہے۔ جس خاص ذریعے سے مجھ پر طاری کی گئی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوستو! خوب شعبدے دکھا رہے ہو۔ میں

تمہارے ان شعبدوں سے متاثر ہوں۔ بے شک یہ ایک عجیب سی چیز ہے۔''

''سنو! تم یہاں ہمارے قیدی ہو۔ کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو۔''

''میرے تسلیم نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی تمہیں ایک پیش کش بھی کی جاتی ہے۔''

''کیا۔۔۔؟''

''دیکھو۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ اتنا مستحکم ہے کہ تم اگر اعلا درجے کے ذہین انسان ہو، تب بھی یہاں اپنے لیے کوئی ایسا راستہ تلاش نہیں کر سکتے جو تمہیں نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن سکے۔ ہم سب محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا محفوظ رہنا ضروری ہے۔ اگر تم کارروائی کرو گے تو بے شک ہو سکتا ہے تم اپنی ذہانت سے ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکو، لیکن اس کے بعد تمہیں پھر ہمارے چنگل میں آنا ہوگا، البتہ اس کا فیصلہ تم خود بھی کر سکتے ہو کہ جب کوئی کسی کو نقصان پہنچاتا ہے تو پھر دوسرا بھی اسے نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں گا تو میں بھی بے وقوف آدمی نہیں ہوں۔''

''بس ہم یہ ہی چاہتے ہیں تم سے یہ ساری گفتگو کی جائے گی کہ تمہیں یہاں کیوں قید کیا گیا ہے۔ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں، کیا مقصد ہے ہمارا، لیکن اس کے لیے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔ اس دوران تم بالکل پرسکون رہو۔ یہ جگہ تمہارے لیے نہایت موزوں ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور کہا۔

''میں اس کے لیے شکر گزار ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ جب تک کوئی ایسی مجبوری درپیش نہ ہو جس کے تحت مجھے اپنے ذہن کے خلاف کام کرنا پڑے گا۔ میں یہاں کچھ نہیں کروں گا، پرسکون رہوں گا۔''

''شکریہ۔۔۔ انسان کو انسان پر اتنا بھروسا ہونا چاہیے۔ جس وقت یہ بھروسا ختم ہو جائے گا میرا خیال ہے انسانیت کا نام لغت سے مٹا دیا جائے گا۔ ہم تم پر مکمل اعتبار کرتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں نے دلچسپی اور حیرت سے شانے اچکائے۔ واقعی بڑے عجیب لوگ تھے۔ یہ تو کچھ بہت ہی پراسرار سلسلہ ہے۔ ان لوگوں کا کوئی خاص مشن ہے کیا۔ جس شرافت کا یہ مظاہرہ کر رہے ہیں عموماً ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ لیکن اس شرافت کے جواب میں شرافت ہی کا سلوک کیا جائے تو کم از کم اپنا معیار متاثر نہیں ہوتا۔

کھانے کی جانب متوجہ ہوا، پھل تھے، دودھ کی بنی ہوئی اشیا تھیں، پانی تھا اور بس۔ اس کے بعد ایک شخص بہت عمدہ قسم کی کافی لے کر آیا تھا اور اس نے کافی کے برتن میرے سامنے رکھ دیے تھے۔ میں نے بے تکلفی سے کھانا کھایا اور اس کے بعد کافی پی، پھر یہ دیکھا کہ بدن کو متحرک رکھنے کے لیے کیا ضروری ہے۔ چنانچہ بہت دیر تک چہل قدمی کرتا رہا اور جب کچھ نہ رہا تو آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لوگ جیسے ایک معزز مہمان کی حیثیت دے رہے تھے مجھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ کچھ میگزین لے آئے۔ تازہ ترین میگزین تھے۔ جنہیں انہوں نے میرے سامنے رکھ دیا۔ اخبارات بھی تھے۔ میں نے حیرت سے یہ ساری چیزیں دیکھی تھیں۔ کورنیان کے جس علاقے تک میں نے سفر کیا تھا وہاں ان تمام چیزوں کا حصول بھی ایک عجوبہ ہی تھا۔ کیونکہ پتا نہیں ان کے ذرائع کیا تھے۔

یہاں تک کہ تین دن گزر گئے اور مجھے یہاں کوئی بے سکونی نہ ہوئی۔ ان لوگوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ان کے لیے بے ضرر آدمی ہوں۔ چنانچہ ان کے انداز میں مزید دوستی بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے کچھ ایسی آوازیں سنائی دیتیں، جیسے کچھ مشینیں چل رہی ہوں۔ میں ان کے بارے میں یہی اندازہ

لگاتا کہ یہ ایک پورا کارخانہ ہے۔ جس میں نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ تیسرے دن رات کے کھانے کے بعد کھانے کے برتن واپس لے جانے والے ایک شخص نے مجھ سے کہا۔

''کل آپ کو ہائی کمانڈ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔''

''میرے بھائیو! تم لوگوں کا رویہ میرے ساتھ جس قدر اچھا رہا ہے اس کے بعد تو سچی بات ہے کہ مجھے کسی بھی سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

پھر ناشتے کے بعد کچھ لوگ میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں پہاڑوں، سرنگوں اور غاروں کا ایک عظیم جال پھیلا ہوا تھا۔ مجھے کوئی پیچ در پیچ سرنگیں عبور کرنا پڑیں اور اس کے بعد میں ایک ایسے ہال میں پہنچا، جس کے بارے میں کچھ کہنا بس کہنا ہی ہے۔ ایک ناقابل یقین دنیا یہاں آباد تھی اور جس شخصیت کے سامنے مجھے پیش کیا گیا۔ وہ دلکش شکل وصورت کی مالک ایک درمیانہ عمر کی عورت تھی، بڑے خوب صورت اور نفیس لباس میں ملبوس۔ ایک ایسی نیم دائرے کی شکل کی میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی جس کی سطح پر لاتعداد ڈائل اور بٹن بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے بغور عورت کو دیکھا وہ بھی مجھے نرم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ایک عجیب سا ساحر چہرہ تھا جو میرے دل پر نجانے کیسے کیسے اثرات قائم کرتا تھا میں اس کے سامنے پہنچا دیا گیا اور پھر خصوصی طور پر وہ لوگ ایک عجیب سی ٹرالی نما میز دھکیل کر لائے۔ جو اس عورت کی میز کے بالکل سامنے کردی گئی۔ میز ہی کے درمیانی حصے سے ایک آٹو مینک کرسی باہر نکل آئی اور مجھے اس پر بیٹھنے کی پیشکش کی گئی، پھر اس میز کے مختلف حصوں کو کھول کر انہیں میرے گرد پھیلا دیا گیا۔ میری کرسی کی نچلی سطح سے ایک اسٹینڈ اوپر کھینچا گیا۔ جس پر ایک گول چھتری نما چیز لگی ہوئی تھی، اور اس کے نیچے ننھے ننھے بلب نظر آرہے تھے۔ ایک عجیب کارروائی کی گئی تھی لیکن میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ جب وہ لوگ اپنے اس کام سے فارغ ہوگئے تو عورت نے، جو مدہم مدہم مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے کہا۔

''معزز مہمان! ان تمام باتوں پر تمہیں حیرت تو ہورہی ہوگی، لیکن تم ہمارے بن بلائے مہمان ہو۔ ہم تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ چنانچہ سب سے پہلی آرزو تو انسان کی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مہمان کے بارے میں جان لے۔ ہم نے ذرا مختلف طریقہ کار اختیار کیا ہے عموماً اس قسم کے دوستوں کے ساتھ، سختی اور زیادتی ہوتی ہے اور دنیا بھر میں تشدد کے ذریعے انسان سے اس کی شخصیت کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے ہم عدم تشدد کے قائل ہیں اور ہم نے ایسی مشینیں ایجاد کی ہیں جن کی بناء پر انسان کا ذہن سوچتا ہے اور زبان بولتی ہے۔ ذہن کے ہر اس خانے کو متحرک کیا جاتا ہے جس سے کچھ معلوم کرنا مقصود ہو۔ چنانچہ اب ہم تم سے جو سوال کررہے ہیں تمہاری زبان اس کا جواب دے گی اور ہمارا کام مکمل ہوجائے گا۔ تم اب تک ہمارے ساتھ بہترین تعاون کررہے ہو۔ اس کے لیے میں دلی طور پر تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے عدم تشدد کا موقع دیا۔ ہاں اگر تم مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں جواب دوں گی۔''

''سوالات تو میرے ذہن میں بھی بہت سے ہیں میڈم! لیکن وہ صرف اپنے تجسس کی تکمیل کے لیے ہیں۔ جو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہوتا ہے تاہم میں آپ سے کوئی سوال نہیں کرتا۔ آپ نے جو کچھ کہا وہ میرے لیے بہت عجیب ہے اور میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں بھی ذرا دیکھوں کہ میری مرضی کے بغیر میری زبان کیسے بولتی ہے۔'' عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''تو پھر تمہیں اجازت ہے۔''

''اجازت دینے کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے جواب دیا۔

عورت نے ایک بٹن دبایا اور ایک مدہم سی گونج

میرے سر پر پیدا ہوگئی۔ اچانک ہی اس چھتری نما شے میں ایک چرخی سی چلنے لگی تھی اور روشنیاں گھومنے لگی تھیں۔ پھر ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور مجھے ہلکا سا چکر آ گیا۔ میں نے عورت پر نگاہیں جمادی تھیں۔ تھوڑی دیر تک عورت نے اپنا یہ عمل جاری رکھا۔ اس کے بعد بٹن بند کر دیا اور چرخی رک گئی لیکن پھر ایک سفید لائٹ اوپر سے میرے دماغ پر پڑی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر میں ایک کھلبلی سی ہو رہی ہو۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سر کو اس جگہ سے کھجایا اور اسی وقت عورت کی آواز ابھری۔

''سب سے پہلے میں تمہارا نام معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر میرے منہ سے آہستہ سے آواز نکلی۔

''میرے بہت سے نام ہیں۔''

''اپنے پہلے نام سے ابتدا کرو۔''

''ندیم۔'' میں نے جواب دیا لیکن مجھے خود یاد نہ آیا کہ ندیم میرا نام کب تھا۔ تاہم یہ بات میرے لیے انتہائی باعث حیرت تھی کہ الفاظ میرے منہ سے نکلے تھے۔ جبکہ میں نے جان بوجھ کر یہ کوشش کی تھی کہ میں کوئی جواب نہ دوں اور خاموش رہوں تاکہ اس عورت کو اپنی شکست کا احساس ہو لیکن میری زبان نے فوراً ہی ندیم کا نام لیا تھا۔ عورت کی پیشانی کسی قدر شکن آلود ہوگئی پھر اس نے کہا۔

''تمہارا دوسرا نام؟''

''شہزاد۔'' میں نے جواب دیا اور عورت بری طرح اچھل پڑی۔ اب اس کے چہرے پر شدید اضطراب نظر آ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح مسکراتا ہوا نہیں رہا تھا اور وہ دھواں دھواں ہو رہی تھی۔

''تمہارا تیسرا نام۔'' میں نے نہ جانے کون سا نام لیا تھا وہ مجھ سے سوالات کرتی رہی اور میں نام بدلتا رہا۔ اس کے بعد دوسرا نام اور میرا آخری نام فرزان تھا۔ عورت کے ہاتھ عجیب سے انداز میں ہل رہے تھے وہ بار بار بٹن دبا رہی تھی پھر اس نے سوال کیا۔

''اب میں تمہارے ماضی کی زندگی کے بارے میں سوال کرنا چاہتی ہوں۔ جب تم ندیم تھے تو کیا کرتے تھے؟''

اور اس بار بھی نہ چاہتے ہوئے بولتا چلا گیا۔ عورت دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ کئی بار وہ پُراضطراب انداز میں اپنی جگہ سے اٹھی تھی لیکن پھر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس کے بدن میں رعشہ سا دیکھا تھا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہو رہی ہے۔ میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میری سوچیں کام کر رہی تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اس کو کس کی کہانی سنائی ہے، نہ میں ندیم تھا، نہ شہزاد البتہ اس وقت سے اب تک کے واقعات مجھے یاد تھے۔ جب آقا نوشیروان اور خاتون اشوار یہ سے ملا تھا۔ وہ ساری کہانی بے شک میری تھی۔ لیکن اس سے پہلے کی کہانی کس کی تھی میرا ذہن اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اور پھر یہ عورت! عجیب سی بات تھی، عجیب سی بات۔ عورت اس کے بعد خاموش ہوگئی۔

عورت نے چند لمحات توقف کیا پھر اس نے تمام سوئچ اور بٹن آف کر دیئے جو اس کے سامنے لگے ہوئے تھے پھر وہ اپنی جگہ سے باہر نکل آئی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی مجھ تک پہنچی اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے، انہیں ہونٹوں سے لگا کر چوما پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ تمام لوگ جو وہاں موجود تھے حیرت بھری نگاہوں سے عورت کی یہ کیفیت دیکھ رہے تھے۔ عورت کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے پھر اس نے رندھی آواز میں کہا۔

”آ وا سے ملوائو اور کرین فور لے جاؤ۔“

”جی میڈم!“ ان سب نے کہا۔ میں حیرانی سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا اب میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں کیا کیا باتیں اس کے سامنے کر گیا ہوں۔ میرا ذہن کھویا کھویا سا تھا۔ بس اتنا یاد تھا مجھے کہ آقا نوشیروان کے ساتھ یہاں آیا ہوں اور آقا نوشیروان اور دوسرے لوگ مشکل میں پھنس گئے ہیں۔

بہر حال خاموشی کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ تمام سوچیں میری اپنی تھیں۔ اگر میں عورت سے کہوں کہ میرے ساتھ رعایت اور انصاف برتے تو پتا نہیں وہ کیا سوچے گی، کیا کرے گی۔ چنانچہ میں نے وعدے کے مطابق اپنے آپ کو پرسکون ہی رکھا اور جب وہ لوگ مجھے لے کر چلے تو میں خاموشی سے چل پڑا۔ عورت ہمارے ساتھ ساتھ آرہی تھی اور میں محسوس کررہا تھا کہ مجھے آگے لے جانے والے سخت متحیر ہیں کیوں۔ میں نہیں جانتا تھا غالباً عورت نے جس انداز میں میری پذیرائی کی تھی اس میں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔

لیکن میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عورت کون تھی اور میرے ساتھ یہ رویہ اس نے کیوں اختیار کیا تھا۔ ایک اور سرنگ عبور کرنے کے بعد ہمیں سیڑھیاں طے کرنی پڑیں۔ پھر ایک پلیٹ فارم جیسی جگہ سے گزر کر ہم ایک اور بہت بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔ اب میں باقی باتیں تو بھول چکا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ جو میرے سامنے ہے وہ انسانی ہاتھوں کی کاری گری کی انتہا ہے۔ مجھے ایک اور آراستہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی زندگی کی تمام آسائشیں موجود تھیں۔

پھر اس کے بعد نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ عورت چلی گئی تھی اور میں یہ سوچتا رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے، لیکن پھر وہی طریقہ اپنایا جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کے بارے میں سوچ کر اپنے آپ کو پریشان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ ایک تبدیلی کو میں نے کچھ وقت کے بعد محسوس کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں بھی اضطراب پیدا ہوتا جارہا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے ماضی کی کوئی جھلک دیکھی ہو۔ ایک ایسی جھلک جس کے بارے میں میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرا ماضی ہی تھا۔ لیکن میری اس سے کوئی واقفیت نہیں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ایک بار پھر مجھے تنہائیوں سے واسطہ پڑا تھا۔

پھر میں نے پہلی بار ایک اور شکل دیکھی۔ وہ ایک نوجوان اور حسین لڑکی تھی جو عورت کے ساتھ میرے پاس آئی تھی اور دونوں میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ لڑکی کا چہرہ پتھر کا بنا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غم کے ایسے تاثرات تھے کہ جسے دیکھ کر دل کو ایک شدید دکھ کا احساس ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس لڑکی کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنوں میں جو بے ترتیبی پیدا ہوئی تھی میں اس کی وجہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ بس یوں لگا تھا جیسے کوئی چیز دل کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہو۔ عورت نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”موہنی کیا تمہیں مجھ پر یقین ہے۔“ لڑکی چونک کر عورت کو دیکھنے لگی۔ اس کے پتھریلے چہرے پر زندگی کی ایک جھلک نمودار ہوئی اور اس نے ہچکچاتی نگاہوں سے عورت کو دیکھا۔

”میں نے ہمیشہ آپ پر اعتماد کیا ہے۔“

”تمہاری ذہنی کیفیت سے میں ناواقف نہیں ہوں۔ بہر حال انسان، انسان ہی ہوتا ہے اور اس کی کمزوریاں اگر اس سے دور ہو جائیں تو دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ درویش بن جاتا ہے یا پھر مر جاتا ہے۔ لیکن موہنی میری زندگی یہ شہزادی ہے اور جو کچھ اس پر گزری ہے اگر تم سن لو تو تمہارا کلیجہ پھٹ جائے۔“

”میک اپ ہے۔“ اس لڑکی نے جسے موہنی کے نام سے پکارا گیا تھا پوچھا۔

”نہیں بلکہ قدرت کا ایک ایسا مسئلہ جس کے بارے میں انسانی دماغ نہیں سوچ سکتے۔“

''یعنی یہ چہرہ اصلی ہے۔''

''بھلا شہزاد کا یہ چہرہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ آنکھ غلط کہتی ہے، دل صحیح سوچتا ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس چھوڑے جاتی ہوں، اس کے دل میں اپنی جگہ تلاش کرو۔ ہاں، بس میں تمہیں یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ یہ شہزاد ہی ہے۔ میں چلتی ہوں اور اب یہ بات تم ذہن نشین کرلو ہماری تقدیر ہے کہ شہزاد [illegible] ہم تک پہنچ گیا ہے اور میں اسے بھی قدرت کا ایک عمل سمجھتی ہوں۔ شہزاد کو جتنے عرصے ہم سے جدا رہنا تھا وہ رہا اور آخرکار تمہاری دعائیں رنگ لائیں۔ اب تم دل کے راستوں کو دیکھو۔ میں عمل کا راستہ دیکھتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ آخرکار سب [illegible] کی میں چلتی ہوں۔

وہ وہاں سے واپس نکل گئی۔ یہ گفتگو میں نے بھی سنی تھی لیکن عقل نے کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی تھی۔ بھلا میں شہزاد کہاں سے ہوں میں تو لائن ہارٹ ہوں اور وقت مجھے مختلف نام دیتا رہا ہے۔ اگر یہاں شہزاد کے نام سے زندگی مل سکتی ہو تو شہزاد ہی سہی زندہ تو رہنا ہی ہے جب تک سانسوں کی آمدورفت باقی ہے۔

وہ لڑکی مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے چل کر میرے قریب آگئی اور سرسراتی آواز میں بولی۔

''تم شہزاد ہو۔'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی میں نے کہا۔

''وہ رحم دل خاتون جو مجھ پر انتہائی مہربان رہی ہیں جو کچھ تم سے کہہ گئی ہیں اگر تم چاہو تو اسے تسلیم کرلو البتہ ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں لڑکی کیا نام ہے تمہارا۔'' لڑکی نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

''شہزاد۔۔۔!''

''ویسے شہزاد سے تمہارا کیا رشتہ تھا۔''

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری آنکھوں میں زندگی کی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔

''شہزاد سے میرا روح کا رشتہ تھا۔''

''روح کا رشتہ۔''

''تم اس سے شدید محبت کرتی ہو۔''

''ہاں! میری کائنات ہے وہ۔''

''وہ۔ میں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ تم شہزاد ہو، اپنے آپ کو کتنا ہی بدل لو، کسی بھی آواز میں بول لو میرے سامنے لیکن ایزی ہارڈ کہہ گئی ہے کہ تم شہزاد ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم ہو۔''

''خیر یہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔ میں نے تو اس عورت کا نام بھی پہلی بار سنا ہے۔''

''اور میرا۔۔۔''

''معاف کرنا تمہارا بھی۔''

''ایزی کہتی ہے کہ تم یادداشت کھو بیٹھے ہو۔''

''ہاں، اس سے انکار نہیں کروں گا۔ مجھے میرا ماضی یاد نہیں، عمر کے ایک ایسے حصے تک میں اپنے آپ کو بھول چکا ہوں جسے جوانی کہا جاتا ہے۔ میں اپنے اس ماضی کی تلاش میں ہوں جس میں بچپن بھی ہے اور جوانی کے اس دور کے واقعات بھی جس دور سے میں نے اپنے آپ کو جانا آخر میرا ماضی کہاں گیا۔'' موہنی مسکرادی پھر بولی۔

''اور تمہارا ایک ایک لفظ مجھے یقین دلاتا جارہا ہے کہ میری تقدیر کے ستارے گردش سے نکل آئے ہیں۔''

میں دل ہی دل میں ہنسا اور میں نے سوچا آپ کی تقدیر کے ستاروں کی گردش کا آغاز تو اب ہوا ہے کیونکہ آپ ایک اور بے وقوف لڑکی کی طرح نہ جانے کن خیالات میں گم ہوگئی ہیں۔ وہ جو اپنے اصل شوہر کو پانے کے بعد نہ جانے کیسی سوچوں سے گزری ہوگی اور آپ اس کا آغاز کررہی ہیں۔ میں نے ایک دم پوچھا۔

''آپ ایک بات بتایئے محترمہ موہنی!''

''پوچھو۔۔۔اب جو دل چاہے پوچھو میں کسی جذباتی کیفیت کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔ ایزی غلط نہیں سوچ سکتی اس نے آج تک کوئی غلط بات نہیں کہی وہ اس قدر ذہین ہے کہ غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ دل کی بات کہہ گئی ہے مجھ سے تو یقین کرو کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے اپنے دل میں کبھی کوئی ایسی چیز نہیں بسائی جو بعد میں مجھے داغ دار کرے۔ لیکن اب تمہاری آواز تک اجنبی ہونے کے باوجود میں یہ بات دل سے تسلیم کرنے لگی ہوں کہ تم شہزاد ہو۔''

''ٹھیک، شہزاد سے آپ کا کیا رشتہ تھا۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ زندگی کے وہ تمام رشتے جو اس دنیا میں ہوتے ہیں۔ میں موت کے بعد کی بات نہیں کرتی کیونکہ اس کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''کچھ نہیں، اب میں تمہاری خدمت کروں گی۔''

''اچھا چھوڑیئے، آپ یہ بتائیے ایزی ہارڈو کون ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی جب تک کہ وقت تمہیں سب کچھ یاد نہ دلا دے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے بھی وقت کا انتظار رہے گا البتہ ایک بات کہوں آپ سے۔''

''ہزاروں باتیں کہو جو تمہارا دل چاہے کہو۔''

''اپنے آپ کو سنبھالے رکھیے آپ یقین کیجیے محترمہ مونی! کہ مجھے خود آپ کو دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جیسے میرے ذہن میں کچھ زندہ ہوگیا ہو، مگر میں کیا کہوں، کیسے مان لوں کہ ماضی میں میرا نام شہزاد تھا۔ آپ مجھے بتائیں کہ اگر یہ سب کچھ تھا تو میں یہ سب بھول کیسے گیا؟''

''نہیں، تمہیں کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایزی کہتی ہے کہ سب ٹھیک ہوجائے گا بس مجھے ایک بات کی اجازت دو۔''

''کیا۔۔۔؟''

''مجھے اپنے قریب رہنے دو مجھے اپنی خدمت کرنے دو۔''

''یہ تو آپ کی عنایت ہے۔ یہاں کوئی بھی میرے قریب رہ سکتا ہے۔ میں کیسے انکار کرسکتا ہوں۔ اچھا یہ بتائیے کہ اگر کچھ اور سوالات کروں میں آپ سے تو آپ ان کے جوابات دینا پسند کریں گی۔''

''ہر وہ بات پسند کروں گی جو تمہیں پسند ہو شہزادہ!''

عورت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، ہونٹوں پر مسکراہٹ ، چہرے پر سرخی شدید جذباتی ہیجان کا شکار تھی وہ، رحم آنے لگا مجھے اس پر اور ویسے بھی میں نے سوچا کہ شاید واقعی میرا ماضی ایسا ہو جس میں یہ عورت شامل ہو۔ آہ! کاش وہ مجھے یاد آجائے، لیکن یہ بھی فیصلہ کرلیا تھا میں نے کہ سب کچھ یاد آنے سے پہلے اس عورت کو کوئی غلط احساس نہیں دلاؤں گا اتنی اچھی پاکیزہ اور معصوم سی لڑکی کو اگر کبھی کسی دکھ کا سامنا کرنا پڑا تو میں خود ہی اپنے آپ کو معاف نہیں کرسکوں گا میں نے اس سے کہا۔

''مونی آپ میرے ساتھ رہ سکتی ہیں میں آپ کا احترام کروں گا۔''

''شکریہ شہزاد میری روح، میری زندگی۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے انداز میں ایسا کوئی جذباتی ہیجان نظر نہیں آیا تھا کہ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ جاتی اور میں نے اسے بتادیا تھا کہ میں یہ اجازت اسے نہیں دوں گا۔ پھر وہ میری ہر چیز کا خیال رکھنے لگی۔ میں نے اپنے سوال کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ البتہ رات کو بھی جب اس نے میرے کمرے میں یعنی اس جگہ جہاں میں موجود تھا سونا چاہا تو میں نے اس سے کہا۔

''آپ سے ایک بات کہوں مونی!''

''ہاں۔''

''آپ نہیں سوئیں گی؟''

''ہاں۔''

''لیکن اس کی اجازت میں نے آپ کو نہیں دی ہے ابھی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں صرف اس لیے یہاں رہنا چاہتی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ رات میں تمہیں کسی شے کی ضرورت پیش آجائے۔ ایسا کرتی ہوں باہر اپنے لیے جگہ بنالیتی ہوں وہاں سو جاؤں گی۔''

''موہنی، میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔''

''اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دو۔''

''مطلب۔۔۔؟''

''اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔''

پھر دوسری صبح اس سے ملاقات ہوئی۔ میرے لیے صبح کی چائے لے کر آئی تھی۔ خود بڑی نکھری نکھری سی نظر آرہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے کسی خاص خیال نے اس کے ذہن سے تمام تھکن اور افسردگی نچوڑ لی ہو۔ میں نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولی۔

''چائے اور اس کے ساتھ یہ بسکٹ، اس لیے کہ یہ تمہارا معمول تھا۔''

''گڈ۔۔۔ اچھی بات ہے اور یہ مجھے برے نہیں لگیں گے، لیکن محترمہ آپ کی چائے کہاں ہے؟''

''پی لوں گی میں۔''

''ابھی آپ کہہ چکی ہیں کہ میرا آپ سے اتنا گہرا رشتہ ہے تو پھر آپ نے خادماؤں کا انداز کیوں بنا رکھا ہے۔''

''میں تمہارے پاؤں کی خاک ہوں شہزاد!''

''نہیں پلیز! ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ چائے لے آیئے ورنہ میں نہیں پیوں گا۔'' وہ ہنسی اور بولی۔

''ابھی لائی ہوں۔'' پھر وہ میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ میں نے اپنی پلیٹ سے ایک بسکٹ لے کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''لیجیے۔''

''نہیں، اور ہیں بسکٹ میں لے لوں گی۔''

''یہ لے لیجیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور پر مسرت انداز میں بسکٹ اپنے دانتوں سے کترنے لگی۔

بہرحال اچھی شخصیت تھی اور میں اپنے دل میں اس کے لیے خاص گنجائش محسوس کررہا تھا۔ جس عورت کو اس نے ایزی ہارڈ کے نام سے پکارا تھا وہ بھی اکثر میرے پاس آتی رہتی تھی۔ بہت پر محبت باتیں کرتی تھیں یہ دونوں، میں اس مشینی کارخانے کو بالکل نہیں سمجھ پایا تھا اور مجھے مسلسل اس بات پر حیرت تھی کہ یہ لوگ یہاں کیا کررہے ہیں۔ پھر ایک صبح ایزی ہارڈ آئی تو اس کے بدن پر ڈاکٹروں جیسا ایپرن بندھا ہوا تھا میرے لیے اسٹریچر لایا گیا تھا اور موہنی نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا تو میں ہنس کر بولا۔

''کیوں خیریت اب کیا میرے دل گردے کلیجی نکالنے کا پروگرام ہے، یہ ماحول کیوں پیدا کیا گیا ہے۔''

''کچھ تھوڑی سی تکلیف دینا ہوگی تمہیں مائی ڈیئر شہزاد۔'' ایزی ہارڈ نے کہا۔

''آپ لوگ اتنے اچھے ہیں کہ آپ کے کہنے پر میں ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں تھوڑا سا کچھ بتایا نہیں جائے گا مجھے۔۔؟''

''جب اس حد تک ہم پر اعتماد کرتے رہے ہو تو پھر اس اعتماد کو قائم رہنے دو۔''

''ٹھیک ہے چلیے، مگر یہ اسٹریچر کی کیا ضرورت ہے؟''

''صرف ایک روایت۔'' ایزی ہارڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں۔'' میں اسٹریچر پر لیٹ گیا اور پھر مجھے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا گیا ہے

جسے آپریشن تھیٹر ہی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسے ایسے آلات وہاں موجود تھے جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہے تھے۔ ایک بڑا سا اسکرین جو اس کے بعد مجھے آپریشن ٹیبل پر لیٹنا پڑا۔ مجھے بے ہوش کیا گیا۔ جس کے بعد میں سو گیا تھا۔ گہری نیند جو نہ جانے کتنی طویل ثابت ہوئی تھی۔ البتہ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بیڈ پر تھا۔ میرے چہرے پر پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ میں نے حیرت سے ان پٹیوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ نہ جانے یہاں کیسے آ گیا۔ شاید میں شدید زخمی ہو گیا ہوں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ واقعی جزیرے پر مجھے ایک واقعہ پیش آیا تھا، ایک انتہائی مہلک حادثہ جس میں، میں نے اپنے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے محسوس کیا اور اس لمحے کے بعد مجھے یہ انداز ہوا کہ میں زندہ بچ گیا ہوں۔ میرا پورا چہرہ زخمی ہے لیکن مجھے اپنے چہرے کے کسی زخم کا کوئی احساس نہیں تھا، ذرہ برابر تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اچانک مجھے ایک ہلکی سی ناگوار بو محسوس ہوئی گویا یہ ایک خوشبو تھی۔ لیکن پتا نہیں میرے اعصاب اس سے متاثر ہوئے تھے البتہ یہ کوئی خواب آور گیس تھی۔ جس سے مجھے ایک بار پھر بے ہوش کر دیا گیا تھا اور مزید مجھے نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہنا پڑا تھا۔ پھر ہوش آیا تو اس جگہ تنہا تھا جہاں میرا بستر پڑا ہوا تھا۔ لیکن قرب و جوار کی دیواریں ناقابل یقین تھیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ باقی سارا ساز و سامان تو غیر قدرتی ہے لیکن یہ جگہ جہاں میں موجود ہوں، کسی پہاڑ کے اندر موجود غار ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کسی غار میں کیسے آیا۔ معاً وہ پٹیاں یاد آئیں جو کچھ دیر قبل چہرے پر کسی ہوئی تھیں۔ لیکن اب ان کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنی کیفیت کو محسوس کرنے لگا۔ پھر میری نگاہیں سامنے ایک سوراخ پر پڑیں جس پر خوب صورت سا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب ہی ایک بٹن موجود تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سوراخ کے پاس پہنچ گیا میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ مجھے وہ بٹن نظر آ گیا تھا جو بیرونی حصے پر لگا ہوا تھا۔

میں نے اس بٹن پر انگلی رکھی تو دروازہ بے آواز پتھر کے ایک خلا میں داخل ہو گیا اور میں اس سلائیڈنگ دروازے کے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ یہ بہت ہی عمدہ قسم کا واش روم تھا۔ میری حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے پہاڑوں کے اندر یہ سب کچھ تراشا ہے۔ لیکن اتنا حسین تھا یہ سب کچھ کہ دیکھ کر انسان کی کاری گری پر حیرت ہوتی تھی۔ اندر وہ تمام لوازمات موجود تھے۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ شیو تک بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے بے ہوشی کے عالم میں یہ لوگ میرے ساتھ کیا کیا سلوک کرتے رہے تھے۔

لیکن یہ تھے کون۔ کیا یہ پہاڑی مصنوعی ہے یا قدرتی۔ منہ دھویا، بال سنوارے پھر اس دوسرے دروازے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جو ایسے ہی غار کے دہانے پر لگا ہوا تھا۔ اسے کھولنے کا بھی یہی انداز ہو سکتا تھا میں وہاں سے باہر نکلا۔ جونہی میں باہر نکلا تو میں نے اس دوسرے دروازے سے کسی کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور یہ دیکھ کر میرے دل و دماغ کو شدید جھٹکا لگا کہ وہ مونی تھی۔

میری زندگی، میری روح، میرے لیے دنیا کی سب سے حسین عورت، جسے میں دل و جان سے چاہتا تھا۔ مونی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی تو میں تیز قدموں سے آگے بڑھا اور میں نے قریب پہنچ کر اسے اپنے سینے میں سموتے ہوئے کہا۔

''مونی! تم یہاں۔'' مونی کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ پھر وہ بے اختیار رونے لگی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لپٹائے رکھا۔

''نہیں مونی پلیز۔ روتے نہیں۔ میری زندگی، میری روح، میں نہیں جانتا میں کتنے عرصے سے تم سے جدا رہا ہوں۔ لیکن یہ کون سی جگہ ہے اور میں

یہاں کیسے پہنچ گیا ہوں اور تم، تم۔۔۔ اوہ میرے خدا! کیا میں ایزی ہارڈ کے پاس ہوں۔''

مونی روتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بہرحال ماضی کی ہر بات میرے ذہن میں تھی اور میں جانتا تھا۔ اپنی مہم پر میں کس حادثے کا شکار ہوا تھا اور اس کے بعد غالباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ مونی روتی رہی۔ میں نے اس سے کہا۔

''مونی! کیا یہ کوئی ایسی جگہ ہے جو ہمارے لیے خطرناک ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے سسکی لے کر کہا۔

''تم شہزاد ہو نا؟''

''ارے، کیا مطلب ہے تمہارا، کیا میرا چہرہ بدل گیا ہے، مگر میں نے تو ابھی اس واش روم کے آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھا ہے۔''

''تم شہزاد ہو نا۔'' مونی نے پھر اسی انداز میں سوال کیا۔

''مونی کیا میں تمہیں اجنبی لگتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ۔۔۔ وہ آہستہ سے بولی، پھر کہنے لگی۔''

''کچھ کھانے کو لاؤں تمہارے لیے؟''

''پہلے یہ بتاؤ میں یہاں کیسے پہنچا، کیا میں بے ہوش تھا۔''

''ابھی نہیں، ایزی تمہیں یہ سب کچھ بتائے گی۔'' مونی نے کہا۔

''یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ ایزی ہارڈ ہی کا ٹھکانہ ہے۔ لیکن تم لوگ مجھے سمندر سے کیسے نکال کر لائے۔ کیا میں ایزی کے ہاتھ لگ گیا تھا۔''

''یہ سب کچھ تمہیں ایزی ہی بتائیں گی۔'' مونی نے بدستور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''ارے بابا ٹھیک ہے مگر تم رونا تو بند کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے رونے سے مجھے کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔''

مونی آنسو خشک کرنے لگی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں مونی کے انداز میں ایک پراسراری کیفیت میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ دیوار میں لگے ہوئے ایک اسپیکر سے آواز آئی۔

''مونی۔'' اور مونی چونک پڑی۔ میں نے بھی ایزی ہارڈ کی آواز صاف پہچان لی تھی۔ مونی نے وہیں سے کہا۔

''یس ایزی!''

''کیا حال ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ شہزاد ہوش میں آ گئے ہیں۔''

''یس ایزی!''

''انہیں لے آؤ۔ میں ہال نمبر پانچ میں ہوں۔''

''بہت بہتر ایزی!'' آواز بند ہو گئی۔ میں نے خود ایزی سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ جب آواز بند ہو گئی تو میں نے مونی سے پوچھا۔

''یہ وہی علاقہ ہے نا۔''

''جہاں ایزی نے اپنا شہر بسا رکھا ہے۔''

''نہیں۔''

''کیا مطلب، کوئی اور جگہ ہے یہ۔''

''تمہیں یاد نہیں ہے شہزاد!''

''مجھے تو یاد ہے لیکن۔۔۔''

''کیا وہ جگہ اس طرح پہاڑوں میں بسی ہوئی تھی۔''

''مگر جو کچھ یہاں موجود ہے وہ تو۔۔۔''

''یوں سمجھ لو کہ یہ ایزی کی ایک نئی دنیا ہے۔''

''کون سے علاقے میں؟''

''یہ جگہ کورنیان کہلاتی ہے۔''

''کورنیان۔۔۔''

''ہاں۔''

''میرے لیے اجنبی نام ہے۔ کون سے براعظم میں ہے۔''

''آؤ۔ اصل میں یہ حق ایزی کے پاس محفوظ ہے۔ میں تمہیں اپنی زندگی کی ہر شے دے سکتی ہوں

لیکن جو حقوق ایزی کے ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ ہمیں پامال نہیں کرنے چاہئیں۔''

''چلو ایزی کے پاس چلتے ہیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ایزی ہارڈ پہلے سے زیادہ پراسرار ہوگئی ہے۔'' ہم دونوں اس ہال کے گول دروازے سے باہر نکل آئے۔ مونی مجھے لے کر بائیں سمت چل پڑی اور میں اس عظیم الشان ہال کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہاڑوں کے اندر اگر یہ سرنگیں قدرتی ہیں تو ہم انہیں دنیا کا ایک عجوبہ کہہ سکتے ہیں۔ ہم ایک دروازے پر رکے جہاں ایک بٹن لگا ہوا تھا۔ جسے دبانے سے دروازہ کھل گیا اور اس کے بعد ہم اندر ایک ہال میں داخل ہوگئے۔ ایک بہت بڑے صوفے پر ایزی ہارڈ بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پورے ہال میں اس وقت ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ایزی ہارڈ چند قدم آگے بڑھی اور میرے سامنے پہنچ گئی۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

''بیٹھو۔'' ایزی نے سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اور مونی بیٹھ گئے۔ ایزی بھی بیٹھ گئی تھی۔ اس نے مونی کی طرف دیکھا اور بولی۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا۔''

''ہاں ایزی!'' رخسار نے پھر سسکی لے کر کہا۔

''اوہ! بے وقوف لڑکی! جب انسان کو اس کی کھوئی ہوئی چیز مل جاتی ہے تو وہ روتا نہیں، ہنستا ہے۔ میں تمہیں ہنستا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیوں شہزاد! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟''

''ہاں ایزی اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن آپ یقین کیجیے میں سخت متحیر ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''میں ایک ایسے ویران جزیرے میں حادثے کا شکار ہوا تھا جہاں مجھے کسی کے پہنچنے کی امید نہیں تھی اور حادثہ بھی خدا کی پناہ۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے میرا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہو۔'' ایزی نے پھر مونی کی طرف دیکھا اور مسکرادی۔

''آپ کی مسکراہٹ بڑی پراسرار ہے ایزی سوال کرسکتا ہوں کہ کیوں؟''

''سوال نہ کرو۔'' ایزی نے کہا۔

''لیکن نہیں۔ ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً بولنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

''نہیں کہو، کیا کہہ رہے تھے۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں ایزی کہ یہ سارا گورکھ دھندا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ تم حادثے کا شکر ہوئے تھے نا۔''

''ہاں ایزی! مگر اس کے بعد بہت سی باتیں میرے ذہن میں سوال بن کر اٹکی ہوئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مثلاً۔۔۔'' ایزی مسکرا کر بولی۔

''اصل میں آپ لوگوں کا انداز اس قدر پراسرار ہے ایزی کہ میرا ذہن الجھتا ہے۔''

''نہیں، میں تمہارے ذہن کو الجھانا نہیں چاہتی۔ میں نے تم پر جس قدر محنت کی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''ایزی! یہ تو میں جانتا ہوں۔ ظاہر ہے میں اس طرح یہاں نہ پہنچ پاتا۔ آپ نے مجھ پر جو محنت کی ہے۔ میں آپ کا شکریہ نہیں ادا کروں گا۔ کیونکہ اس کے لیے آپ خود ہی مجھے منع کرچکی ہیں۔''

''اور تم نے میرے لیے اپنی زندگی میں جتنی محنت کی ہے شہزاد! میں بھی اس کا شکریہ نہیں ادا کروں گی کیونکہ ہم دونوں کے درمیان تکلف کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''مانتا ہوں ایزی! لیکن تجسس میرے ذہن میں ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی وجہ ہے جس کے تحت آپ مجھے کچھ بتانے سے گریز کررہی ہیں تو پھر میں خاموش ہوجاتا ہوں۔ ظاہر ہے اس کی بھی کوئی مناسب ہی وجہ ہوگی۔'' ایزی پھر مسکرادی اور بولی۔

''ٹھیک ہے شہزاد! میں تم پر احسان نہیں جتانا چاہتی لیکن تم اگر اس بات کے لیے بضد ہو کہ میں تمہیں گزرے ہوئے واقعات بتاؤں تو پھر سنو۔ تم سالہا سال ہم سے دور رہے ہو اور تمہاری زندگی سے ایسی ایسی داستانیں وابستہ ہوئی ہیں کہ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔''

''سالہا سال۔'' میں نے تعجب بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں۔''

''لیکن ایزی! میں کیا زخمی حالت میں رہا ہوں؟''

''نہیں۔''

''تو پھر۔۔۔؟''

''شہزاد! اس حادثے نے تمہارے بدن کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ تم زندہ سلامت نظر آ رہے ہو۔ میں اتنی سائنسی قوتیں حاصل کرنے کے باوجود اس سے بڑی قوت کی دل و جان سے قائل ہوں جو اپنی مخلوق کے لیے صحیح فیصلے کرتی ہے۔ تمہارا زندہ بچ جانا ایک عجوبہ ہے غالباً تمہیں کسی ایسی شخصیت نے حاصل کر لیا جو سرجری میں کمال رکھتی تھی اور پھر تم اس کے پاس رہے، وہ ایک جزیرہ تھا لیکن کون سا جزیرہ۔ یہ بات تمہارے اپنے ذہن میں نہیں ہے۔ وہاں سے تم ایک سمندری جہاز کے ذریعے چلے اور اس کے بعد زندگی کی اتنی الجھنوں میں گرفتار ہوئے کہ اگر ان کی ترتیب دینے بیٹھا جائے تو ایک طویل کتاب بن سکتی ہے اور اس کے بعد تم کورنیان پہنچے اور مجھے اس طرح ملے کہ تمہاری شکل بالکل تبدیل تھی لیکن بس تقدیر ہم پر مہربان تھی اور ہمیں تمہارے بارے میں علم ہو گیا کہ تم شہزاد ہو اور پھر ظاہر ہے شہزاد میری زندگی کی کاوشیں اگر تمہارے کام نہ آتیں تو میں ان کاوشوں پر لعنت بھیج دیتی۔''

''کیا واقعی ایزی!'' میں نے شدید متحیرانہ انداز میں کہا۔

''ہاں ایسا ہے، موہنی سے پوچھ لو۔ جس نے تمہارے بغیر ایک طویل زندگی گزاری ہے۔''

''اوہ میرے خدا! یہ تو واقعی بڑی عجیب کہانی ہے لیکن ایزی میرا چہرہ۔''

''تمہارا چہرہ از سر نو تبدیل کیا گیا۔ میں نے اور موہنی نے مل کر یہ کام کیا ہے۔''

''یعنی میرا چہرہ بالکل اجنبی ہو چکا تھا۔''

''اتنا کہ اگر تم اسے دیکھ لیتے تب بھی پہچان نہ پاتے۔''

''خدا کی پناہ اور ایزی جو داستانیں میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ کیا آپ کو ان کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔''

''کسی حد تک صرف تمہاری زبانی۔''

''کیا وہ داستانیں میرے علم میں آ سکتی ہیں ایزی؟''

''نہیں۔ وہ خوابوں کی کہانیاں تھیں۔ آنکھ کھل جانے پر خواب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور موہنی کو دیکھنے لگا۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایزی یا موہنی جھوٹ بول رہی تھیں لیکن یہ حقیقت تھی کہ یہ سب کچھ میرے لیے بڑا عجیب تھا۔ نہ جانے وہ کیا کیا داستانیں ہوں گی، نہ جانے کون لوگ میری اس اجنبی زندگی سے وابستہ رہے ہوں گے۔ اب تو کچھ یاد نہیں تھا۔ بہر حال میں کافی دیر تک اس تاثر میں ڈوبا رہا پھر میں نے مسکرا کر موہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر خدانا خواستہ میں اپنی اصل حیثیت سے واپس نہ آتا ایزی تو میری موہنی مجھ سے دور ہو جاتی۔'' موہنی کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے تھے۔ ایزی نے کہا۔

''تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ موہنی نے تمہارے بغیر یہ زندگی کس طرح گزاری ہے۔''

''میں تصور کر سکتا ہوں ایزی! لیکن ایزی اب ایک اور سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔''

''وہ بھی پوچھو۔ میں آج کا وقت تمہارے لیے مخصوص کر چکی ہوں۔''

''یہ کورنیان کون سا علاقہ ہے ایزی! کیا آپ کی اس لیبارٹری کے آس پاس کا۔۔۔''

''لیبارٹری۔۔۔'' ایزی نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

''کیوں؟''

''کک۔کیا۔۔۔؟''

''ہاں۔ یہاں ان پہاڑوں میں، میں نے جو مختصر سے انتظامات کیے ہیں۔تم یوں سمجھ لو یہ میری زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے۔''

''ایزی اس کا مطلب ہے کہ ہم۔۔۔''

''ہاں، اس پرانی جگہ سے ہزاروں میل دور۔ اب ہم وہاں کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔''

''مگر۔مگر۔۔۔''

''تم محسوس نہیں کرتے۔''

''محسوس تو کر رہا ہوں ایزی! لیکن یہ سوچا تھا میں نے کہ آپ کے لیے یہ سب کچھ تعجب خیز نہیں ہے۔میرا مطلب ہے کہ آپ یہ سب کچھ کسی بھی جگہ بنا سکتی ہیں۔''

''ایسا ہی ہوا ہے۔''

''مگر وہاں کیا ہوا تھا۔''

''بس کچھ سازشی عناصر ہمارے درمیان گھس آئے تھے۔ وہ کوئی ملکوں کے نمائندے تھے اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ مجھے تباہ برباد کر کے رہیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قسم پوری کر دی۔ کاش! وہ زندہ بچ جاتے تو میں انہیں خوش آمدید کہتی اور مبارک باد دیتی۔''

''تو وہ۔وہ۔۔۔''

''ہاں۔ انہوں نے ہماری برسوں کی کاوش پر پانی پھیر دیا، تباہ کر دیا ہماری اس لیبارٹری کو۔ ان کا تعلق دنیا کے کئی ملکوں سے تھا اور ساری دنیا نے مل کر میری اس لیبارٹری کا پتا لگایا تھا اور پھر انہوں نے اپنی زندگیاں دے کر میری وہ تجربہ گاہ بند کر دی۔''

''مکمل طور سے۔۔۔''

''تقریباً یہی سمجھ لو۔ بس تھوڑا سا سامان بچا تھا جسے میں اپنے ذرائع سے نکال کر لے آئی اور پھر میں نے وہاں سے اتنے فاصلے پر کورنیان کے اس علاقے میں اپنی یہ تجربہ گاہ بنائی۔''

''گویا میری بے ہوشی اور خود فراموشی کا یہ عرصہ اتنا طویل رہا۔''

''اس سے بھی زیادہ طویل۔ اگر تم نے ان پہاڑوں کا اندازہ لگا لیا ہے تو سمجھ لو یہ کتنے عرصے میں اس قابل ہوئے ہوں گے۔''

''اور اتنے عرصے میں آپ سے دور رہ... ایزی!''

''مجھ سے بھی اور موہنی سے بھی۔'' ایزی نے جواب دیا۔

''لیکن وہ۔وہ لوگ۔۔۔''

''میں نے کہا نا انہوں نے اپنی قومی جذبوں کے تحت میری وہ لیبارٹری تباہ کی۔ حالانکہ وہ سب کچھ غلط تھا، ارے کم از کم مجھ سے میرا موقف تو معلوم کر لیتے۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں انسانیت کی بھلائی کے لیے ہی کر رہی ہوں۔ میں نے کون سی دنیا میں تخریب کاری کی ہے۔''

میں خاموشی سے ایزی کی یہ باتیں سنتا رہا۔ واقعی ایزی بہت غم زدہ تھی جو کچھ اس نے کیا تھا وہ میں دیکھ چکا تھا اور وہ سب کچھ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں تھی اور پھر ایک ایسا انسان جس کی عمر ڈھل رہی ہو اور اسے یہ امید نہ ہو کہ اب اپنی زندگی میں وہ سب کچھ کر سکے گا جو اس نے کیا تھا۔ ایزی کے دل میں بھی گہرے گھاؤ ہیں۔ میں ان کی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ کافی دیر تک میں خاموش رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن آپ فکر نہ کریں ایزی! میں بھی اب آپ کے مشن کا ساتھی ہوں۔ جن ممالک نے آپ کے ساتھ یہ ساری کارروائی کی ہے میں ان سے انتقام لوں گا۔ ماضی میں بھی یہی کرتا رہا ہوں اور مجھ

ہوئی ہے کہ وقت نے ایک بار پھر مجھے اس کا موقع دیا
ہے۔'' ایزی کے ہونٹوں پر ایک مدہم مسکراہٹ پھیل
گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
''نہیں شہزاد! میں اپنی غرض کے لیے اب تمہاری زندگی سے اس سے زیادہ نہیں کھیل سکتی۔
''میں سمجھا نہیں ایزی!''
''اب تم گھریلو زندگی گزارو۔ تمہیں موہنی کو دیکھنا ہے۔ تمہارا اپنا ایک موقف ہے۔ ایک خاندان ہے، ایک انداز ہے، میرا کیا ہے، میں تو اسی طرح اپنی کارروائیاں کرتے کرتے آخر کار ایک دن فنا ہو جاؤں گی۔''
''ایزی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، کیا مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے آپ کو۔''
''خدا کی قسم بالکل نہیں۔ لیکن بس بہت عرصہ ہو گیا۔ اب تمہیں دوسرے انداز کی زندگی گزارنی ہے۔'' میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔
''میری زندگی کا کوئی دوسرا انداز نہیں ہے ایزی! آپ جانتی ہیں کہ میری زندگی میں اگر کچھ ہے تو صرف اور صرف موہنی ہے۔ موہنی میرے قریب موجود ہے اور آپ نے جس طرح موہنی کو اپنے ساتھ رکھا ہے اور جس طرح اس کی حفاظت کی ہے۔ بس اس کے لیے میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے مقصد کے لیے کام کروں۔''
''شہزاد! جب میں نے یہ سوچا کہ تمہیں اپنے کام کے لیے استعمال کروں تو اس میں، میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اب جب میں یہ سوچ رہی ہوں کہ میرا کام تو ویسے بھی مختصر ہو گیا ہے اور میں اپنی گاڑی چلا رہی ہوں اور مجھے کوئی دقت نہیں ہے تو پھر اب کم از کم میں تمہیں اپنے مقصد کے لیے قید نہیں رکھنا چاہتی۔''
''یہ قید نہیں ہے ایزی۔ یہ میری خوشی ہے۔''
''اور وہ میری خوشی ہے۔''
''یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔'' میں نے کہا۔
''میں نے کہا نا اب تم گھریلو زندگی گزارو۔ موہنی کو ایک گھر دو۔''
''لیکن، میں اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں ایزی!''
''شہزاد! شاید تم زندگی میں پہلی بار مجھ سے اس قدر ضد کر رہے ہو ورنہ عموماً یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ میں نے کوئی موقف اختیار کیا اور تم نے اس کی حمایت کی۔''
''مگر میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا ایزی!''
''تم سے جدا کون ہو رہا ہے شہزاد!''
''آپ مجھے بالکل اسی طرح کام کرنے کا موقع دیں جس طرح میں کام کرتا رہا ہوں۔''
''اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔''
''تو ٹھیک ہے ایزی! اگر آپ مجھے یہ موقع فراہم نہیں کر سکتیں تو آپ کی مرضی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' ایزی نے سنجیدہ ہو کر مجھے دیکھا پھر بولی۔
''کیا کرنا ہے تمہیں، معلوم کر سکتی ہوں میں۔''
''ہاں۔ ان ممالک کے نام معلوم کر کے میں ان سے انتقام لوں گا۔''
''نہیں شہزاد پلیز۔ اس موضوع پر اتنی زیادہ گفتگو نہ کرو اور تم کچھ نہیں کرو گے۔ دیکھو ان ایجنٹوں نے اپنی زندگیاں قربان کر کے میری لیبارٹری تباہ کی۔ بے شک انہوں نے مجھے ایک ناقابل فراموش نقصان پہنچایا لیکن اپنی زندگیاں دے کر۔ میں ان کے موقف کو ختم نہیں کرنا چاہتی، میں انہیں ان کے مشن میں سرخرو کرنا چاہتی ہوں۔'' میں خاموش ہو گیا ایزی کی عظمت کو محسوس کر رہا تھا۔ کیا عظیم سوچیں رکھتی تھی وہ عورت اور یقینی طور پر اسے ایک بڑا مرتبہ دیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ضد کی تو اس نے کہا۔

''مجھے اس جگہ نہ لے جاؤ شہزاد! کہ میرا اور تمہارا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ میں تمہارے ذہن سے اپنا تصور مٹادوں گی۔ میں تمہارا برین واش کردوں گی۔ تمہارا بھی اور مونی کا بھی اور اس کے بعد تمہارے ذہن میں ایزی نام کی کسی شخصیت کا تصور تک باقی نہیں رہے گا تم کسی اور حیثیت سے زندگی گزارو گے۔ یہ میں نہیں چاہتی۔ شہزاد! اگر تم میری بات اس وقت مان لیتے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان ایک رابطہ رہے گا۔ جب بھی میرا دل گھبرائے گا میں تم سے مل لوں گی۔ تمہارے پاس پہنچ جایا کروں گی۔ اس سے مجھے کم از کم یہ سکون حاصل رہے گا کہ جب میں اپنے ان ہنگاموں سے تھک گئی تو تمہارے پاس آ کر ایک عام انسان کی حیثیت سے آرام کیا کروں گی۔ کیا تم نہیں چاہتے یہ سب؟''

میں شکست خوردہ نگاہوں سے ایزی کو دیکھنے لگا پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں ایزی!''

''بہت بہت شکریہ۔ مونی! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ آخر کار ایک دن تمہارا شہزاد تمہیں ملے گا۔ میں اس کے لیے کاوشیں کروں گی اور مجھے خوشی ہے کہ قسمت نے مجھے اس کا موقع دیا ہے۔ اب آرام کرو، میں دیکھتی ہوں کہ میں تمہارے لیے کہاں جگہ بنا سکتی ہوں۔''

پھر میں اور مونی وہاں سے اٹھ گئے۔ لیکن میرے ذہن پر ایک عجیب سا بوجھ طاری ہو گیا تھا، ایزی کو جو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ واقعی ایسا تھا کہ کوئی بھی شخص اس سے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ملول ہونے سے بچا نہیں سکتا تھا۔ لیکن ایزی ایسی عورت تھی کہ وہ ان لوگوں کی تعریف کر رہی تھی جنہوں نے اس کی لیبارٹری تباہ کی تھی۔ وہ ان کے ملی جذبوں کو سراہتی تھی یہ اس کی عظمت کی انتہا تھی۔ مونی اور میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو ایک باقاعدہ کمرے کی شکل رکھتی تھی۔ ایک غار تھا ایسا ہی دروازہ لگا ہوا تھا۔

''بیٹھو مونی! میں مضمحل ہو گیا ہوں۔'' مونی بیٹھ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔

''مونی! ایزی کے بغیر تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کیا اب بھی ایسی بات ہے۔'' مونی نے میرے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس کی پھر تڑپ کر بولی۔

''اگر تم سمجھتے ہو شہزاد کہ میں تمہاری کسی بات سے منحرف ہوں تو یہ میرے ساتھ زیادتی ہو گی مجھے بتاؤ تمہارے بغیر میں کیا کرتی۔''

''میں جانتا ہوں۔ ویسے کیا ایزی نے یہ علاقہ خاص طور سے منتخب کیا ہے۔''

''ہاں اس سلسلے میں اس نے بڑی ذہانت سے کام لیا اور خاصے مشکل ذرائع استعمال کیے۔ اتنے ساز و سامان کا یہاں پہنچنا کتنا مشکل ہو سکتا ہے شاید تمہیں اس کا اندازہ نہ ہو۔''

''مجھے تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہے مونی! میں تو ایک نومولود بچے کی مانند ہوں۔''

''بہت مشکلات پیش آئیں تھیں۔ وہاں جو کچھ تھا وہ تباہ ہو چکا تھا۔ ان سیکرٹ ایجنٹوں نے نہ جانے کس کس طرح وہاں رسائی حاصل کر لی تھی اور اس کے بعد انہوں نے وہاں تباہی پھیلائی وہ سب کچھ ختم ہو گیا جو ایزی کی زندگی بھر کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ وہ حوصلہ مند عورت دکھ کا شکار رہی۔ یہ دکھ اس نے اپنے وجود میں اتار لیا اور یقین کرو شہزاد! اب وہ اس قدر خوش نہیں ہے جتنا پہلے تھی۔''

''وہ ضد کر رہی ہے مونی! ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔''

''وہ اس قدر بضد ہے کہ اگر ہم اسے مجبور کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا دے گی۔'' مونی نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ میں یہ نہیں چاہتا۔ ہمارا اس سے رابطہ ضروری ہے۔ اگر وہ اس بات کی خواہش مند

"ہم ان سے علیحدہ رہ کر زندگی گزار دیں گے تو ہم ایسا کریں گے۔"

"شہزاد! اگر ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں تو کہاں جائیں گے؟"

"تمہارے ذہن میں کوئی تصور ہے مونی؟"

"دنیا کا کوئی بھی گوشہ اپنا لیں گے۔ جب خاموشی سے ہی زندگی گزارنی ہے تو ایسا ہی کیوں نہ کیا جائے۔"

"ہاں، یہی ٹھیک ہوگا، ہم اپنے نام بھی تبدیل کر لیں گے۔"

"بہرحال ہم حوصلہ مندی سے کام لیں گے اگر ایزی یہ چاہتی ہے کہ ہم بھی زندگی کے انہی لمحات سے گزریں تو ٹھیک ہے مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

"بہرحال دل میں خواہش تو بہت سی ہوتی ہیں اور میں نہیں جانتا کہ کب یہ خواہشیں طوفانی شکل اختیار کر جائیں۔"

تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ ہم لوگ غیر مطمئن نہیں تھے۔ مونی میرے ساتھ تھی اور ایک طویل عرصے کے بعد مجھے حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے زندگی کی دوسری خواہشات اپنے ذہن سے نکال ڈالی تھیں۔ اس رات بھی ہم غار میں اپنے بستر پر لیٹے تھے اور پُرسکون نیند لیتے رہے تھے۔ لیکن نیند کتنی پرسکون یا کتنی طویل تھی اس کا اندازہ مجھے نہیں ہوسکا اور نہ ہی مونی کو، البتہ جب سورج کی کرنیں ہم تک پہنچیں تو مونی نے میرے بازوؤں میں انگڑائی لی۔ ہم اپنے بستر پر آرام کی نیند سوئے تھے اور رات چپکے سے گزر گئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا، پھر میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولی۔

"جاگو گے نہیں سورج نکل آیا ہے۔"

"ہاں اٹھتے ہیں مونی!" میں نے کہا اور ہم دونوں جاگ گئے۔

(جاری ہے)

مسکراہٹیں

کسی فرم کے ایک منیجر ریٹائر ہوئے تو ان کے ساتھیوں نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔ کھانے کے بعد ان کے جانشین نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "آج ہم سے ایک ایسا شخص جدا ہو رہا ہے جسے خوف اور زیادتی کے معنی نہیں آتے اور جو شکست کا مطلب نہیں سمجھتا۔"

پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "تحفے کے طور پر انہیں ڈکشنری دے دی جائے۔"

☆☆☆

ایک پھول فروش نے ایک نوجوان کو روکتے ہوئے کہا۔ "جناب! اپنی محبوبہ کے لیے پھولوں کا ہار لیتے جائیں۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میری کوئی محبوبہ نہیں ہے۔"

پھول والا۔ "تو پھر اپنی بیوی کے لیے لیتے جاؤ۔"

نوجوان۔ "افسوس کہ میں شادی شدہ بھی نہیں ہوں۔"

پھول والا یہ سن کر بولا۔ "اے دنیا کے خوش قسمت انسان یہ ہار میری طرف سے تحفے کے طور پر لے جاؤ۔"

☆☆☆

لڑکا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکی: "میں کیوں بتاؤں۔"

لڑکا: "مت بتاؤ، میں کون سا تمہیں اپنی ہونڈا کار میں بٹھا کے 5 اسٹار ریسٹورنٹ میں لے جانے والا تھا!"

لڑکی: "نام حنا، بی کام فائنل ایئر، جناح کالج، کالج ٹائمنگ صبح آٹھ سے ایک بجے تک، جمعہ کو صبح آٹھ سے بارہ بجے تک، اتوار کی چھٹی، جاتی ابو کے ساتھ ہوں واپسی پر اکیلی ہوتی ہوں۔"

خونی کھیل

ایم الیاس

ایک جوان، انتہائی پرکشش اور پر شباب گداز بدن کی شعلہ مجسم کے گرد گھومتی کہانی۔ جس نے اپنے شوہر کو راستے سے ہٹایا اور ایک پولیس آفیسر کو اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنے سگے باپ اور بہن کو بھی نذر آتش کیا۔ اپنے بھائی کو بھی موت سے ہمکنار کیا اور چچا کو بھی... موت کا نشانہ بنانے اور زندہ دفن کی کوشش کی... اس کی سب سے بڑی کمزوری جوان لڑکے اور مرد تھے۔

ایک لڑکی جو جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی نرم دل تھی۔ اس کا دل بھی بڑا خوب صورت تھا۔ اسے نفرت کرنا آتا ہی نہیں تھا... حویلی میں ایک خونی کھیل جو رقص کر رہا تھا۔

ایم الیاس کی خصوصی تحریر جو آپ کو بہت پسند آئے گی۔ نذر قارئین ہے۔

پتھر دل انسانوں کی کہانی جو بڑے سفاک اور درندہ صفت تھے

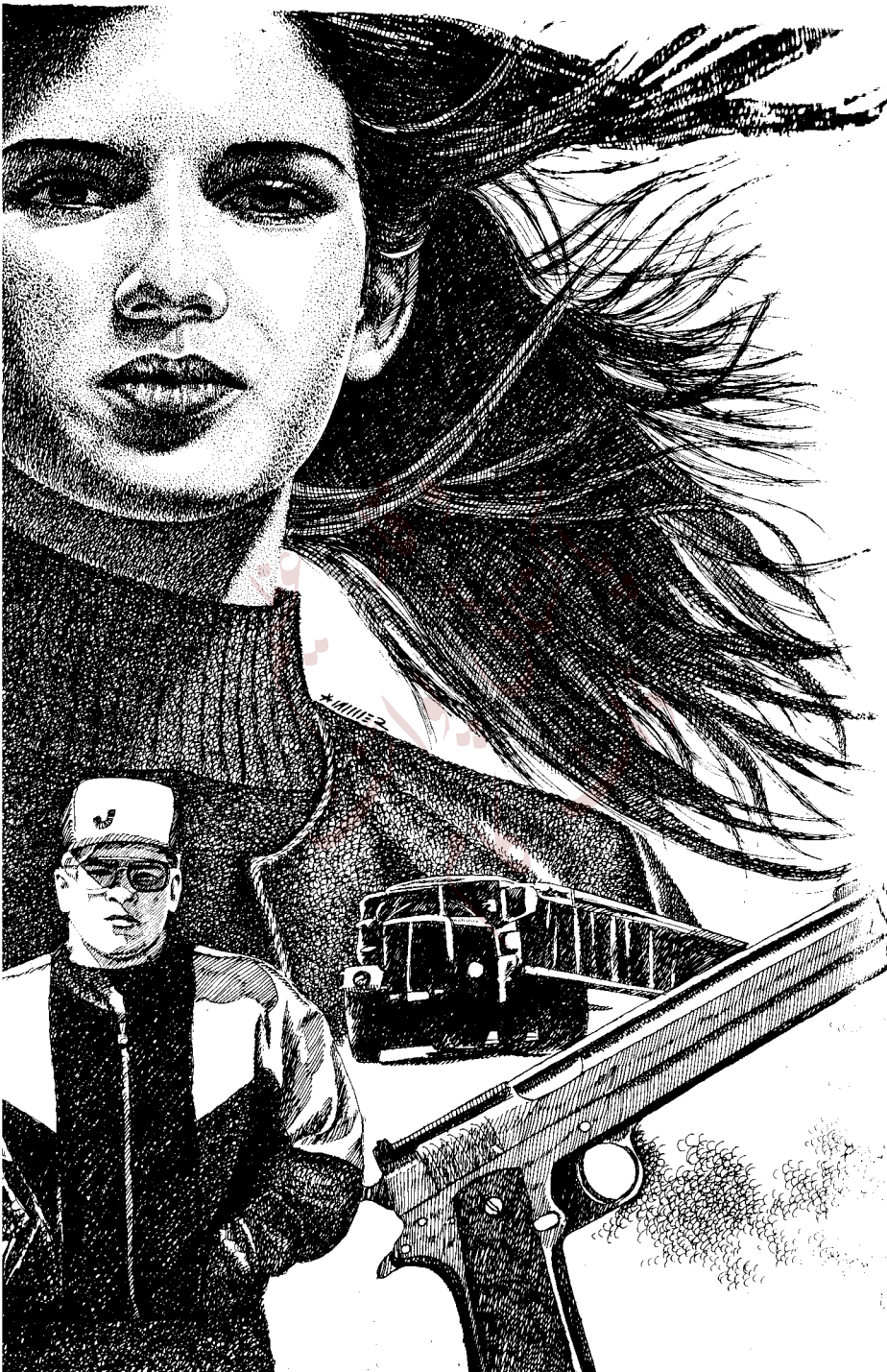

صبح کا وقت تھا۔ شیام پور کی ندی کنارے زندگی جنم لے چکی تھی۔ لڑکیاں عورتیں کپڑے اور برتن دھو رہی تھیں۔ نہ صرف بچوں کو نہلا رہی تھیں بلکہ خود بھی نہا رہی تھیں اور اِدھر مردوں کو لڑکوں کو آنے کی ممانعت تھی تاکہ آزادی سے نہا اور تیر سکیں۔

دوسری طرف گاؤں کے مچھیرے شکار پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چاروں طرف جو سناٹا تھا۔ چڑیوں کی چہکار نے صبح کو سہانا کر دیا تھا۔ دن کا اجالا تیزی سے ہر سمت پھیل رہا تھا۔

اچانک خاموش فضا میں انسانی آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ایک عورت نے ہزیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔

''وہ ادھر دیکھو۔۔۔'' کشتی میں انسانی آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ایک عورت نے ہزیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔

''وہ ادھر دیکھو۔۔۔کسی کی لاش لائی جا رہی ہے۔۔۔ہائے رام کس کی ہو سکتی ہے۔۔۔؟''

ندی کنارے لڑکیاں عورتیں۔۔۔لڑکے مرد بھی چونکے اور کام چھوڑ کے اس طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔وہ کشتی مغربی سمت سے آ رہی تھی۔ اس کے عرشہ پر جو چارپائی تھی اس پر لاش رکھی تھی۔ لاش کو سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ معلوم نہیں دیتا تھا کہ عورت کی لاش ہے یا کسی مرد کی۔۔۔کیوں کہ کشتی اتنی دور تھی کہ ٹھیک سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ چوں کہ لاش پر چادر ہونے سے لگ نہیں رہا تھا کہ کس کی ہو سکتی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ یہ کسی ڈاکو، لٹیرے اور مجرم کی نہ تھی۔ اگر ہوتی تو وہ چادر سے ڈھکی نہ ہوتی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ جب تک کشتی قریب آتی اس وقت تک بچہ بچہ اور سارا گاؤں اُمڈ آیا۔۔۔سنسنی، خوف و دہشت اور ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص پر تجسس تھا۔

''یہ کس کی لاش ہے بیٹا۔۔۔!'' کشتی کے قریب آتے ہی شامو چاچا نے کشتی میں کھڑے ہوئے نوجوان لڑکے سے پوچھا۔

''انیل بھیا کی۔۔۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔'' ایک جوان عورت نے ہذیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔بولو جھوٹ ہے۔''

''چہرہ دکھاؤ۔'' دوسری عورت بگڑ کے بولی۔

''کوئی اور ہو گا۔ انیل بھیا اوتار تھے۔ انہیں کبھی موت نہیں آ سکتی۔''

کشتی میں لاش کے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے لاش پر سے چادر ہٹا دی تو اس کا چہرہ بھی کسی مردے کی طرح ہو رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔ہاں یہ انیل بھیا ہیں۔'' ایک مرد نے زوردار آواز میں کہا۔ ''ہمارے دیوتا بھیا۔'' پھر وہ رو دیا۔

''انیل بھیا۔۔۔! انیل بھیا۔۔۔! ہمارے انیل بھیا۔۔۔! دیوتا بیٹا۔۔۔!'' ہر طرح چیخ و پکار مچ گئی۔

تھوڑی دیر بعد انیل کی لاش اس کے گھر میں صحن میں رکھی ہوئی تھی۔ وہاں موجود کون ایسا تھا جو دھاڑیں مار مار کے نہیں رو رہا تھا۔

اس چارپائی کے پاس جس پر انیل کی لاش رکھی تھی۔ اس کا بھائی ونود ایک کونے میں بت بنا بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا اور اپنے بھائی کی لاش کو منجمد نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے فرض شناس بھائی کو خوب جانتا تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا اور کہتا رہتا تھا۔

''ونود۔۔۔! وقت کا ہر لمحہ ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔۔۔میں نہیں جانتا کہ میری زندگی کب تمام ہو گی۔۔۔میں پولیس کی ملازمت میں آنے سے قبل بھی مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا رہا۔ پولیس کی وردی پہننے کے بعد تو میرے فرائض میں اور شدت پسندی آ گئی۔ میں نے کبھی کسی طاقت ور اور بااثر اور بڑی سے بڑی شخصیت کو نہیں بلکہ قانون کو دیکھا۔۔۔قانون کی لاٹھی نے کسی کو نہیں بخشا ہے۔۔۔اور

... تم ابھی جوان ہو۔۔۔ باہمت ہو اور ساتھ ... ذہین بھی۔۔۔ ذہانت سے بڑا موثر ... کوئی ہتھیار نہیں۔۔۔ میرے بعد تمہیں قانون کی بالا ... کے فرض کا یہ کام تمہیں کرنا ہے۔۔۔ اور ہاں ... جس صبح کا آفتاب میری زندگی کا چراغ ... دے، اس شب کے اندھیرے کی پناہ کو غنیمت ... اور ہر قدم پر محتاط رہنا کہ قاتل کی دست رسانی ... زندگی کی طرح ختم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔ ... نے اپنے بھائی کی شکست کو دیکھا تو اسے یوں ... جیسے کھلی آنکھوں کی التجا کو بے اثر دیکھ کر مردہ ... نے پکارا ہو۔ اس کے نبیل بھیا کی آشنا آرا ... دور سے آئی۔۔۔ ''ونود۔۔۔! مجھے تمہارے ... کی نہیں تمہارے عزائم کی ضرورت ... انتقام یہ امانت اب تمہارا ورثہ ہے۔۔۔ ... ہے۔۔۔ اسے جان عزیز سے اس کی حفاظت ... کرنا۔''

☆☆☆

رات کا سیاہ اندھیرا پہلے جیسا گہرا نہیں رہا تھا جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا اور سحر کے اجالے کا ہراول دستہ صبح کاذب لیے دھند میں اترنے لگا تھا۔۔۔ صبح کا آغاز ٹیکسال سے نکلنے والے چاندی کے نئے سکے کی طرح دکھ رہا تھا اور ماند پڑنے والے ستارے بالکل پرانی چونیوں کی طرح لگتے تھے لیکن ان کی دمک چمک آنکھوں کو خیرہ کرنے والی نہیں رہی تھی۔

واہ بھگوان ۔۔۔ اوپر چاند ستارے پھیلا دیے۔۔۔ اور دھرتی پر چوٹی اٹھنی اور روپے بنا دیے۔ نہ وہ اپنے، نہ یہ اپنے۔۔۔ شنکر چاچا نے کسی فلسفی کی طرح سوچا اور کروٹ بدل کے ایک سرد آہ بھری۔

اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی کہ آنکھ کھلتی تو سورج سر پر چمکتا ہوا ہوتا تھا۔ یہ سب ملاوٹ کرنے والوں کی بدمعاشی ہے۔ ایک ایک سکہ رکھوا لیتے ہیں اور جیسے احسان کر کے مال دیتے ہیں۔ مگر وہ بھی ناقص۔۔۔

شنکر کی نگاہ چوک کرنگرانی کے پہرہ دار پتھر کے اس مجسمے پر چلی گئی جو اپنے چبوترے پر ہاتھ میں انصاف کی ترازو لیے تقریباً سو برس سے ہر انسان کو بے حسی سے دیکھ رہا تھا جس بے حسی سے زندہ انسان برداشت کر رہے تھے۔ مرتے کیا نہ کرتے۔

چوک نام تھا دو نیم پختہ اور ناہموار راستوں کا جو صلیب کے بازوؤں کی طرح جو ایک دوسرے مل کر سیدھے گزر جاتے تھے۔۔۔ اور شنکر نے جب سے ہوش سنبھالا تھا کنور تیج سنگھ کو اس شان بے نیازی سے اس چوک کے وسط میں سیاہ پتھر کے تین فٹ اونچے چبوترے پر کھڑے دیکھا تھا۔ یک لخت اسے یوں لگا جیسے مجسمے نے اپنی جگہ بدل لی ہے۔ پھر ایک جگہ اسے دو مجسمے دکھائی دینے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ نظر کا دھوکا تھا اور اس گولی کا اثر تھا جس کی وجہ سے شنکر کا دماغ ابھی تک ماؤف تھا۔

مگر دوسری بار دیکھنے پر میں سراب قائم رہا۔ اندھیرے میں تھوڑا سا اجالا اور مل گیا تھا۔ چنانچہ شنکر کی نظر واضح طور پر دو پرچھائیاں دیکھ رہی تھی پورا منظر آسمان کے سرمئی کینوس پر بنی ہوئی سیاہ تصویر کی طرح تھیں۔ ایک پرچھائیں کے خطوط جانے پہچانے سے لگے۔ ہر رات وہ اپنے اس ٹھکانے پر سونے کے لیے آتا تھا اور پتھر کی بینچ پر اینٹ کو تکیے کی جگہ رکھ کے سو جاتا تھا۔ اس نے مجسمے کو چاندنی راتوں میں بھی دیکھا تھا اور اندھیری صبحوں میں بھی۔۔۔ یہ نہ ہوتا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔۔۔ پھر اس نے اپنی دونوں آنکھوں کو خوب مل کے دیکھا تھا۔ مجسمے واقعی دو تھے۔ یہ نظر کا فریب نہ تھا۔ وہ ہر طرح سے بالکل واضح تھے۔

ایک ساکت و جامد اور منجمد۔۔۔ اس طرح ایک ہاتھ پھیلائے میزان عدل سنبھالے۔۔۔ دوسرا متحرک۔۔۔ ترازو کے تیسرے پلڑے کی طرح۔۔۔ کیا ترازو کے تین پلڑے ہو سکتے ہیں۔۔۔ شنکر نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔۔۔ نہیں ایک بھی ہوئے چاہے دوسرے میں وہ چیز جو تولی جائے۔۔۔

کوئلہ یا سونا۔۔۔اور دال یا بھات۔۔۔کیا تیسرے میں دکان دار بیٹھا ہوا ہے۔۔۔یا خریدار۔۔۔وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔۔۔یہ تصور بھی خارج از امکان تھا۔مزید یہ کہ پتھر کے ترازو کے دو پلڑے بھی تو منجمد تھے۔مگر یہ تیسرا پلڑا جھول رہا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔۔۔رام رام۔۔۔ ستیاناس ہو اس گولی کا جس سے اب جاگتی آنکھیں ایسے بھیانک سپنے لگی ہیں۔ پہلے تو وہ نیک بخت دکھائی دے جاتی تھی جس نے جیون بھر ساتھ نبھانے کے لیے وچن دیا تھا مگر بیس برس بعد وہ وچن بھلا کے چتا پر جا لیٹی تھی۔ وہ ہرجائی نکلے گی اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اور پھر صرف ایک صدمہ تو نہ تھا۔تناور درخت جیسا بیٹا نظر آتا تھا جو ڈاکوؤں کے گاؤں پر حملے کے دوران مارا گیا تھا۔ بڑا جی دار بنتا تھا۔ان کا پیچھا نہ کرتا تو جیتا رہتا اور جو اگر ہوتا تو آج پوتے ہوتے۔ مگر اب اس کا کیا رونا۔۔۔اور وہ خود کہاں زندہ تھا۔ وہ بنچ پر سے اتر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ سراب حقیقت میں ڈھلنے لگا تھا۔۔۔یہ کون پاگل کا بچہ ہے جو صبح صبح آ کے پتھر کی شاخ سے پکے پھل کی طرح لٹک گیا۔۔۔نشے میں بھی آدمی سر کے بل کھڑا ہو سکتا ہے۔۔۔مگر اس طرح کیسے لٹک سکتا ہے۔ قریب جانے پر اسے رسی نظر آئی جو مشکل سے ایک ہاتھ لمبی تھی۔ وہ ٹھٹک کے رک گیا۔ کیوں کہ رسی کا ایک سرا تو مجسمے کے بازو پر بندھا ہوا تھا۔مگر دوسرا آدمی کی گرفت میں نہیں تھا بلکہ اس کی گردن سے کسی سانپ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔شنکر کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس سے لٹکنے والے آدمی کی گردن مضحکہ خیز طریقے پر دائیں جانب جھکی ہوئی تھی۔اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی سی تھیں اور ساکت تھیں۔۔۔شنکر نے ایک بار وہ لاش دیکھی تھی جو وارث شہر کی جیل سے لے کر آئے تھے۔ پھانسی پانے والے کی گردن بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔لمبی اور ربر کی بنی ہوئی۔۔۔اسے یوں لگا جیسے یہ وہی لاش ہے جو اس کی نظروں کے سامنے لٹکی ہوئی ہے۔ ہوا کے ساتھ ساتھ جھول رہی ہے۔ چوں کہ اس کے کریا کرم میں تو شنکر بھی شریک ہوا تھا اور دارثوں کے سامنے نہ سہی پیٹھ پیچھے۔اس نے بھی کہا تھا کہ یہ انصاف ہے۔۔۔خون کا بدلہ خون۔۔۔

اس نے سر جھٹک کر وہ وقت ذہن سے خارج کر دیا اور اس کے بارے میں مزید سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر وہ ہمت کر کے اور آگے بڑھا اور اس نے پہچاننے کی کوشش کی۔اسے تھانے دار یاد آیا۔

پھر اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔کیا تھانے دار نے خودکشی کر لی ہے؟

حیرت۔۔۔نہیں۔۔۔اس نے اپنے آپ کو قائل کیا۔۔۔تھانے دار خودکشی کیوں کرنے لگا۔۔۔ بغرض محال اسے مرنا ہی ہوتا تو وہ اپنے پستول سے اپنے اس کوارٹر میں خود کو گولی کیوں نہیں مار لیتا جو نیا نیا بنا تھا۔تھانے کی عمارت کے ساتھ ہی اس کی تکمیل ہوئی تھی اور وہ اس تھانے کا چارج لینے والا پہلا تھانے دار تھا۔مر کے خود کو کون تماشا بناتا ہے۔۔۔کیا زندگی سے عزیز آدمی کے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے کتنی جدوجہد اور جتن کرتا ہے۔

اب اس کے نزدیک شک و شبہے والی کوئی بات نہیں رہی تھی۔تھانے دار کو یقیناً کسی نے قتل کیا ہے۔ یہاں لا کے اسے پھانسی دے دی ہے۔اس نے ایک مہینے میں کتنی بار دعوا کیا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں کسی کی بدمعاشی چلنے نہیں دے گا اور حکومت صرف قانون کی ہوگی۔۔۔اگر کسی نے لاقانونیت کی تو اسے جیل کی ہوا کھلا دے۔۔۔بدمعاشوں اور مجرموں کی ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔ جو کسی کی سفارش لائے گا تو اسے اندر کر دے گا۔اس لیے کہ قانون کی بالادستی کسی مجرم کے ساتھ رعایت نہیں کرتی ہے۔قانون، قانون ہوتا ہے۔وہ اندھا ہوتا ہے۔وہ یہ نہیں دیکھتا ہے کہ مجرم کون اور کتنا بڑا ہے۔کتنا با اثر ہے۔طاقت ور ہے۔اس نے صرف کہا نہیں تھا بلکہ اس پر سختی سے عمل

... اماایا تی تھا۔ ایک تو جب لُہار کی بیٹی جو چودہ ... تو اس کے پڑوسی جوان لڑکے نے دست ... لی چاہی تو اسے دن بھر مرغا بنا کے رکھا ... اور پھر اسی چوک میں اور گن گن کر سو جوتے ... تھے۔ لڑکیوں اور عورتوں سے بھی کہا تھا کہ وہ ... جتنے جوتے مار سکتی ہیں لگائیں۔۔۔ ان ... سات نوجوان اور کم عمر لڑکیوں نے بھی ... مرمت کی تھی کیوں کہ وہ ان لڑکیوں سے ... مانیاں اور دست درازی کر چکا تھا اور انہیں ... جبر و زیادتی سے کھیتوں میں بری نیت سے ... جانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ادھر چند مرد کسان آ ... تھے ورنہ وہ ان لڑکیوں کی عزت لٹ چکی ہوتی۔

... کے تعینات ہونے سے گاؤں کا ماحول بدل گیا ... لڑکوں اور مردوں کی ہمت اور مجال نہیں تھی کہ راہ ... لڑکیوں، عورتوں کو میلی نگاہوں سے دیکھیں۔ ... گاؤں میں ایک جھیل گھنے درختوں سے گھری ... تھی وہاں عورتیں صبح اور دوپہر کے سناٹے میں آ ... نہ صرف آزادی سے نہاتیں بلکہ تیرتی تھیں اور ... وہاں مردوں کے جانے کی ممانعت تھی۔ جو لڑکے مرد ... چوری چھپے تانک جھانک کرتے تھے ان کے بال ... منڈا اور آدھے منہ پر کالک مل کر گاؤں میں ذلیل و ... خوار لیا تھا، گدھے پر سواری کروا کے۔

اور پھر دوسری مرتبہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ جب غلام ... کی گائیں بھینسیں چرا کے لے جانے پر کنور ... صاحب کا مالی پکڑا گیا تھا۔۔۔ منشی کاکا کے کھلیان ... میں آگ لگانے کی کوشش پر انہیں حوالات میں بند کر ... کے دماغ درست کر دیے تھے جن سے چوری ... کاریاں بالکل بھی بند ہو گئی تھیں۔ لچے لفنگے اور چھٹے ... بدمعاش بھی اس کی صورت دور ہی سے دیکھ کر کترا ... جاتے تھے۔

شنکر بے تحاشا تھانے کی طرف سر پر پیر رکھ کر ... بھاگا۔ حوالدار اور دو سپاہی گہری نیند میں غرق پڑے ... ہوئے تھے۔۔۔ گاؤں میں بھی سبھی سوئے ہوئے ... تھے۔ صرف شنکر نے تھانے دار کی لاش دیکھی تھی۔

اس لیے وہ سب سے پہلے یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ لاش صرف اس نے دیکھی ہے۔۔۔ کیا اس اطلاع پر سرکار اسے کوئی انعام دے گی۔۔۔ خیر یہ انعام نہ سہی۔۔۔ سب کو یہ بات معلوم ہو گی تو اس سے پوچھنے آئیں گے۔

''ارے شنکر چاچا۔۔۔! تم نے سب سے پہلے دیکھا تھا۔۔۔ کیسے۔۔۔؟ پھر ڈرے نہیں۔۔۔ خوف زدہ نہیں ہوئے۔۔۔ اور ہاں بے ہوش بھی نہیں ہوئے۔۔۔ بڑے مضبوط دل کے ہو۔۔۔ اچھا شروع سے بتاؤ۔''

وہ تھانے میں داخل ہوتے ہی چلانے لگا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ''دارو پی کے صبح صبح دنگا کرنے۔۔۔ کہاں آیا ہے۔۔۔؟ وہ بھی تھانے میں۔۔۔''

''ارے سنتری بادشاہ۔'' اس نے بمشکل کہا۔ ''میں نشے میں نہیں ہوں۔۔۔ حوال دار صاحب کو بلاؤ۔۔۔ بلاؤ۔۔۔ میں انہیں خود ہی بتاؤں گا۔ تھانے دار انیل شرما کو کسی نے پھانسی دے دی ہے۔۔۔ بھگوان کی سوگند۔۔۔ وہ چوک میں لٹکے ہوئے ہیں۔۔۔ یقین نہیں آ رہا ہے تو دیکھ لو چل کے۔''

لاٹ صاحب بہادر نے ایک گورے کمشنر کی جان بچا کے بحفاظت دلی پہنچانے پر کنور تیج سنگھ کو ایک بہت بڑی جاگیر عطا کی تھی۔ تیج پور انہوں نے ہی بسایا تھا۔ جب تک وہ جیے ریاست کے مطلق العنان اور خود مختار حکمران رہے۔ جن کی رعایا ان کی شان کی مالا جپتی تھی اور وہ حکمران بھی خوش رہے جن کی رعایا میں خود کنور صاحب شامل تھے۔ پچھتر برسوں میں چند مزارعین کے کچے گھروں اور ایک پکے مکان سے آباد ہونے والے تیج پور میں سینکڑوں کچے پکے مکان بن گئے تھے اور واحد پکے مکان کی جگہ کنور تیج سنگھ کے وارثوں کی شان دار پر شکوہ حویلی تعمیر ہو چکی تھی۔ یہ زمین اپنی زرخیزی سے سونا اگلتی تھی۔ ندی کے کنارے شیشم کا گھنا جنگل ہر سال کچھ

اور پھیل جاتا تھا۔ مزارعے ہل چلا کے فصلیں کاٹتے تھے اور کنور صاحب کے خزانے بھرتے تھے۔ مگر خود غربت کو مقدر کی بات جان کے کنور صاحب کے عطا کردہ اتنے ہی انعام و اکرام پر قناعت کرتے تھے جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہے۔ ان میں سے کسی کی کیا جرات تھی کہ اس مالی نا انصافی کی شکایت زبان پر لاتے۔ غریب، غریب سے غریب ہوتا جارہا تھا اور وہ امیر سے امیر تر۔۔۔ یہ ایک دستور تھا۔

کنور صاحب رعایا کی خوش حالی کے کبھی قائل نہ تھے اور رعایا ان کی آنکھوں میں تیز دھوپ کی طرح چبھتی تھی اور دل پر چابک رسید کرتی تھی۔۔۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کسان خوش حال ہوگا تو محنت سے جی چرائے گا۔۔۔ بچوں کو تعلیم دلائے گا۔۔۔ علم سے باغیانہ خیالات کی فصل پیدا ہونے لگتی ہے۔۔۔ اور کسان کو گھن لگ جاتا ہے۔۔۔ اسے اتنا ہی دو کہ ایک وقت پیٹ بھر کے کھائے تو دوسرے وقت کی فکر کرنے لگے۔

وہ ریاست میں تھانہ، پولیس کچہری، سب خود ہی تھے۔ ان کا حکم قانون تھا جس کی اپیل بھگوان کے سوا کسی کے پاس داخل نہیں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ان کے انصاف کا بول بالا تھا۔ ان کے جانشین پڑھ لکھ کر ان سنہرے اصولوں سے منحرف ہوئے اور نقصان میں رہے۔

کنور تیج سنگھ کو مرتے وقت اس بات کا افسوس تھا کہ انہوں نے دولت مندی کی تقلید کرتے ہوئے اولاد کو تعلیم کے حصول کے لیے سات سمندر پار کیوں بھیجا۔ وہ کوے تھے۔۔۔ کالے دیسی کوے۔۔۔ گورے راج ہنسوں کے دور میں وہ اپنی چال بھول گئے۔

دیش کو سوراج ملا تو ان کی جنتا نے بھی سوراج مانگنے کی جسارت کی۔۔۔ نمک حرام اور انسان فراموش لوگ سر اٹھانے لگے تو کنور تیج سنگھ کو اپنی غلطی کا اندازہ ہوا۔۔۔ مگر اس وقت پانی سر سے گزر چکا تھا۔۔۔ سرکار نے ریاست کے معاملات میں مداخلت کی۔ مقدمات ضلع کچہری میں فیصلہ ہونے لگا۔ پرائمری اسکول ترقی کر کے مڈل اسکول بن گئے اور ہسپتال میں سرکاری ڈاکٹر آنے لگے۔ ضلع کے حاکم۔۔۔ ڈپٹی کمشنر۔۔۔ تحصیل دار۔۔۔ اور مجسٹریٹ۔۔۔ تیج سنگھ کے پوتے کنور جے سنگھ سے ملنے آتے تھے۔۔۔ کبھی کبھی کسی دعوت کے بہانے تو کبھی شکار کھیلنے کے لیے۔۔۔ چنانچہ وجے سنگھ کی حاکمیت برقرار رہی۔

ریاست کے انضمام سے بھی صورت حال میں تبدیلی نہیں آئی۔

اور ان کے مسائل البتہ بند ہوگئے مگر وجے سنگھ کے ٹھاٹ باٹ میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ خود کو واقعی آزاد اور مختار سمجھنے والوں کو بہت جلد سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ آباؤ اجداد کی طرح اطاعت گزار رہیں اور سیاسی نعرے بازیوں سے گمراہ نہ ہوں۔ وہ حاکم ضلع کے پاس داد رسی کے لیے جائیں یا ضلع کچہری میں فریاد لے کر۔۔۔ فیصلہ وہی ہوگا جو ہر ضلعی حاکم ٹیلی فون پر وجے سنگھ سے مشورے کے بعد دے گا۔ اگر وجے سنگھ یا اس کے وارث دور اندیش اور وقت شناس ہوتے تو اندازہ کر لیتے کہ ان کی شاہ خرچی کا متحمل تو قارون کا خزانہ بھی نہیں ہوسکتا اور اپنی دولت جاگیر پر اکڑنے پھرنے کے بجائے اس سے کارخانے قائم کر لیتے تو جاگیر داروں سے صنعت کاروں کی صف میں شامل ہو جاتے اور ان کی اجارہ داری کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا۔ مگر وہ بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے جن کے لیے فکر معاش کی خاطر کام کرنا کسر شان تھا اور ان کی انا کی توہین بھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اب کنور وجے سنگھ کا خاندان اس دیو ہیکل برگد کے کھوکھلے تنے کی طرح رہ گیا جسے اندر ہی اندر دیمک چاٹ چکی ہو اور جیسے زلزلے کا خفیف سا جھٹکا یا معمولی سا طوفان زمین بوس کر سکتا ہو۔ لیکن ان کا دبدبہ باقی تھا۔ کنور وجے سنگھ بہت کم باہر نکلتا

اور وہ دیکھ رہا تھا کہ حالات کتنی تیزی سے بدل چکے ہیں۔ مگر وہ وقت جب کچھ کیا جا سکتا تھا گزر چکا تھا۔ وقت بڑا بے رحم تھا۔ سفاک اور خود غرض ہوتا ہے۔ وہ ٹھہرتا نہیں ہے کسی کا انتظار نہیں کرتا اس نے ان کا انتظار نہیں کیا۔ چنانچہ وجے سنگھ پشیمان پچھتاوے اور تاسف کے احساس کو ...میں ڈبو رہا تھا اور اس ناکام کوشش میں خود بھی ...رہا تھا۔ خود کو فریب دیتا تھا اور وہ سوچنا بھی نہیں ...تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔۔۔ کیسے اور کیوں ہوگا۔۔۔ وہ انجام اور مستقبل سے بے پروا ہو کر ...حال کی چکی میں پس رہا تھا اس کے نزدیک اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

زمین ہندو مہاجنوں کے پاس گروی رکھی جا چکی تھی۔۔۔ سونے چاندی کے ظروف پہلے زیورات میں ڈھلے تھے۔ پھر یہ زیورات چپکے چپکے بڑی راز داری سے کولکتہ کے صرافوں اور اعلا خاندان میں بک گئے تھے۔۔۔ اب ایک حویلی رہ گئی تھی یا وہ جنگل جو ندی کے ساتھ ساتھ میل بھر تک پھیلا ہوا تھا۔۔۔ مدت سے اسے کوئی ٹھیکے پر لینے نہیں آیا تھا اور کسی فرد نے سوچنے کی اور فکر کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔۔۔ فکر تھی تو صرف یہ تھی کہ ایسا کیوں ہوا اور کس لیے ہو رہا ہے۔

حویلی میں دو کاریں تھیں۔۔۔ ایک پرانے وقتوں کی پرشکوہ بیوک تھی۔۔۔ جھومتی اور شان تمکنت سے نکلتی تھی جو کنور وجے سنگھ کے خاندان سے منسوب تھی۔۔۔ دوسری نئی۔۔۔ بہت مختصر طوفان رفتار سے دوڑنے والی سرخ فاکسی ویگن جسے کنور سنگھ کی بیٹیاں اڑاتی پھرتی تھیں اور گاؤں کے باسی کھڑکی کے کھلے شیشے سے۔۔۔ ان کے شانوں تک نفیس انداز سے ترشے ہوئے کھلے بالوں کے سیاہ ریشم کو ان کے چہروں پر لہراتا دیکھتے رہ جاتے تھے۔۔۔ بوڑھے حیرانی سے اور جوان رشک سے۔۔۔ ان کے لیے وہ عورتیں نہیں کوہ کاف کی یا فلمی دنیا کی پریاں تھیں جو خوابوں میں ان کی ہو جاتی تھیں اور انہیں چاہتی اور مہربان ہو کر اتنی دور چلی جاتی تھیں کہ اپنی فیاضی اور شباب کے نشے سے انہیں مدہوش کر دیتی تھیں۔ جب وہ یہ پراگندہ سپنے سے بے دار ہوتے تو پھر وہی سپنا دیکھنے لگتے جو انہیں سارا دن چین لینے نہیں دیتا تھا۔

مگر حقیقی دنیا میں ان کی آرزو بھی کسی سنگین جرم سے کم نہ تھی اور جذبات اور ان جانے رنگین سپنوں کا ذکر بھی۔۔۔ وہ اپنے ان جانے تصورات کو دل میں تدفین کر کے سرد آہیں بھرتے، جن کا غبار سینے میں پھیل جاتا۔۔۔ اس گاؤں کے بہت سے منچلے اور جیالے نوجوان اپنی بے لگام خواہش سے مغلوب ہو کر انہیں غلط قسم کے سطحی انداز کے اشارے کرنے یا کسی فلمی گانے کے بول بولنے سے بھی باز نہیں آئے لیکن یہ جیالے تحصیل ہیڈ کوارٹرز کے تھانے پیش ہونے کے لیے اپنے پیسوں پر چل کے گئے تھے مگر کھاٹ پر ڈال کر لائے گئے تھے اور مہینے بھر درس عبرت بنے رہے۔۔۔ اور ظالم سماج کی ناانصافی پر خون کے آنسو بہاتے رہے تھے ان واقعات کی شہرت نے دوسروں کے عاشقانہ جذبات کو یوں سرد کر دیا جیسے پانی کی ایک بالٹی سے جیسے چلم کی آگ بجھا دی جائے۔۔۔ اب تو نوجوان کیا مرد اور بوڑھے بھی اس کھلی کھڑکی کی طرف سے دیکھتے نہیں تھے۔ انہیں اپنے جسم کی ہڈیوں اور چہرے کے جغرافیے کا بڑا خیال رہتا۔ وقت کے ساتھ کب چلے تھے۔ وقت نے ساتھ دیا تو کنور وجے سنگھ حالات کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالتے اور اپنی شان دار روایات کے حصار میں قلعہ بند رہتے۔۔۔ مگر وقت کسی ہرجائی عورت کی طرح بدلا تو ایک ایک کر کے سب ساتھ چھوڑ گئے۔

پہلے جاگیر سے ہاتھ دھو بیٹھے۔۔۔ پھر دولت کے سوتے خشک ہو گئے۔ حالات نے کنور صاحب سے بڑھاپے کی لاٹھی بھی چھین لی۔۔۔ بھگوان نے انہیں ایک بیٹے کی دولت سے نوازا تھا جو وہ کسی دنیا کسی بھی نعمت سے بھی کم نہ تھا۔۔۔ مگر ان کے نام بٹہ لگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گاؤں کی لڑکیوں اور شادی شدہ اور کئی کئی بچوں کی ماؤں کے سینے بھی دھک سے رہ

جاتے تھے۔۔۔ وہ شکاری بنا ہوا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہ ہوتی تو کہ لڑکی کی عمر کیا ہے۔۔۔ یہ عورت کتنے بچوں کی ماں ہے۔۔۔ یہ نو بیاہتا دلہن ہے۔۔۔ وہ حسن و شباب، بھرپور جوانی، سڈول، بھرا بھرا گداز جسم اور تناسب دیکھتا تھا۔ کس کی مجال تھی جو اس کی درندگی اور آبرو لوٹنے کی شکایت کی جاتی۔ جب لڑکیاں عورتیں گھروں سے نکلتی تھیں تو لمبا سا گھونگھٹ نکال کر۔۔۔ یا پھر ایسے لباس میں کہ جسم کی زینت ظاہر نہ ہو۔

اس کا نام بلونت سنگھ عرف بلی۔۔۔ انہی کا خون تھا تو شاید اس کا وجود اس خون کا عطیہ تھا جو فساد پیدا کرتا ہے۔

کنور صاحب کا اصل وارث ان کا بھائی بندر تھا جسے انہوں نے تین برس کی عمر سے پال پوس کر جوان کیا تھا اور اس کی شخصیت کو اپنے خاندان سانچے میں ڈھلتے دیکھ کر بہت پر امید تھے کہ وہ بگڑے ہوئے معاملات کو سنبھال لے گا اور خاندان کی ساکھ کی دیوار گرنے سے پہلے سہارا فراہم کر دے گا۔ وہ ذہین محنتی اور روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کی سربلندی پر غرور کرنا جانتا تھا۔ وہ وقت شناس، دور اندیش اور قابل فہم بھی تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ دنیا کہاں جا رہی ہے۔۔۔ کتنی تیزی سے بدل رہی ہے۔ وقت کے ساتھ۔۔۔ بدلا نہ گیا تو جاگیر، حویلی اور سونے کے زیورات۔۔۔ ہیرے جواہرات تو کیا جسم پر کپڑے تک نہ رہیں گے۔

مگر وہ ایک روز ناؤ لے کر نکلا تو لوٹ کر نہ آیا۔۔۔ ندی باڑھ پر نہ تھی اور وہ کالج میں کشتی رانی کے متعدد مقابلے جیت چکا تھا۔ بہترین پیراک بھی تھا۔۔۔ اگر کشتی الٹ جاتی یا کوئی اسے الٹا کے دریا کے بیچ میں پھینک دیتا تب بھی وہ تیرتا ہوا کنارے تک پہنچ جاتا۔۔۔ کنارے تک وہ پہنچا تو سہی۔۔۔ مگر کئی گھنٹے بعد۔۔۔ جب تلاش کرنے والے ناکام اور مایوس لوٹ آئے تھے۔ خالی کشتی بھی کنارے سے یوں آ لگی جیسے میدان جنگ میں مالک کے مارے جانے کی اطلاع لے کر اکیلا گھوڑا گھر کے دروازے آ کھڑا ہوتا ہے۔ صبح مچھیروں نے جال ڈالا تو گھاس پھوس میں الجھی ہوئی لاش بھی ایک ایسی جگہ سے برآمد ہوئی جہاں نہ کوئی تیرنے جاتا تھا اور نہ ہی کشتی لے کر۔۔۔ اور ندی کے پشتے سے آگے صاف ساحل کو چھوڑ کے جنگل کی طرف وہ شخص کیسے جا سکتا تھا۔ جو خود جنگل کا مالک ہو اور جس کا بچپن اس زمین کے چپے چپے سے آشنائی کے رشتے استوار کرتے کرتے گزرا ہو مگر تفتیش کے لیے آنے والے پولیس افسروں نے اسے حادثاتی موت قرار دیا تھا۔ کئی گھنٹوں کی تفتیش کے بعد۔

''آپ کے بھائی نے غوطہ لگایا اور آبی گھاس کی جڑوں میں الجھ گیا جو ایک جال کی طرح تھا۔''

''مگر کیسے۔۔۔؟ وہ ادھر گیا کیسے۔۔۔؟ کیوں گیا وہ وہاں۔۔۔ کہ اسے تو سب کچھ معلوم تھا۔۔۔'' وجے سنگھ نے غصے سے چلا کر کہا تھا۔ ''کیا وہ پاگل تھا۔۔۔ وہ میرا بھائی تھا۔۔۔ کیا میں تمہیں پاگل لگتا ہوں۔۔۔''

پولیس افسران تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے پر واضح کیا تھا کہ سکندر وجے سنگھ کو صدمے نے پاگل کر دیا ہے اور انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا تھا۔

''وہ۔۔۔ دیکھے نا۔۔۔ آج کل کے نوجوان۔۔۔ ایڈونچر کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اس نے شاید۔۔۔ یقیناً کوئی تجربہ کیا ہوگا۔''

''بکتے ہو تم۔۔۔ مہندر ہرگز ایسا نوجوان نہیں تھا۔۔۔ جاؤ دفع ہو جاؤ بدمعاشو! میری نظروں کے سامنے سے ورنہ ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔۔۔ کسی کو بھی زندہ جانے نہیں دوں گا۔'' انہوں نے اشتعال میں چلاتے ہوئے کہا تھا۔ ''کیا میں اندھا ہوں۔ اتنا بھی کیا دیکھ نہیں سکتا اور نہ سمجھتا کہ۔۔۔ مہندر کو کسی نے مارا ہے۔۔۔ تم اندھے ہو۔۔۔ پتا نہیں چلا سکتے کہ اسے مارنے والا کون ہے۔۔۔ تم سمجھتے ہو کہ مہندر کی موت ایک حادثہ ہے۔۔۔ کیا تمہیں اس کی

ولایت میں سازش کی بو نہیں آتی۔۔۔؟"
اس دن جیسے کنور وجے سنگھ کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ سورج ڈوبتے ہی ان کی ہر امید کا ستارہ ڈوب گیا تھا اور انہوں نے سارے اندیشوں کو۔۔۔ تمام دکھوں کو۔۔۔ اور دنیا جہاں کی مسرتوں کو شراب میں ڈبو دیا تھا۔

"یہ آپ خودکشی کر رہے ہیں پاپا۔۔۔" ان کا آکسفورڈ میں پڑھا ہوا بیٹا بلی کہتا تھا۔ "پلیز پاپا۔۔۔! آپ ایسا نہ کریں۔"

"ہاں۔۔۔ تُو کیا بتاتا ہے مجھے۔۔۔ تو میرا باپ ہے کیا۔۔۔؟" وہ غرا کے کہتے تھے۔ "میں تیرا باپ ہوں۔۔۔ یہ شراب نہیں۔۔۔ خون ہے میرا۔۔۔ بدمعاش۔۔۔! الو کے پٹھے۔۔۔! تو مجھے سمجھانے آیا ہے۔"

کنور جے سنگھ کے دوست۔۔۔ مشہور معالج ڈاکٹر شرما کہتے۔ "ذرا اپنی حالت کو دیکھو وجے!"

"کیا میری حالت بہت قابل رحم ہے۔۔۔"
وہ سوال کرتے تھے۔ "تو مجھ پر رحم کر۔۔۔ کوئی انجکشن لگا مجھے جس سے یہ پاپ کٹے۔۔۔ تو دوست ہے نصیحت نہ کر۔۔۔ میری مدد کر۔۔۔ ورنہ کوئی اور بات کر۔۔۔ کسی بھی موضوع پر۔"

کنور وجے سنگھ کی تینوں بیٹیاں سب کچھ دیکھتی تھیں۔ سنتی تھیں اور خاموش رہتی تھیں اس لیے اس میں انہیں اپنی عافیت محسوس ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بیٹی کلدیپ کور مڈل ورنیکلر کا پرائیوٹ امتحان دیا ہی تھا کہ اس کی شادی کر دی گئی تھی۔ کیوں کہ عشق کے چکر میں وہ کسی کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح گر پڑی۔۔۔ اس کی زندگی میں آنے والا لڑکا اس کا ہم عمر تھا۔۔۔ کئی دنوں تک وہ اس سے کھلونے کی طرح کھیل کر جی بہلاتا رہا اور وہ بھی اس سے بڑی خود سپردگی سے پیش آتی۔ پھر ایک دن اس لڑکے کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی سیاہ کاری کا نتیجہ برآمد ہوا تو اس کی خیر نہ ہوگی۔ وہ ایک دن گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ اتفاق سے چار دن بعد اس کا رشتہ آیا تو شادی کر دی گئی۔ مگر اس کی اپنے شوہر سے نہ بنی۔۔۔ کیوں کہ سات برسوں میں وہ اسے اولاد نہ دے سکی تھی۔

غیرت مند ہوتی تو سسرال کے طعنے سن کر خودکشی کر لیتی۔۔۔ حالانکہ وہ شادی کے دو برس بعد امید سے نہ ہوئی تو اس نے اولاد کے لیے شوہر کی آنکھوں میں خوب دھول جھونکا۔ نوجوان لڑکوں سے جو اس سے عمر میں دو برس چھوٹے اور تین چار برس بڑے تھے۔ ان سے محبت کا ڈراما رچا کے انہیں ہر طرح سے خوش کرتی رہی۔۔۔ لڑکے بے خوف ہو کر اس سے دل بستگی کرتے تھے کہ اولاد ہوئی تو ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔۔۔ کلدیپ کور اتنی حسین، پرکشش اور ہیجان خیز نشیب و فراز کی حامل تھی کہ لڑکوں کے پیر پھسل جاتے۔ اس کے باوجود ساس اور شوہر کے طعنوں نے جینا حرام کر دیا تو وہ باپ کے گھر لوٹ آئی۔ کہہ دیا کہ وہ اب بھی کسی قیمت پر سسرال نہیں جائے گی۔

اس کے شوہر نے قانون کی مدد لی اور دوسری شادی کی اجازت مانگی۔۔۔ کنور وجے سنگھ کو مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی تو انہوں نے داماد کو مصالحت کے لیے بلایا۔ وہ بے خوف و خطر اپنی کار میں آیا اور اس نے وجے سنگھ کو صاف صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ وہ مجبور ہے۔۔۔ اس نے سات برسوں میں کلدیپ کور کو ولایت لے جا کر ڈاکٹروں کے زیر علاج بھی رکھا۔۔۔ اس کے دقیانوسی ماں باپ نے دربار صاحب دان پن سے لے کرشت سادھوؤں کی سیوا تک سب کر کے دیکھ لیا تھا۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ تھی کہ کلدیپ کور پیدائشی بانجھ ہے۔۔۔ کوئی علاج اور آپریشن اسے ماں نہیں بنا سکتا۔۔۔ سائنس نے بھگوان سے شکست مان لی تھی۔ وہ بے بس ہو گئی تھی۔

شادی آدمی اپنی نسل کا نام چلانے کے لیے کرتا ہے۔ صرف عورت اور اس کے جسم سے کھیلنے اور جذبات کی تسکین کے لیے نہیں۔۔۔ اس نے

کلدیپ کور کو بھی قائل کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ ضدی عورت معاملے کو خاموشی سے ختم کر دینے کے بجائے بڑھانے پر تل گئی تھی۔ ایک طرف تو وہ کہتی تھی کہ میں فلاں کی بیٹی ہوں۔۔۔ یہ کر دوں گی۔۔۔ وہ کر دوں گی لیکن وہ یہاں جو گل کھلا رہی تھی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سسرال میں رہ کر وہ جذبات کے تجربات سے گزرتی رہے۔۔۔ اس کے شوہر نے کہا تھا کہ زمانہ واقعی بہت بدل گیا ہے۔۔۔ کلدیپ کور کا شوہر بہت دولت مند تھا اور ٹھیکہ دار تھا۔ لیکن پڑھا لکھا اور معقول آدمی تھا۔ اس نے وجے سنگھ کو قائل کر لیا تھا کہ اس کی مجبوری جائز ہے اور وجے سنگھ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مقدمہ واپس لے لے تو کلدیپ کور اسے خود چھوڑ دے گی۔ کلدیپ کور نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ دنیا یہ نہ کہے کہ کلدیپ کور کو طلاق دی گئی ہے۔ دنیا یہ نہ کہے کہ اس نے شوہر سے طلاق لی ہے۔۔۔ اس کے شوہر نے طلاق کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تیسرے دن اس نے مقدمہ واپس لے لیا جس کا علم اس کے وکیل کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ اس کے خاندان والوں نے بھی کسی سے نہیں کہا تھا۔ کیوں کہ وہ کنور وجے سنگھ کے خاندان کو بدنام کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وکیل نے بہت کہا اور سمجھایا بھی تھا کہ ریاست ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے قوانین اور حاکمیت بھی دفن ہو گئی ہے۔ اب اس ملک کا قانون رائج ہے جس میں سب برابر ہیں۔ اگر انہوں نے کہا تھا کہ ایک قانونی کارروائی ناگزیر ہے مگر تشہیر قطعی ہونا نہیں چاہیے۔ مجسٹریٹ ان کے گھر جا کر بیان لے سکتا ہے اور اپنے فیصلے کی نقل دے سکتا ہے۔ عزت دار گھروں کی عزت پردے میں رہے تو اچھا ہے۔

مگر مقدمہ واپس لینے کے بعد۔۔۔ یعنی پورے سات دن بعد۔۔۔ وہ ایک ویران سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ سرخ رنگ کی فاکس ویگن سے کلدیپ کور نے نشانہ لیا اور اسے گولی مار دی۔ عینی شاہد کوئی نہ تھا۔ واقعات کی شہادت اس لیے مسترد ہو گئی کہ واردات کے وقت کلدیپ کور اور وجے سنگھ کے خاندان کے تمام افراد اپنی حویلی میں موجود تھے اور اس بات کے عینی گواہ بہت تھے۔

انہوں نے گرنتھ صاحب پر ہاتھ رکھ کے کہا تھا کہ ان کی بیٹی کا شوہر سے کوئی تنازعہ نہ تھا اور جب قتل کی واردات ہوئی تو گھر کے تمام افراد کھانے کی میز پر موجود تھے۔۔۔ وکیل جس نے دوسری شادی کا مقدمہ دائر کیا تھا واپس لے لیا۔ بھول گیا کہ حالات بدل گئے ہیں۔ اپنے موکل کی موت کے بعد اسے زبان کھولنے کا انجام اسے اپنی موت کی صورت میں نظر آنے لگا تھا۔ وہ مجسٹریٹ بھی خاموش رہا جس کی عدالت میں مقتول کا دعوا تھا سماعت کے لیے پیش ہونے سے قبل ہی ختم ہو گیا تھا۔

اس واقعے نے کنور وجے سنگھ کی ساکھ بگاڑ دی لیکن ان کی طاقت کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ احساس عام ہو گیا تھا کہ کوئی وجے سنگھ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کسی نے ان کی طرف شک اور میلی نظر سے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔

کلدیپ کور اب چھتیس برس کی بھرپور عورت تھی جس کے بدن میں ایک عجیب سا گداز اور رسیلا پن تھا۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ جو مرد اسے دیکھتے ان کا دل گرما جاتا۔۔۔ لڑکیوں کا حسن، جسم کی شادابیاں اور کشش ماند پڑ جاتی۔ اب اس میں ادھورا پن نہیں رہا تھا۔ وہ جیسے روز بروز جوان ہوتی جا رہی تھی اور دوشیزہ سی لگتی تھی۔ ایک عجیب سا نکھار اور شادابی نے اس میں بڑی جاذبیت سما دی تھی۔

اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور دل کش عورت جو اپنی ماں کا نقش ثانی جو اس لیے بہتر تھا کہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی اور اس کے حسن کا نکھار زمین سے زیادہ ماحول کا ساز گار اور موسم سے قائم تھا۔ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے اس کے خون میں کنور وجے سنگھ کی جھلک بہت نمایاں تھی۔۔۔ چنانچہ وہ ایک خطرناک عورت تھی۔۔۔ جو اپنے حسن کی قوت تسخیر سے کام لینا بھی جانتی تھی اور

اپنی ذہانت سے بھی۔۔۔ اس نے اب بھی شکاری کھیل جاری رکھا ہوا تھا جو اس کے حسن وشباب اور نم کو جلا بخش رہا تھا۔۔۔ کیا مجال اس کے قریب کا کوئی سیاسی لب کشائی کر دے۔ وہ تو انہیں ایسا دیوانہ بنا دیتی تھی کہ وہ اس کے اسیر اور کٹھ پتلی بن کے رہ جاتے۔

وہ گھوڑے پر اکیلی میلوں گھوم آتی تھی۔۔۔ مگر سب جانتے تھے کہ اس کے شکاری لباس میں بھرا ہوا ریوالور بھی رہتا ہے۔ اتنی ہمت کسی میں نہ تھی کہ اس شیرنی کی طرف انگلی بھی اٹھ سکے۔۔۔ یہ بات صرف دو ایک ہی جانتے تھے کہ وہ جو اکیلی میلوں نکل جاتی ہے گھوڑے پر وہاں اس کا کوئی منتظر ہوتا ہے۔ وہاں ایک کوٹھری بھی ہے جس میں نہایت صاف ستھرا اور آرام دہ بستر موجود ہے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ اس کی جوان تنہائی کا دوست سپاٹ صحرا نہیں ہے۔۔۔ اس صحرا میں کس کس نے گل کھلائے ہیں۔۔۔ اگر یہ بات زبان پر لانے اور کسی کو ہم راز بنانے سے پہلے تیج پور کے چوک میں نصب مجسمہ انہیں خبردار کر دیتا تھا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میزان عدل میرے ہاتھ میں ہے۔

کنور وجے سنگھ کی دوسری بیٹی اپنے بھائی کی طرح تھی۔ دولت کی فراوانی سے تن آسانی اور بے فکری اسے ورثے میں ملی تھی۔

وہ روشن خیالی میں سب سے آگے نکل گئی تھی۔ کنور وجے سنگھ کا خیال تھا کہ اسے کرائسٹ کالج کی تعلیم نے ڈبو دیا جہاں بگڑے ہوئے رئیس زادے کم نہ تھے۔ اب وہ کچھ نہیں کرتی تھی اور نہ ہی کچھ سوچتی تھی۔۔۔ اور نہ ہی کچھ سوچنا بھی چاہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ غلط وقت پر غلط جگہ پیدا ہوگئی تھی جس کے باعث معاشرے کی اور خاندان کی تمام رسوم وقیود کی پابندی کرنے اور اخلاقی اقدار کھوکھلا ہونے کے باوجود قابل احترام سمجھنے پر مجبور تھی۔ اس عدم توازن نے سرجیت عرف سرجو کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اس کی حرکتوں سے، اس کی باتیں سن کر کنور وجے سنگھ ششدر رہ جاتے تھے۔ ”تو تو بالکل پاگل ہے سرجو!“

یہ بات اس کی ماں کے بعد خود وجے سنگھ کا تکیہ کلام بنا۔۔۔ پھر بڑی بہن نے حویلی میں وہی حیثیت حاصل کر لی جو ماں کی تھی تو کلدیپ کور بھی یہ بات کہنے لگی۔۔۔ سرجو نے کبھی اس کی بات کا برا نہیں مانا۔۔۔ وہ ہنستی تھی اور اپنے حال میں مست تھی۔۔۔ اور پھر وہ ماضی کے دریچے کھول کر کالج پہنچ جاتی جہاں اس کے ہم جماعت کتنے جذباتی اور بے باک تھے۔ ایک رنگین دنیا کے لمحات اور گھڑیاں اور دن نہیں بھولے تھے۔ وہ ان ہم جماعتوں کو بھولی تھی اور نہ ان کی عاشقی جو اسے آج سرمایہ لگتے تھے۔“

تیسری بیٹی شیاما جو حسن و رعنائی ہی میں زیادہ نہیں تھی طاقت میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔۔۔ مگر اس کا اصل سرمایہ، اثاثہ سیرت کا وہ حسن تھا جو کسی کے حصے میں نہ آیا تھا۔ تعلیم نے اسے بگاڑا نہیں تھا بلکہ سنوار دیا تھا اور دولت نے اس کے مزاج میں غرور نہیں تشکر کے جذبے کی پرورش پائی تھی۔ اس کا دل شیشے کا مثلثی منشور تھا جس میں سے محبت کے سات رنگ ایک جذبے کا اجالا بن کے بھی نظر آتے تھے اور الگ الگ بھی۔

اسے سب سے عشق تھا۔ پھولوں سے اور تتلیوں کے رنگ سے۔۔۔ خوشبو سے، نغمہ ساز سے۔۔۔ زندگی اور زندہ انسانوں سے جو بہرور تھے جو اپنی طرف عمر کو آنے والوں کے لیے ایک زیادہ حسین، زیادہ پر آسائش اور زیادہ قابل قدر دنیا بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ شیاما کو اپنے شرابی۔۔۔ ظالم باپ سے بھی پیار تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ شیاما کو نفرت کرنا آتا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اب مجسمے کے گرد ایک حلقہ بنائے وہ سب کھڑے تھے جو ادھر سے گزرے تھے یا جن کو دوسروں سے چوک میں ہونے والے سنسنی خیز تماشے کی خبر مل گئی تھی۔ آہستہ آہستہ مجمع بڑھ رہا تھا مگر تھانے

کا قائم مقام نگران بن جانے والا حوال دار اپنے افسر اعلا کو متعلق دیکھنے والوں کو درّے مار کر بھگانے سے قاصر تھا۔ اس نے کسی کو قریب آنے نہیں دیا تھا اور تجسس میں مبتلا ہو کے سوال کی جرات کرنے والے کو بری طرح جھڑک دیا تھا اور پھر تجسس میں مبتلا ہو کے کسی کو سوال کرنے کی جرات پیدا نہیں ہوئی۔

تھانے دار کی لاش اُسی طرح مجسمے کے بازو سے جھول رہی تھی اور پلک جھپکائے بغیر انصاف کے ترازو کو دیکھ رہی تھی۔ قصبے کے سرکردہ افراد یعنی اسکول ماسٹر اور اسپتال کے نوآموز ڈاکٹر نے حوالدار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ روشن کو نیچے اتارے۔ اس دہشت ناک منظر کو بچوں اور عورتوں نے دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔۔۔ مگر حوال دار نے واضح کر دیا تھا کہ اچھائی برائی سے زیادہ اسے قانون کے تقاضے پورے کرنے کا خیال ہے اور اس کے اختیارات محدود ہیں۔ اس نے اطلاع دی ہے اور چوں کہ معاملہ ایک پولیس افسر کی پراسراریت کا ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ ضلع سے کوئی بڑا افسر یا تو ایس پی صاحب آ جائیں۔ ان کے آنے تک وہ نہ تو کسی چیز کو ہاتھ لگائے گا اور نہ کسی کو قریب آ کے دخل درمعقولات کرنے دے گا۔ وہ تو مجسمے کے چاروں طرف کھلے پھولوں کی کیاریوں سے بھی دور تھا کہ زمین کا نقش قدم ہو تو نہ بگڑے۔

ساکت و صامت مجمع بڑی مستقل مزاجی سے منہ اٹھائے کھڑا تھا اور اب اس میں لڑکیاں، عورتیں بھی شامل ہو گئیں تھیں۔ دہشت زدہ ہو کر، چیخ مارتے یا بے ہوش ہو کر گرنے کے بجائے عورتوں نے واجبی سی ہائے رام، ہائے ایشور اور یا اللہ پر اکتفا کیا تھا۔ بچے سخت متعجب تھے اور لاش کی ظاہری حالت کے تغیر پر سرگوشیوں میں تبصرہ کر رہے تھے۔ حیات بعد از موت۔۔۔ روح اور زیست کے مسائل پر اپنی عقل اور روایات کے مطابق بحث کر رہے تھے سوال جو صورت حال کو سمجھنے کا دعوا رکھنے والوں کو صورت پر تحریری اور اس کا جواب بھی ایک ہی ہو سکتا تھا مگر مصلحت کا تقاضا ان کے لبوں پر سکوت بن گیا تھا۔

گھوڑے کی ٹاپیں سن کر بیک وقت سارے سر گھوم گئے۔ معمول کے مطابق شب سواری کے لیے نکلنے کے لیے کلدیپ کور نے اپنے سفید کبوتر، چیتے صبا رفتار گھوڑے کو اپنے دادا کی سمادھی کے قریب روکا۔ اور پھر کچھ دیر اس لاش کو دیکھتی رہی جس کی بدہیتی نے مجسمے کے وقار اور حسن کو بری طرح مجروح کیا تھا۔ مجمع خود بخود سمٹ گیا تھا کلدیپ کے لیے، عین اپنے جدامجد کے چرنوں تک راستہ صاف ہو چکا تھا۔ وہ متکبرانہ انداز سے گھوڑے پر سوار تھی۔ وہ خاکی پتلون پر لمبے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک آنے والے چرمی موزے چڑھائے اور ان کی شرٹ پہنے اور سر پر کیپ رکھے بالکل مرد لگتی تھی۔ اس کے تر و تازہ رخساروں کا گلابی رنگ دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھوں کی سحر آفرینی کو کاجل نے دو چند کر دیا تھا۔ بدن کے قوس و خم اس لباس میں اپنی دل آویزی کی خبر دیتی تھی۔ اس پر ایک عجیب سی سرشاری طاری تھی۔ گزرے لمحات کا فسانہ اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ اسے سرفراز کر کے آئی تھی جس پر اس کا دل آیا ہوا تھا۔ اس کا ثبوت اس کے ایک رخسار میں سرخ ابھرا ہوا نشان جیسے مچھر نے کاٹا ہو۔ شاید اس نے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور بس دیکھ ہی تو سکتے تھے اور لباس کی شکنیں اور بے ترتیبی۔ لب کشائی کی آئینے کے سوا کس میں جرات تھی۔

اس نے ایک ادائے ناز سے کیپ اتاری۔ ایک جانثار نے گھوڑے کی لگام تھام لی تھی۔ وہ ایک جست میں نیچے اتری تو بدن میں ایک لہر سی اٹھی جس نے بدن کے تشیب و فراز اور خم نمایاں کر دیے اور اس کے شانوں تک کٹے ہوئے اور ہائیڈروجن پر آکسائڈ سے سنہرے شیڈ سے کٹے ہوئے سنہرے تاروں جیسے بال پھسل کر چہرے کے گرد ہالہ بنانے لگے۔ مجمع دم بخود دیکھتا رہا۔ کلدیپ متوازن قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔

...والدار ...!'' اس نے اپنی نرم اور شیریں ... سے کہا۔ ''یہاں یہ کیا تماشا ہو رہا

...صاحب کا دیہانت ہو گیا۔ اس لیے لوگ جمع ...والدار نے تماشے کے لفظ پر ناگواری کے ...ل کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے بڑے ضبط سے ...ا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں ۔۔۔ سوال یہ ... کہ دیہانت یہاں کیوں ہوا ۔۔۔؟'' کلدیپ ... چھڑی سے اشارہ کیا۔

حوالدار کی سمجھ میں نہ آیا کہ تفتیش مکمل ہونے ... پہلے اس کا کیا جواب دے ۔۔۔ جواب دے بھی تو ...یا دے۔

''اگر اسے مرنا یہاں ہی تھا تو چلو اس کا شوق پورا ہوا'' کلدیپ نے کہا۔ ''اسے ابھی تک کیوں لٹکائے کھڑے ہو۔ کیا اس منظر کو کسی فلم کی شوٹنگ میں استعمال ہونا ہے۔'' کلدیپ نے تمسخر سے کہا۔

''جی ۔۔۔ جی نہیں ۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' حوالدار نے کہا۔ ''یہ وہ ۔۔۔ دراصل احکامات نہیں۔''

''اچھا تو میں حکم دیتی ہوں کہ اس لاش کو فوراً یہاں سے ہٹا دو۔'' کلدیپ کور نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔'' حوالدار نے مجمع کے سامنے اپنا وقار بحال کرنے کی کوشش کی اور سنبھل کر کہا۔ ''تفتیش کے لیے اعلا افسران آنے والے ہیں۔ میں ان کے حکم کے بغیر اس لاش کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

کلدیپ کور نے سر ہلایا اور وقار سے آگے بڑھی۔ عین لاش کے قریب پہنچ کر اس نے تین زینے طے کیے اور تین فٹ اونچے چبوترے پر جا کھڑی۔ پھر اس نے اچانک جیب سے کرپان نکالی اور اس نے ایک ہی وار سے رسی کاٹ دی۔ تھانے دار کا بے جان جسم دو فٹ نیچے چبوترے پر گرا اور زینوں سے لڑھک کے پھولوں کی کیاری میں جا کر رک گیا۔

''اٹھا لو اسے ۔۔۔'' کلدیپ کور نے مجمع سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ انداز نفرت اور حقارت سے بھرا ہوا تھا۔ ''تھانے پہنچاؤ اور میری نظروں کے سامنے سے جلد سے جلد دفع کرو۔''

حوالدار ابھی تک غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اسے بڑے جبر اور تحمل سے کام لینا تھا۔

مرد کیا اس عورت کی جگہ کوئی عام عورت بھی ہوتی تو وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا مزا چکھا دیتا۔

مگر کلدیپ کے بارے میں اس کی معلومات اس کی فرض شناسی کی راہ میں حائل ہو گئی تھیں۔

کلدیپ کا حکم جیسے فرمان شاہی تھا۔ بیک وقت دس پندرہ جوان مرد تیزی سے زرخرید غلاموں کی طرح آگے بڑھ آئے تھے جیسے حکم کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں ان کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔

حوالدار بھی آگے بڑھا جو ان جوان مردوں کے پیچھے تھا۔ کلدیپ نے اس کا راستہ اپنی چھڑی سے روک دیا۔

''یہ میرے دادا کی سمادھی ہے ۔۔۔ سرکار کا پھانسی گھر نہیں ہے ۔۔۔ خودکشی کرنے والے کو بھی ہماری اجازت لے کر یہاں مرنا چاہیے ۔۔۔ اور تمہیں ہماری ذاتی جاگیر پر قدم رکھنے سے پہلے مجھے ۔۔۔ یا میرے پتاجی کنور وجے سنگھ کو مطلع کرنا چاہیے تھا ۔۔۔ یہ جگہ میرے گھر کی طرح ہے اور یہاں سے میں کسی لاش کو باہر پھینک دوں یا تمہیں دوں۔ قانون کے سامنے اس کی جواب دہی میں کروں گی۔''

کلدیپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اس کے سینے میں چوں کہ سانسوں کا زیروبم ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس نے سانس پر قابو پانے کے لیے توقف کیا تھا۔ پھر بولی۔

''اپنے اعلا افسران سے کہو کہ جو تفتیش کرنی ہو

تھانے میں کریں۔۔۔ کنور وجے سنگھ کی پرائیوٹ پراپرٹی پر بلا اجازت قدم رکھ کر تم خود بھی تو ایک جرم کا ارتکاب کر ہی چکے ہو۔ اپنی افسروں کو اچھی طرح سے سمجھا دینا کہ وہ یہ غلطی ہرگز نہ کریں۔''

اس کی نفرت، حقارت اور غصے میں کمی آنے کے بجائے بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے سانسوں کے تلاطم پر وہ پوری طرح قابو نہ پا سکی تھی۔ یہ نظارہ لوگوں کے لیے بڑا ہیجان خیز تھا۔ جو اس سے محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ چور نظروں سے دیکھتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے کہ اگر اس عورت نے ان کی نظر بازی کو محسوس کر لیا تو وہ ان کے کھال ادھیڑ دے گی۔ پھر وہ نظریں ہٹا کر لاش کو دیکھنے کے بہانے باز نہیں آ رہے تھے۔

قصبے کے لوگوں نے تھانے دار کی لاش کو کسی مردہ کتے کی لاش کی طرح دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں سے پکڑ کے اٹھا لیا تھا۔ ایک شخص نیچے لٹکتے ہوئے سر کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا کمر کے نیچے سے لاش کو اٹھا رہا تھا۔

اب دس پندرہ کے بجائے جلوس میں پچاس ساٹھ افراد شامل ہو چکے تھے اور یہ جلوس تھانے کی طرف چل پڑا تھا۔

''حوالدار۔'' کلدیپ نے زیرِ لب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ ''تم نے وہ عبارت دیکھی جو لاش پر چسپاں تھی اور نمایاں تھی۔''

''جی۔۔۔'' حوالدار نے تلخ لہجے میں کہا۔ قوت برداشت کا مسلسل مظاہرہ اس کے اعصاب کو متاثر کر رہا تھا۔ ''اس کاغذ پر لکھا تھا کہ یہ ہے دخل در معقولات کا نتیجہ۔''

کلدیپ ہنسی جو بڑی زہریلی تھی۔ اس کا گداز پرشباب بدن شاخ گل کی طرح لچک کر سیدھا ہو گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ وہ سرخ رنگ کیا تھا۔۔۔؟''

''لپ اسٹک جناب!'' حوالدار نے طنز سے کہا۔ ''آپ نے تو پہچان لیا ہوگا۔ دور سے ہی۔۔۔ بالکل ہی الگ تھا۔''

''ہاں۔۔۔ میں تو لپ اسٹک استعمال نہیں کرتی۔'' کلدیپ نے اپنے گداز، گلابی اور رسیلے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''یہ کسی لپ اسٹک کے نشان نہیں ہیں۔ مگر میں پہچان گئی تھی۔''

پھر وہ مالی کی طرف متوجہ ہو گئی جو ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے لاش کے گرنے سے خراب ہونے والے پھولوں کو ٹھیک کرنے کی ہدایت دینے لگی۔ حوالدار اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے کیاری میں قدم تک نہیں رکھا تھا کہ کسی کا نقش پا نہ مٹے۔

انگلیوں کے نشانات اور دوسرے سراغ بچانے کے لیے اس نے لاش کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس لیے کہ کارروائی کر سکے۔ اور یہ عورت کتنے طمطراق سے قانونی تقاضوں کی ایسی تیسی کر رہی تھی۔ شاید افسران اعلا اس کی ایسی تیسی کر سکیں۔

وہ ان لوگوں کے سامنے کسی پٹے ہوئے مہرے کی طرح رخصت ہونا نہیں چاہتا تھا یہ سبکی تھی۔ تذلیل اور توہین تھی۔ اس کی نہیں بلکہ قانون کی جواب دور کھڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے۔

لیکن کلدیپ کور ایک اور جان نثار کے ہاتھ پر قدم جما کے گھوڑے پر سوار ہو گئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر گھوڑے کو پوری رفتار سے دوڑاتی ہوئی جنگل میں اس طرح غائب ہو گئی جیسے کوئی آشنا اس کا بے تابی سے منتظر ہو۔ اب حوالدار کے لیے لاش لے جانے والے جلوس کے پیچھے جانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ بلا نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے تیج نگر کے اسٹیشن پر اس طرح سے رکی جیسے اسے سانس لینا ہو۔ جیسے یہ رسمی کارروائی ہو۔ اس کے چھوٹے سے مگر خوب صورت پلیٹ فارم پر اترنے والا فرد سر پر بوری رکھ کے ریلوے لائن عبور کر چکا تھا اور جنگل کے بائیں ہاتھ پر پھیلے ہوئے کھیتوں کے درمیان

...ڈیوں اور پگڈنڈیوں پر قدم رکھتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ ٹرین نے آخری وسل دی اور موڑ کاٹ کے پہاڑ کے پیچھے غائب ہوگئی تو فضا میں اس کی چھک چھک کا شور بھی نہ رہا۔ دور ایک سیاہ دھوئیں کا مرغولہ گہرے سیاہ بادل کی طرح رہ گیا جو آسمان کی طرف کسی آندھی کی طرح اٹھ رہا تھا۔

اسٹیشن کی انتظامیہ ایک فرد پر مشتمل تھی جو۔۔۔ لائن مین۔۔۔ بکنگ کلرک۔۔۔ ٹکٹ چیکر اور اسٹیشن ماسٹر کے تمام فرائض ایک تنخواہ بطریق احسن پورے کر رہا تھا۔

''دیکھیے۔۔۔ مجھے تیج پور جانا ہے۔'' ونود نے سلاخوں والی کھڑکی کے نیچے والے شگاف کے سامنے منہ لے جا کر کہا۔

''ضرور جائیے سرکار عالی! یہاں کسی ویزے، این او سی۔۔۔ پرمٹ اور اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے خوش طبعی سے جواب دے کر قدرے اس لیے دیکھا کہ تیج پور جانے والے اس سے اجازت نہیں لیتے تھے۔ یہ مودبانہ انداز تخاطب کچھ تو اس معزز اجنبی کی شخصیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھی اور خوش مزاجی کچھ اسٹیشن ماسٹر کی عادت تھی۔ وہ کیا کرے۔ اس طرح اپنی بوریت بھی دور کرتا تھا۔

''غالباً آپ ہی کے انتظار میں ایک گاڑی باہر موجود ہے۔'' اسٹیشن ماسٹر نے اس مرتبہ سنجیدگی سے کہا۔

''کیا سرکاری گاڑی ہے۔۔۔؟'' ونود نے حیرانی سے کہا۔

''سرکاری تو نہیں ہے۔۔۔ البتہ سرکار کی گاڑی ہے۔ کنور وجے سنگھ کی۔'' اسٹیشن ماسٹر نے اسے بتایا۔ ونود باہر نکلا تو اسے شان دار بیوک نظر آئی۔ جس کا ایک ایک حصہ صاف و شفاف شیشے کی طرح دمک رہا تھا اور پرانی ہونے کے باوجود اس کے رنگ و روپ پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس پر کسی نئی نویلی دلہن کا سا دھوکا ہوتا تھا۔

سفید پتلون، شرٹ اور سفید پگڑی کے ساتھ میچ کرتی ہوئی سفید لمبی لمبی مونچھیں لیے ایک شوفر مودب کھڑا تھا۔ اس نے ونود کو دیکھتے سر خم کیا اور ہاتھ لہرا کے تشریف لائیے کا سگنل دیا۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ میں اس گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔'' ونود نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کنور صاحب نے حضور۔''۔۔۔ شوفر نے جواب دیا۔

پھر وہ مودبانہ انداز سے دروازہ کھولے منتظر تھا کہ ونود بیٹھ جائے دروازہ بند کردے۔

ونود تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ شوفر سے یہ سوال کرنا بے معنی تھا کہ کنور صاحب کو یہ اطلاع کیسے ملی۔

اگر اسٹیشن پر کوئی تانگہ، یکہ یا سائیکل رکشا ملتا تو وہ اس مہمان نوازی کے بجائے احسان مند کرنے کی پیش کش کو مسترد کر دیتا۔ دور دور تک کسی کوئی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ بیل گاڑی بھی دکھائی نہیں دی۔

وہ خصوصاً کنور وجے سنگھ کی خاندانی تاریخ۔۔۔ ان کی خاندانی روایات۔۔۔ عادت و اطوار۔۔۔ مزاج اور فطرت سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لینے کے بعد۔۔۔ مگر اب اسے کسی نہ کسی طرح تیج پور تو پہنچنا ہی تھا جو اس کی اطلاعات کے مطابق تین میل تک جنگل سے گزرنے والی سڑک پر ناک کی سیدھ میں چلنے کے بعد آتا تھا۔

وجے سنگھ کی بیٹی کلدیپ نے اس سڑک پر اپنے شوہر کو کتے کی موت ماری تھی اور اس کی لاکھوں کی جائیداد قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اس کی قانونی وارث تھی۔ وہ چالاک عورت تھی بلکہ بے حد خطرناک کسی ڈائن کی طرح۔۔۔ اور پھر اس کے قصے بھی سنے تھے کہ وہ نوجوان لڑکوں کے ساتھ موج اڑاتی ہے اور اس نے جنگل میں کسی ایسی جگہ عشرت کدہ بنا رکھا ہے جو ہر کسی کے علم میں نہیں ہے۔ صرف وہی جانتے ہیں جو اسے سرفراز کرتے

ہیں۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کسی وجہ کے بغیر بھاری سوٹ کیس اٹھائے دھوپ میں کھڑا اس شوفر کی نظر میں تماشا بن رہا ہے جو شاید شام تک اس طرح دروازہ پکڑے منجمد رہتا مگر دوسری بار یاد دہانی کی گستاخی نہ کرتا۔ کار کے پیچھے والے شیشوں پر سبز پردے تھے۔ ونود نے دھوپ کی چکا چوند سے بچنے کے لیے اور کچھ فراغت سے پاؤں پھیلا کر دراز ہونے کے خیال سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بند کرلیا۔

''سوٹ کیس ڈگی میں رکھ دو۔'' اس نے کہا۔

یہ احساس اسے سیٹ پر اپنے آپ کو گرانے کے بعد ہوا کہ وہ صرف پیچھے اکیلا نہیں ہے۔ وہ ایک لڑکی پر گرتے گرتے رہ گیا تھا۔ اب وہ اس سے چند انچ دور بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دمک اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' ونود نے سنبھل کے کہا۔

پھر اس نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اندر کی طرف دروازہ کھولنے کے لیے کوئی ہینڈل نہ تھا۔ دروازہ باہر سے صرف خادم کھولتے تھے۔

''بیٹھے رہیے۔ اب بیٹھے رہیے۔''

اس بے حد حسین اور خاصی تعلیم یافتہ نظر آنے والی لڑکی نے ساڑی کا پلو سنبھال کے کہا جو اس کے ریشمی بالوں پر سے ہی نہیں بلکہ شانے پر سے بھی پھسل گیا تھا۔

ونود نے جدید وضع کے بلاؤز کا گلا ایک بار دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ اس کے سارے جسم پر ایک میٹھی سی سنسنی دوڑ گئی۔

''میرا نام شیاما ہے۔ میں کنور وجے سنگھ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں اور مجھے بطور خاص آپ کے استقبال کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' کانونٹ کے لہجے نے وجود کو مزید حیران کر دیا تھا۔ حیرانی اس کے چہرے اور آنکھوں میں پھیل گئی تھی۔

''بطور خاص صرف آپ ہی کو کیوں۔۔۔''

ونود نے آرام سے بیٹھتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

شوفر نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ ہوک ہلکی سی سرسراہٹ کے بعد ہوا کے دوش پر تیرنے لگی۔ ان کے اور شوفر کے درمیان شیشے کی دیوار تھی جس کے دریچے کو شیشہ سرکا کر اتنا کھولا جا سکتا تھا کہ شوفر کو ہدایات دی جا سکیں۔ مگر بند ہو تو مالکوں کی بات کو سن نہ سکے۔

''اس کے متعدد اسباب ہیں۔'' شیاما مسکرائی تو اس کے گداز، سرخ اور رسیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر کے بکھر گئی۔ ''دیدی کسی کو اس لائق نہیں سمجھتیں۔۔۔ رہے بھیا، وہ بڑے غیر ذمے دار ہیں۔ منجھلی دیدی اس لائق نہیں۔۔۔ پتاجی معذور ہیں۔۔۔ لے دے کے میں رہ جاتی ہوں اس قابل۔۔۔ یہ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنے کی بات نہیں۔۔۔ یہ دوسروں کی رائے ہے۔ آپ اتفاق نہ کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔''

شیاما کی آواز بھی اس کی طرح خوب صورت تھی جو کسی سُر کی طرح گاڑی کے خواب ناک ماحول میں لہرائی تھی۔

ونود بے ساختہ ہنسا۔ وہ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

''اب اختلاف کی گنجائش بھی کہاں رہی ہے۔ لیکن یہ بات اب تک میں نہیں سمجھا کہ آپ کو یا کسی اور کو میرے اشتیاق کے لیے آنے کی کیا ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ کیا یہ تکلیف اور غیر ضروری نہیں تھا۔''

''دیکھیے۔۔۔ بات یہ ہے کہ ایک تو ہم لوگ بڑے روایتی اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ یہاں جو بھی آتا ہے وی آئی پی قسم کا آدمی ہوتا ہے۔ کنور صاحب کا مہمان ہوتا ہے۔'' شیاما نے کہا۔ ''شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں ہے۔''

''میں تھانے میں ٹھہر سکتا تھا۔ اس میں اس کی گنجائش ہے۔'' ونود نے جواب دیا۔ ''ڈاک بنگلہ

رہائش میرے لیے مسئلہ نہیں ہے اس لیے کہ میں اکیلا مرد آدمی ہوں۔"

"ڈاک بنگلہ تحصیل میں ہے۔" شیاما بولی۔ "تھانے میں صرف حوالدار رہتا ہے جو خود پکاتا کھاتا اور صفائی بھی کرتا ہے۔ آپ کا اس جیسے ماتحت پر بوجھ بننا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ نمبر دو یہ کہ آپ جس قتل کی تفتیش کے لیے آئے ہیں۔۔۔"

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیوں آیا ہوں۔۔۔" ونود نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "گویا پل پل کی خبر ہے۔۔۔ کیا آپ کے پاس کوئی سراغ رساں بھی موجود ہے۔۔۔؟"

"جی ہاں۔۔۔" وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی جل ترنگ کی طرح بج اٹھی تھی۔ "کوئی سراغ ہے نا جاسوس۔۔۔ تحصیل سے یا ضلع کچہری سے۔۔۔ کسی نے پاپا کو فون کر دیا ہوگا۔۔۔" شیاما بولی۔

"مجسٹریٹ صاحب۔۔۔ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر اور ڈی ایس پی وغیرہ بھی آتے رہتے ہیں جو پاپا کے بڑے دوست ہیں۔ وہ میری سالگرہ میں بھی آئے تھے۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ روابط صرف رسمی نہیں ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ پہلے شکار کھیلنے بھی آ چکے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا" ونود نے بات کو سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ اس خاندان کے اثر و رسوخ کے بارے میں کہی ہوئی باتیں غلط نہیں تھیں۔ "اس کے علاوہ بھی کوئی خاص وجہ ہوگی۔"

"جی ہاں۔۔۔" شیاما نے اثباتی انداز میں اپنا خوش نما سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نمبر تین یہ کہ تیج پور میں کسی اور سے ملنے اور ہمارے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے پہلے ہم خود آپ سے ملنا چاہتے تھے۔" شیاما نے توقف کر کے شانے اور سینے سے پھسلتا ہوا پلو سنبھالا۔ پل کی تاخیر ہوتی تو ونود کو دوبارہ نظارہ محظوظ کر دیتا۔۔۔ وہ یہ سمجھتا کہ شیاما نے غیر محسوس انداز سے یہ حرکت کی ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ گاڑی جو کسی موڑ پر تیزی سے گھومی تھی جس سے شیاما کے بدن نے جھٹکا سا لیا تھا۔ اگر دانستہ یہ حرکت ہوتی تو وہ بجلی کی سرعت سے پلو نہ سنبھالتی بلکہ اسے گود میں گرنے دیتیں۔ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اگر آپ حوالدار سے پہلے ملتے تو وہ اپنی کہتا جو کسی بھی لحاظ سے مناسب اور موزوں نہ ہوتی اور ہمارے خلاف ایک غلط تاثر پیدا ہوتا۔۔۔ جاہل اور غریب لوگ ہیں مگر وہ دل کے برے نہیں۔ سیدھے سادے۔۔۔ مگر ہمارے اور ان کے رہن سہن اور انداز فکر میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ ان میں علم کی کمی اور صلاحیت ہے۔ آپ سمجھ گئے نا۔۔۔ ہم حاکم ہیں یا تھے۔۔۔ وہ محکوم۔۔۔ وہ اس گاؤں سے آگے تحصیل تک ہو آتے ہیں اور کچھ لوگ ضلعے کے صدر مقام تک بھی نہیں گئے ہیں جسے یہ لوگ شہر کہتے ہیں۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ "دہلی، ممبئی، مدراس اور بنگلور ان کے لیے ولایت ہیں۔ جب کہ ہم واقعی ولایت پلٹ ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہمیں خبطی۔۔۔ خرد ماغ۔۔۔ فرعون مزاج۔۔۔ چنگیز اور ہلاکو۔۔۔ بلکہ یہاں تک ہمیں بدکردار اور بدقماش بھی سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کی پسماندگی اور اخلاقی قدریں۔۔۔ وہ لوگ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولایت میں بدکرداری، فحاشی اور عریانی بہت زیادہ ہے۔ اور وہ ان کی عورتوں۔۔۔"

"مس شیاما۔۔۔!" ونود نے درمیان میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ سب تفصیل آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں نے امر مجبوری ہی قیام کیا بھی تو میرا بیش تر وقت تھانے ہی میں گزرے گا۔ لوگوں کے بیانات لینے۔۔۔ میں یہاں آیا ہوں تفتیش کرنے۔۔۔ یہاں کے غریب لوگوں کی سوچ اور ان کی قابلیت اور سماجی حالات کا تجزیہ کرنے نہیں۔۔۔ تفتیش کا ایک اپنا الگ انداز ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر لوگوں کے بیانات لینے اور ان سے سوالات کرنے کے بعد جائے واردات کا معائنہ بہت ضروری ہے۔ اس کے

بغیر کوئی کارروائی مکمل نہ سمجھی جائے گی۔ قتل کا سراغ لگانے کے چکر میں اِدھر اُدھر خوار تو ہونا پڑے گا۔۔۔ مجھے اس بات سے کیا غرض کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہ ان کی ذاتی رائے اور سوچ ہوگی جس پر آپ پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ آخر آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اتنی فکر اور پریشانی کیوں ہے؟ ان کی بلا سے وہ جو کہتے ہیں۔ آپ ان کی زبان پکڑ نہیں سکتیں۔''

گاڑی کسی جھٹکے کے بغیر رک گئی۔ شیاما نے ایک شیشہ نیچے اتارا پردہ کھینچ دیا۔

''یہ میرے دادا کا مجسمہ ہے جسے آپ اپنی زبان میں جائے واردات کہیں گے۔ کنور بیج سنگھ۔۔۔'' ونود نے محسوس کیا کہ ڈرائیور کو پہلے سے سب کچھ سمجھا دیا گیا تھا کہ اسے کہاں رکنا ہے اور کس راستے سے گزرنا ہے۔

''آپ نے واردات کا ذکر کیا ہے تو میں کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو اس کے بارے میں کیا معلوم ہے۔۔۔؟ میں حوالدار یا کسی اور سے بعد میں یہ بات سنوں گا۔'' ونود نے مجسمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شیاما نے اسے من وعن سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی اور مبالغہ آمیزی بھی نہیں کی نہ اس کی وہ ضرورت سمجھتی تھی۔

شنکر کی لاش کو سب سے پہلے دیکھنے والی بات سے کلدیپ کے وہاں سے لاش ہٹوا دینے کی بات تک۔۔۔ اس تھانے دار کی لاش کی کیسی بے حرمتی کی گئی۔ حوالدار کو کارروائی کرنے کی اجازت تک نہیں دی گئی۔۔۔ جلوس کی شکل میں اسے تھانے پہنچا دیا گیا تھا۔ حوالدار بے بسی سے ساری کارروائی دیکھتا اور بے بسی سے برداشت کرتا رہا تھا۔

ونود حیرانی اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا کہ شیاما اس قدر صاف گوئی سے کام لے گی۔

شیاما آہستہ آہستہ اور غیر محسوس انداز سے اس سے بے تکلف ہونے لگی تھی اور اس کے انداز کی شوخی میں انداز دلربائی کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا تھا اور آنکھوں شراب کا سا خمار نظر آنے لگا تھا۔

ونود نے اسے پہلے آزاد خیال خاندان میں پرورش اور ولایت کی تعلیم کا اثر محسوس کیا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اسے یوں لگا جیسے یہ وہی پرانا حربہ ہے۔۔۔ یعنی ایک نوجوان حسین عورت کو مرد کی جذباتی کمزوری بنا کے اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا۔ وہ یک لخت ایسا محتاط ہو گیا تھا کہ یہ جیسے کوئی زہریلی ناگن ہو اور اسے ڈسنے کے لیے اپنا پھن لہرا رہی ہو۔

''مس شیاما۔۔۔!'' ونود نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر آپ کی دیدی کو خودسری کے اس مظاہرے کی کیا ضرورت تھی جب کہ وہ تعلیم یافتہ، سمجھ دار اور سوجھ بوجھ رکھنے والی ہیں۔۔۔ کیا انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ قانونی فرائض کی ادائیگی میں مزاحم ہونے اور جانتے بوجھتے شہادت کے آثار مٹانے پر انہیں گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا اور اب بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک معمولی سا اقدام ہوا تو کیا ہوا۔۔۔ بہرحال جرم جرم ہے۔ ایک معمولی حوالدار تو کیا ہوا۔۔۔ قانون ایک عام سپاہی کو بھی بہت اختیار اور اہمیت دیتا ہے۔''

''ایس پی صاحب۔۔۔!'' شیاما ہنسی۔ ''ایسی معمولی باتوں پر کنور وجے سنگھ کے خاندان پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ کس میں ہمت ہے؟''

''کیا آپ کے نزدیک قتل ایک معمولی جرم ہے۔۔۔؟ ایک انسان کا قتل۔۔۔ کسی بھی شخص کو چاہے وہ غریب مفلس اور تنگ دست اور مزدور ہی کیوں نہ ہو۔ وہ راستے کا پتھر نہیں ہوتا ہے جسے ٹھوکر مار کر ہٹا دیا جائے۔''

ونود نے توقف کر کے انصاف کی ترازو تھامے بے حس مجسمے کو دیکھا۔ پھر اس نے مجسمے سے نگاہ ہٹا کر شیاما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے سنا ہے کنور صاحب اس علاقے میں تھانہ قائم کرنے کی تجویز کے سخت خلاف تھے۔۔۔

اپنے اثر و رسوخ سے اسے قائم ہونے نہیں دیا تھا۔ اب تک تھانے دار خود تھے اور ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔۔۔ کیا وہ اسی لیے اتنے متفکر تھے کہ انہوں نے بطور خاص آپ کو بھیجا ہے۔ ویسے تو شوفر بھی مجھے لے جاسکتا تھا۔"

شیاما نے اسے مسکرا کر ترچھی نظروں سے دیکھا۔ "کیا میں اتنی ہی بری ہوں۔" اس نے شیشہ گرا کے پردہ برابر کیا اور آگے کھسک آئی۔ ونود کو ایسا محسوس ہوا کہ شیاما کے وجود سے اٹھتی سوندھی سوندھی مہک اسے معطر کر رہی ہے۔

"یہ میں نے کب کہا ہے۔۔۔؟" ونود نے خود کو محصور پا کر کہا۔

شیاما نے شوفر کو حکم نہیں دیا تھا۔ مگر گاڑی چل پڑی تھی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے ہی سے منصوبے کو سوچ بچار سے بنایا گیا ورنہ شوفر کی گاڑی کا خود ہی رکنا اور چل پڑنا۔

ونود نے خود کو مکڑی کے جال میں پھنس جانے والی مکھی کی طرح بے بس محسوس کیا۔ کنور سنگھ کے شاطر نے جو مہرہ استعمال کیا تھا اور جو چال چلی تھی وہ واقعی اسے مات دے جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس کی پیشہ وارانہ زندگی میں مجرم بساط بچھایا ہی کرتے تھے۔ اسے بساط الٹنا آتا تھا۔

ونود کو راستے یا فاصلے کا قطعی اندازہ نہ ہو سکا۔ گاڑی تھی کہ تیزی رفتاری سے سبک خرامی کے سے انداز چلی جا رہی تھی۔ جب شوفر نے دروازہ کھولا تو بیوک پرانی وضع کی ایک حویلی کے پورچ کے نیچے کھڑی تھی جو تین محرابی دروازوں پر قائم تھی۔ زرد پتھر کی عمارت پورچ کے دونوں طرف تقریباً سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ ناہموار دیواروں پر عشق پیچاں کی پرانی بیلیں بل کھاتی اوپر کی منزل تک پہنچ گئی تھیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بھی پرانی طرز کے تھے۔

"شیاما۔۔۔!" کسی عورت نے تیز و تند لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ "کہاں گئی تھیں۔۔۔ اتنی دیر سے کہاں غائب تھیں۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے لڑ کے آئی ہو۔۔۔ عطیہ کو دیکھو۔"

"ارے دیدی۔۔۔" شیاما غصے میں آنے کے بجائے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کا ترنم فضا میں بکھر گیا۔ آپ تو اپنی دھن میں بولتی ہیں تو کسی کو جواب کا موقع نہیں دیتی ہیں۔ اچھا، آپ ان سے تو ملو۔

"یہ کون ہے۔۔۔۔ تمہیں شرم آنی چاہیے ہر ایرے غیرے کے ساتھ پھرتے ہوئے۔۔۔ تم یہ بات کیوں بھول جاتی ہو کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ تمہارے منگیتر کو علم ہو گیا تو منگنی ٹوٹ جائے گی۔"

شیاما پھر سابقہ انداز سے ہنسی۔

"میری منگنی پکی ہے دیدی! یہ کوئی دھاگا نہیں ہے۔۔۔ لوہے کی زنجیر ہے جس میں باندھ دیا گیا ہے۔" وہ بولی۔ "یہ کوئی غیر نہیں ہیں۔ ایس پی مسٹر ونود کمار ہیں۔ شہر سے تفتیش کے لیے آئے ہیں۔" پھر اس نے ونود کی طرف گھوم کر کہا۔ "ونود صاحب! آپ میری بڑی دیدی کلدیپ کور سے ملیے۔"

"کون سے قتل کی تفتیش کے لیے۔۔۔" کلدیپ نے چونک کر لمحے کے لیے غور سے ونود کی شکل دیکھی۔ "اچھا۔۔۔ وہ تھانے دار کا قتل۔۔۔"

"جی ہاں۔۔۔!" ونود نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تو یہاں قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ کیا پہلے بھی کوئی قتل ہوا تھا کسی کا۔۔۔" اس نے سوالیہ نظروں سے کلدیپ کور کو دیکھا۔

"گڑے مردے اکھاڑو گے ایس پی صاحب تو قدم قدم پر آسیب ملیں گے۔" کلدیپ نے اس پر نگاہ جما کے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ تھانے دار کو کس بات کی سزا ملی تھی۔۔۔ دخل در معقولات کی۔۔۔ اگر تم نے اس کی لاش کا عبرتناک تماشا دیکھا ہوتا تو۔۔۔ خیر۔۔۔ اب بھی وقت ہے۔ تفتیش کے چکر میں مت پڑو۔ جس طرح آئے ہو اس طرح لوٹ جاؤ۔"

''میں اسے کیا سمجھوں۔۔۔۔'' ونود نے پوچھا۔ ''میں اسے کیا کہوں۔۔۔؟ دھمکی یا دوستانہ انتباہ!''

''تمہارا جی جو چاہے سمجھو۔۔۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔'' پھر اس نے ونود کا چہرہ نظروں کی گرفت میں لے کر کہا۔

اپنی بات کہہ کر گھومی اور بڑے غرور سے چلتی ہوئی غائب ہوگئی۔ وہ اس کے جسمانی پیچ وخم دیکھتا رہا تھا۔

ونود نے دل میں اس بات کو بڑی فراخ دلی سے تسلیم کیا کہ۔۔۔ یہ عورت اپنے حسن کے خطرناک اسلحے کو جائز اور ناجائز کی پروا کیے بغیر حصول مقصد کے لیے موثر طور پر استعمال کرنے کی اہل تھی۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کلدیپ کے اس رویے کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔۔۔۔ اس کے ذہن میں ایک کش مکش سی ہونے لگی۔

وہ شیاما کی نظر سے بے خبر تھا۔ جو اس کا باغور مشاہدہ کر رہی تھی کہ اوپر کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک لڑکی آدھی باہر تک آئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی صورت کے نقوش مختلف نہ تھے۔ مگر وہ زرد اور بیمار سی نظر آتی تھی۔ گو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد سیاہ تھیں لیکن ان کی گہرائیوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی اور وہ تمسخرانہ انداز میں نیچے دیکھ رہی تھی۔

''ایس پی صاحب۔۔۔! یہ میری دوسری بہن ہے۔۔۔ سرجیت کور ہے جسے ہم سب اسے پیار سے سرجو کہتے ہیں۔'' شیاما بولی۔

''ہیلو۔۔۔!'' سرجو کھل کھلا کے ہنسی اور اس نے اوپر ہی سے ہاتھ ہلایا۔ پھر اس نے یک لخت مڑ کے اپنے پیچھے دیکھا۔

ونود نے اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف کے سائے اترتے دیکھے۔ چہرے پر جو دمک سی تھی وہ کافور ہوگئی۔ وہ سہم کر اس طرح سے پیچھے ہٹی جیسے اس نے کسی عفریت کو دیکھا ہو۔ پھر کھڑکی ایک دھماکے سے بند ہوگئی۔

ونود کو سرجو کی یہ حرکت نہ صرف کچھ اور پراسرار سی لگی۔ دماغ پر زور دینے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''سرجو تھوڑی سی وہ ہے۔۔۔'' شیاما نے سوچ کر کہا اور پھر انگلی کو سر کے قریب کنپٹی پر رکھ کر لگایا۔

''کریک تو نہیں کہنا چاہیے۔'' وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''مگر لوگ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں تو کہنے دیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ایسا کسی وجہ سے ہوتا ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''اسے کریک وغیرہ کہہ کر اور کریک نہیں کرنا چاہیے۔''

''میں نے اسے کریک کبھی نہیں کہا بلکہ اس سے کہتی ہوں کہ سرجو تم ایک فرسٹ کلاس ہو۔ لوگوں کی باتوں کا کوئی خیال نہ کیا کرو۔''

''آپ بہت اچھا کرتی ہیں۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گی۔ ویسے انہیں زیادہ مصروف رکھیں۔''

''اب چلیے۔۔۔ خاندان کے دو افراد سے تو آپ کی صبح ملاقات ہوگی۔ باقی سے بھی ہو جائے گی۔ مگر نہا دھو لیجیے۔'' ونود نے محض سر ہلا دیا۔ پھر ادھر دیکھا۔ مگر اس کا سوٹ کیس پہلے ہی ادھر اندر پہنچ گیا تھا۔

''مس شیاما۔۔۔!'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ۔۔۔ میں اپنے قیام کا کہیں اور بندوبست کرلوں۔''

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہاں ہوٹل تو کیا سرائے تک نہیں ہے۔'' شیاما بولی۔ ''اس لیے کہ یہاں اس کی کوئی ضرورت تک نہیں ہوتی ہے۔ بالفرض کوئی مسافر آ گیا تو یہاں کے لوگ اسے مہمان بنا کر ٹھہرا لیتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے بن بلائے مہمان کی حیثیت سے مجبوراً قبول کیا جا رہا ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''مجھے ایک قتل کی تفتیش کرنی ہے۔ تمہارے گھر والوں

...ہوتا ہے کہ۔۔۔ کہ یہ دخل در ...

... دیدی کی بات کا برا مانا ہے اور اس ... ہوگئے ہیں۔'' شیاما نے اداسی سے کہا۔ ... کے ساتھ ایسی ہی پیش آتی ہیں۔۔۔ ... تھی وہ آپ پر نہیں ہنسی تھی۔۔۔ اسے ... کی عادت ہے۔۔۔ اسے کتنا بھی منع کیا ... وہ اس سے باز نہیں آتی ہے۔۔۔ رہی بات ... کی۔۔۔ آپ شوق سے تفتیش کیجیے۔ کوئی آپ ... کام میں مزاحم نہیں ہوگا۔۔۔ بلکہ میرا اپنا مشورہ یہ ہے کہ یہاں آپ کو ہر ممکن سہولت حاصل ہوگی۔۔۔ اس گھر سے باہر شاید آپ کو کسی کا تعاون نہ ملے گا۔'' پھر اس نے توقف کر کے اپنی آواز دھیمی کر کے رازدارانہ لہجے میں اس طرح سے کہا جیسے دیوار بھی سن رہی ہوں۔

''میں ایک بات بتاؤں آپ کو۔۔۔؟ ہوسکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔۔۔ لیکن لوگوں کا اور خود میرا خیال یہ ہے کہ تھانے دار کا قاتل اسی حویلی میں موجود ہے۔۔۔ وہ ہم میں سے ہے۔۔۔ آپ یہاں رہ کر آسانی سے پتا چلاسکتے ہیں کہ وہ کون ہے۔۔۔؟''

ونود بھونچکا ہو کر شیاما کی شکل دیکھنے لگا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ لوگوں کی یہ بات شاید غلط نہیں تھی کہ۔۔۔ اس گھر کے لوگ خبطی اور سنکی ہیں۔

شیاما کو اب تک سب بہنوں کے مقابلے میں زیادہ متوازن کی مالک سمجھ رہا تھا۔۔۔ کتنی بے خوفی سے تسلیم کر رہی تھی کہ تھانے کے قتل میں ان کے گھر والوں کے ملوث ہونے کی خبر بے بنیاد نہیں ہے۔

اس کی جیسے رہنمائی ہو رہی تھی۔ یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ یہ لڑکی جتنی حسین اور پرکشش ہے اتنی ہی بے خوف اور نڈر ہے۔۔۔ باغی بھی ہے۔ اس کے باغیانہ خیالات کہیں اس معصوم لڑکی کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دیں۔ شیاما نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''ایسی حیرانی سے مجھے مت دیکھیے۔۔۔'' شیاما کے ہونٹوں پر ایک ایسی پیاری دل کش مسکراہٹ ابھر آئی جس نے شیاما کے حسن کو نکھار دیا۔ اس کے جی میں ایک حسرت بھرا خیال آیا۔ ''کاش۔۔۔! اس مسکراہٹ کی دل فریبی کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر سکتا۔۔۔ یہ ہونٹ بھی کیسے رسیلے اور گداز تھے۔ ان میں کتنی مٹھاس ہوگی۔

پھر شیاما ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ونود کچھ کہتا اس سے پہلے بول پڑی۔ ''میرا دماغی توازن بالکل درست ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی نہ مجھ میں جھوٹ بولنے کی ہمت ہے۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بولتی۔۔۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی کسی موقع پر جھوٹ بولا ہو۔۔۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ۔۔۔ تفتیش کے لیے شہر سے آنے والے افسر کی بطور خاص خاطر مدارت کروں۔ بطور خاص کا مطلب آپ کی سمجھ میں آیا اب۔۔۔ اگر کوئی ایسا ویسا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ الو ٹائپ کا شخص ہوتا تو وہ میرے چکر میں پڑ جاتا۔ میری صاف گوئی کو آپ میری بے حیائی تو نہیں سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ یہ چھوڑیے کہ کس نے کیا کہا۔ آپ کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔۔۔ اس لیے کہ آپ مجھے ذہین آدمی لگتے ہیں۔۔۔ میں باتوں اور بشرے سے پہلی نگاہ میں پتا چلا لیتی ہوں کہ سامنے والا شخص کیسا ہے۔ آپ کی قوت ارادی کو شکست دینا۔۔۔ معاف کیجیے گا۔۔۔ ورغلانا آسان نہیں ہے۔۔۔ دیکھیے نا۔۔۔ آپ نے گاڑی میں مجھ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔۔۔ نہ مان مانی کی۔۔۔ آپ من مانی کرتے تو میں قطعی کوئی تعرض نہیں کرتی۔۔۔ مجھے وشواس ہے کہ آپ شاید معلوم کرلیں گے کہ قاتل کون تھا۔۔۔ پھر میں سازش میں شریک ہو کر مجرم کیوں بنوں۔۔۔؟''

وہ ونود کو دیوان عام جیسے ہال سے گزار کے قالین بچھے ہوئے زینے کے راستے اوپر لے گئی۔

''اگر یہ معاملہ تحصیل کے تھانے والوں پر چھوڑ

دیا جاتا تو آسانی سے دب جاتا بالکل اسی طرح جیسے میرے چچا کی پراسرار موت کا معاملہ دبا دیا گیا تھا حالانکہ وہ بھی قتل تھا۔''

ونود کے قدم بے اختیار رک گئے۔ وہ چونک گیا۔ اس نے اپنا بازو غیر محسوس انداز سے چھڑوالیا۔

''کیا کلدیپ کور نے اسی لیے پوچھا تھا کہ کون سا قتل۔۔۔؟'' ونود نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔۔۔'' شیاما نے پھر سے اس کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ کشاں کشاں لے جانے لگی۔ ''ان کی دیہانت کو اور سواگ باش ہوئے اور انہیں جو قتل کیا گیا وہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں۔ میرا ایک ہی چچا تھا۔ بہت شان دار، نفیس اور ذہین اور اعلا صلاحیت کے مالک تھے۔ ان میں جو قابلیت، دور اندیشی اور سمجھ داری تھی ایشور نے خاندان کے کسی فرد کو نہیں دی تھی۔۔۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس خاندان کے نہ صرف بگڑے حالات بلکہ افراد کو بھی سدھار دیتا۔ میں اس کی کتنی خوبیوں کے بارے میں بتاؤں اور تعریف کروں۔ وہ ندی میں ڈوب گیا تھا اور اس کی لاش ایک ایسی جگہ سے ملی تھی جہاں کوئی نہیں جاتا۔۔۔ لہٰذا مہندر انکل کے ڈوب کر مرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پولیس کو قاتل نہ ملا۔ انہوں نے آسانی سے حادثاتی موت قرار دے دیا۔ یہ پولیس کی نا اہلی سہی اور غفلت تھی۔ بے زاری تھی۔۔۔ یا پھر قاتل نے ان کی مٹھی گرم کر کے تفتیش سے روک دیا تھا۔

''تھانے دار کی موت کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگئی۔

ونود نے حویلی کی قدامت اور رئیسانہ شان کے مطابق سجے سجائے بیڈ روم کو دیکھا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن الجھن اور تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ خود شیاما جو اس گھر کی ایک بیٹی ہے، خاندان کے دیگر افراد کی طرح اس کے ناموس کی پاسبان بھی جا سکتی ہے یہ بات کیوں یقین دلانے پر مصر ہے کہ ان کا عزت دار گھرانہ درحقیقت قاتلوں کی ٹیم ہے۔

اگر وہ اس خاندان کو رسوا کرنا چاہتی ہے تو کیوں۔۔۔؟

کیا اس لیے کہ اس کے چچا کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

شیاما نے اپنے چچا سے جن جذبات کا اظہار کیا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے چچا سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اسے آج بھی اس کی موت پر گہرا صدمہ ہے جیسے اس کی موت قاتل کے ہاتھوں کل ہی ہوئی ہے۔

اسے اپنی بڑی بہن کلدیپ سے وہ انسیت نہیں ہے جو بہنوں میں ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ونود نے شیاما کی طرف دیکھا۔ شیاما ہاتھ باندھے کھڑی اسے اپنی طرف متوجہ پانے کی منتظر تھی کہ وہ کچھ کہے۔ اس لیے کہ اسے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ کہہ چکی تھی۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ مگر ونود اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے آرٹ کا کوئی شاہکار دیکھ رہا ہو۔

''مس شیاما۔۔۔!'' ونود نے بالآخر خاموشی کے ساتھ اس جمود کو توڑا اور پھر جیب سے سگریٹ نکالا۔ ''آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ سگریٹ پینے کی اجازت ہے مجھے۔۔۔؟'' اس نے اخلاقاً پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر سگریٹ لائٹر سے سلگائی۔

''میں کیا چاہتی ہوں۔۔۔'' وہ سپاٹ لہجے میں ونود کے الفاظ دوہرا کے بولی۔ ''یہ پوچھیے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔۔۔ کنور وجے سنگھ ہی نہیں، اس حویلی میں رہنے والوں نے اتفاق رائے سے مجھے سفیر بنایا تھا اور یہ اختیارات دیے تھے کہ میں آپ کو رشوت دے کر اس تفتیش سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں۔ رشوت کی رقم پچاس ہزار تک ہو سکتی

ویسے تو مجھے اشاروں میں یہ بھی سمجھا دیا گیا تھا ۔۔۔ اگر پچاس ہزار لینے کی بجائے کوئی میرا طلب گار ہو تو میں اپنے آپ کو بھی خاندان کی عزت بچانے کے لیے قربان کردوں۔۔۔ اس پر مہربان ہو جاؤں۔۔۔ کسی قیمت پر خاندان پر آنچ نہ آئے۔۔۔ مجھ پر آنچ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ اس لیے کہ خاندان کی عزت اور عظمت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے جتنی بھی قربانی دی جائے کم ہے۔۔۔ ایک مرتبہ خاندان کی عزت، وقار اور عزت کو داغ لگا تو پھر دوبارہ نہیں مل سکتی اور نہ ہی اسے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس امر کو پیش نظر رکھا جائے۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔

قربانی بھی تو ایک طرح سے رشوت ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ انسان کے حضور پیش کی جائے یا دیوتا کو دی جائے۔ لیکن میں نے اس دوسرے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔۔۔ اس لیے کہ میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں اور عصمت اور عفت کے فرسودہ سمجھے جانے والے نظریات پر اب تک قائم ہوں۔۔۔ حالانکہ میں نے یوروپ میں تعلیم پائی۔ وہاں جو میں نے آزادی خصوصاً لڑکیوں، عورتوں میں محسوس کی یہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی معاشرہ مادر پدر آزاد ہوتا ہے۔۔۔ وہاں میری ہم جماعت لڑکیاں جو چودہ پندرہ اور سولہ برس کی تھیں ان کے نزدیک عورت کی آبرو کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔۔۔ ہر ایک لڑکی کے دوستوں میں مرد زیادہ ہوتے تھے۔ وہ لڑکی جس کے لڑکے، مرد زیادہ دوست ہوں خوش نصیب سمجھی جاتی تھی۔ لڑکیاں جو میری ہم جماعت تھیں ایک دوسرے سے بے حد بے تکلف، فری، بے حجاب اور بے شرم تھیں۔ ان کی باتیں سن کر میری پیشانی عرق آلود ہو جاتی تھی۔ وہ بتاتی تھیں دولت مند لڑکے اور مرد انہیں سرفراز کرتے ہیں۔۔۔ ان کے نزدیک وہ لڑکی بڑی رشک و حسد سے دیکھی جاتی تھی جس کی زندگی میں زیادہ لڑکے، مرد آ رہے ہوں۔۔۔ ان میں دو ایک ہندوستانی اور مقامی بھی تھیں انہیں اس بات کا طعنہ دیا جاتا تھا کہ کوئی لڑکا یا مرد دوست نہیں ہے۔۔۔ صرف اس لیے کہ ہم بدصورت اور بے کشش ہیں۔ کلاس میں ٹیچر ہوتی لڑکے لڑکیاں جذباتی انداز سے ایک دوسرے سے پیش آتی تھیں۔ شاید میرے گھر والوں کو شک تھا کہ میں وہاں کے ماحول، آزادی اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر دولت مند اور ہم جماعت لڑکوں پر مہربان ہوتی رہی ہوں۔ میں نے ان سب پر غیر محسوس انداز سے واضح کر دیا کہ میں نے مشرق اور ہندوستان کی لاج رکھی۔ کبھی بھی بھولے سے کسی لڑکے کو دوست نہیں بنایا۔ اس کے ساتھ ہوٹل بازی یا سیر و تفریح اور پکنک تک نہیں منائی۔۔۔ وہاں بوسہ بازی عام تھی۔۔۔ بوسہ بازی دور کی بات ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی بھی ہم جماعت لڑکے سے مصافحہ نہیں کیا۔ اس لیے مجھے میرے خاندان والے مجھے مہرہ بنانا چاہ رہے تھے۔''

''اگر یہ ذمے داری کلدیپ کے سپرد کی جاتی تو۔۔۔ اس لیے کہ وہ بھی تو ولایت پلٹ ہے۔'' ونود اپنی حیرانی پر قابو پا چکا تھا۔ ادھر شاما سے وہ بڑا متاثر سا ہو گیا تھا۔ جس کا ماضی آئینہ کی مانند رہا تھا۔

''وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں اور مناسب عورت تھی۔۔۔ اگر آپ نے اسے ایک مرد کی نظر سے دیکھا تھا تو۔۔۔ وہ مغرور سے مغرور مرد کا سر خم کر سکتی تھی۔ اس پر اس قدر فیاضی سے مہربان ہو جاتی کہ مرد کی کم زوری بن جاتی۔ ایسی عورت کو یوروپ میں سیکسی کہا جاتا تھا جس کے معیار پر وہ پوری اترتی ہے۔ وہ ایسا گداز پرشباب بدن۔۔۔ تشبیب و فراز رکھتی ہے کہ مرد اسے دیکھ کر پاگل بن جاتے ہیں اور۔۔۔''

''پھر اسے کیوں نہیں منتخب کر کے مہرہ بنایا گیا۔ مچھلی کے لیے اس سے بہتر چارہ کوئی اور نہیں تھا۔'' ونود نے درمیان میں کہا۔

''اس لیے کہ وہ اتنی مغرور ہے کہ اس نے اپنی

... قربان کرنا منظور نہیں کیا۔ جب کہ وہ بہترین چارہ تھی۔'' شیاما بولی۔

شیاما اب اس کے مقابل آ بیٹھی تھی۔ اس کے سگریٹ لائٹر کو بے مقصد جلا بجھا رہی تھی۔ وہ لائٹر تھام کر بولی۔

''چنانچہ قرعہ فال میرے نام نکلا۔ آپ رشوت لینے کے قائل ہیں یا نہیں۔۔۔؟ پچاس ہزار ایک بڑی رقم ہے۔''

''میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' ونود نے سگریٹ کی راکھ سگریٹ کی پیکٹ میں جھاڑی کیونکہ اردگرد ایش ٹرے نہ تھی۔ ''مجھ جیسے ایک سرکاری ملازم کے لیے یہ رقم بہت بڑی ہے۔ خواب میں بھی میرے لیے اس کا حصول ناممکن ہے اور پھر میں اتنی رقم دس برس میں بھی پس انداز نہیں کر سکتا۔۔۔ اور اس سرمایہ سے آج کوئی منافع بخش کاروبار کر کے اس نوکری پر لعنت بھیج سکتا ہوں۔ جس میں چور، ڈاکو، قاتل اور بدمعاش ہر وقت جان کے درپے رہتے ہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہ پیش کش رائیگاں نہ جاتی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' شیاما نے لائٹر رکھ کے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے گورے گلابی پاؤں جوتے سے نکال کر میز پر پھیلا دیے۔ جو ونود کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے سفید کبوتروں کی طرح لگے۔

''آپ میری طرف متوجہ نہیں ہیں۔'' شیاما نے غور سے ونود کو دیکھا۔

ونود خفت سے مسکرایا۔ کیوں کہ ان گورے گورے گلابی گلابی کبوتروں کو وہ محویت سے دیکھنے لگا تھا۔ ''جی۔۔۔ آگے کہیے۔۔۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''کنور وجے سنگھ کی کابینہ کے اجلاس میں رشوت مسترد کیے جانے سے پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا۔'' شیاما نے پوری سنجیدگی سے کہا اور پھر یہ طے پایا تھا کہ بغرض محال آپ اصول پرستی اور فرض شناسی کے ناقابل علاج جنون میں مبتلا ہوں اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ قاتل کون ہے۔۔۔ تب بھی اس صورت میں پچاس ہزار کی پیش کش برقرار رہی جائے۔

ایک بار پھر ونود کی عقل چکرا گئی۔ اسے یاد آیا کہ بڑے شہروں میں پولیس کے محکمے میں کتنی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں۔۔۔ چوں کہ وہاں ہر منٹ جرائم ہوتے ہیں۔۔۔ نوخیز عمر کی لڑکیوں کی بے حرمتی۔۔۔ قتل کی وارداتیں۔۔۔ بینکوں اور گھروں میں ڈکیتیاں۔۔۔ رہزنی اور لوٹ مار۔۔۔ وہاں ہر وقت لوٹ کھسوٹ اور رشوت کا بازار گرم رہتا ہے۔۔۔ ضروری نہیں چالیس چالیس، پچاس پچاس ہزار، دس بیس ہزار، صرف سینکڑوں میں رشوت دے کر مجرم بچ جاتے ہیں۔ پچاس ہزار کی رقم صرف اعلا افسروں کو قانون شکنی پر ملتی تھی۔ وہ پھانسی والے مجرم کو تختہ دار سے بھی اتار لیتے تھے۔

''گویا رشوت کی جگہ انعام۔۔۔'' ونود نے طنز کیا۔ ''یعنی صرف لیبل بدل دیا جائے گا۔ کیوں؟''

''یہ انعام نہیں بلکہ یہ بھی رشوت ہوگی۔'' شیاما نے کہا۔ ''اس بات کی کہ آپ قاتل کے نام کی تشہیر نہیں کریں گے۔۔۔ اسے قانون کے حوالے کرنے کے بجائے ہمارے نظام انصاف کے سپرد کر دیں گے اور ہم قاتل کو باعزت طور پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینے کا موقع فراہم کریں گے۔ مقدمے سے سزا تک عدالتی کارروائی میں جو رسوائی ہوتی ہے وہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔''

''فرض کیجیے۔۔۔ میں یہ بات مان لیتا ہوں۔'' ونود نے کہا۔ ''تو اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ۔۔۔ قاتل بھی آپ کی بات مان لے گا اور فرار نہیں ہوگا۔۔۔ اس پہلو پر بھی غور کیا گیا؟''

''اس کی ضمانت بھی دے سکتی ہوں۔ پاپا لے سکتے ہیں۔'' شیاما نے پورے اعتماد سے یقین دلایا۔

''یہ تو آپ اپنے طور پر کہہ رہی ہیں۔۔۔ اگر کنور وجے سنگھ اس بات سے مکر گئے تو۔۔۔'' ونود

اپنے شک کا اظہار کیا۔

ہم قول پر جان دینے والے لوگ ہیں۔ نہیں۔۔۔ ہمیں عزت جان سے زیادہ پیاری ہے۔ عزیز ہے۔۔۔ اس لیے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں۔۔۔ انکار کی صورت میں ہم خود بھی قاتل کو سزائے موت دے سکتے ہیں اور فرار کی صورت میں رضا کارانہ طور پر ہم میں سے کوئی بھی مکمل اعتراف جرم کی تحریر آپ کے حوالے کرنے کے بعد اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ آپ کا قانون بھی تو ضامن کو پکڑتا ہے۔۔۔ اور قاتل کو سزائے موت دیتا ہے۔ کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں ہو گی ایس پی صاحب!''

''میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ونود نے کہا۔ ''مجھے حالات کا جائزہ لینے تو دیجیے۔۔۔ فیصلہ میں اس کے بعد ہی کر سکوں گا۔ میں جلد بازی اور عجلت کا قائل نہیں ہوں۔ اس وقت میں چوں کہ لمبے سفر سے آیا ہوں، اس لیے نہ صرف جسم بلکہ دماغ بھی تھکا ہوا ہے۔۔۔ میں ذرا نہالوں اور پھر تازہ دم ہو جاؤں اور دوسرے لوگوں سے بھی مل لوں۔''

''مجھے منظور ہے۔'' شیاما نے کہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر ساڑی کا پلو شانے اور سینے پر سے پھسلا۔ اس طرح جیسے مرد کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ ونود کی نگاہ یوں بہکی کہ وہ پل بھر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ اس کے دل پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی اس نے سوچا۔ دنیا میں ایک تو قدرتی نظارے ہوتے ہیں جو دل کو کیف و سرور اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔۔۔ اس نے کیسے نظارے نہیں دیکھے اور دیکھتا رہتا تھا۔ اس کا دل کرتا تھا کہ اس کی تصویر کشی کر لے۔

لیکن عورت جیسا نظارہ۔۔۔ کیا ہیجان خیز، دل کش اور رعنائیاں لیا ہوتا ہے۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا ہر لڑکی، عورت اپنا ایک الگ نظارہ رکھتی ہے۔۔۔ ایسا نظارہ جو دل کو گرما دیتا ہے۔

شیاما دل فریب انداز سے مسکرائی۔ اس نے دانستہ یہ حرکت نہیں کی۔ جب وہ کھڑی ہوئی تو تیزی سے پھسلتے ہوئے پلو کو تھام نہ سکی تھی۔ دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ جاتے جاتے اپنی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک چھوڑ گئی۔

ونود جلتی ہوئی سگریٹ کا آخری حصہ انگلیوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ اس عجیب و غریب لڑکی نے اپنے حسن و شباب کی رعنائی سے ہی نہیں بلکہ اپنے کردار سے بھی اسے متاثر کیا تھا۔ وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ غلط ماحول نے اس کی سوچ کو تھوڑا سا غلط کر دیا تھا۔ ورنہ شیاما اب ملنے والی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کے تصور سے قریب ترین تھی جو ونود کے ذہن نے مثالی عورت کے پیکر میں ڈھال رکھا تھا۔ اور جس کے ساتھ زندگی گزارنے کی تمنا کی جا سکتی تھی۔

سگریٹ کے جلتے ٹوٹے سے انگلیاں جلیں تو وہ چونک کر اٹھا۔

پھر وہ غسل خانے میں گھس گیا جو نہایت خوب صورت اور کشادہ تھا۔۔۔ مغربی طرز کا۔۔۔ شاور کے علاوہ وہاں باتھ ٹب تھا جس میں بیک وقت دو آدمی نہا سکتے تھے۔ شاور بھی تھا، واش بیسن۔۔۔ اسٹینڈ پر شیمپو اور کئی اقسام کے لوشنز بھی تھے۔ صابن کی ایک ٹکیہ۔۔۔ کھونٹی پر فروکش تولیا لگا ہوا۔ غسل خانہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

وہ شاور کے نیچے رم جھم برستے پانی سے بھیگتے ہوئے اس نے بڑے افسوس سے سوچا۔

ایسے تو شیاما کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔۔۔ نہیں شیاما کی نہیں۔۔۔ کنور وجے سنگھ کے گھرانے کی سازش۔۔۔ مجھے زیادہ دفاعی کھیل کھیلنا ہوگا۔۔۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔

لباس بدل کے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب اسے اپنے کمرے میں بیٹھ کے صورت حال کا تجزیہ کرنا چاہیے جو خاصی واضح ہو چکی تھی۔ تفتیش کا آغاز کر دینا چاہیے اور تھانہ پہنچ جانا چاہیے یا پھر دوپہر کے کھانے تک کچھ آرام کر لینا

چاہیے۔

دروازے پر دستک ہوئی پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر دیکھا تو شیاما سفید شلوار قمیص میں۔۔۔ بالوں میں موتیوں کے سفید پھول سجائے اور کانوں میں چاندی کے جھل مل کرتے سفید آویزے پہنے کھڑی تھی۔ لباس کے ساتھ ہی اس کے حسن و دل کشی کے انداز میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا جو سادگی میں حسن کا نظر نواز نمونہ تھی۔

پہلے اس کے جمال میں قطرہ سیماب کی تب و تاب اور تڑپ تھی تو اب قطرہ شبنم کی طہارت اور ٹھنڈک۔

''برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں ایس پی صاحب! بلکہ دو باتیں۔'' وہ مسکرائی تو اجالا اور بڑھ گیا۔

''ایک دو نہیں بلکہ آپ دس باتیں بھی سنا سکتی ہیں۔'' ونود بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ''نہ ماننے والا گناہ گار۔۔۔ پاپی۔''

وہ ہنسی تو اس کی کھنک پھر فضا میں گونج اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے برقی قمقمے جل اٹھے۔ وہ بولی۔

''ایک تو یہ کہ آپ صورت سے ذرا بھی ایس پی نہیں لگتے۔۔۔ ہمارا خیال تھا کہ کوئی بھاری بھرکم خوف ناک شکل کا۔۔۔ بڑی بڑی مونچھوں والا خرانٹ افسر آئے گا۔۔۔ عموماً پولیس افسران کی وضع قطع سفاک ڈاکو کی طرح ہوتی ہے۔۔۔ اگر میں آپ کا نام لے کر مخاطب کروں تو کیا کہوں۔۔۔ ونود کمار صاحب یا صرف ونود۔۔۔؟''

''مجھے بھی تکلف اچھا نہیں لگتا اس لیے کہ اس میں ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔'' ونود نے محتاط ہو کر کہا۔ ''مگر بے تکلفی کے مظاہرے سے غلط تاثر قائم ہو سکتا ہے آپ کے گھر والوں پر۔۔۔ اور باہر بھی۔۔۔ میں یہاں سرکاری کام سے آیا ہوں۔ اس کی نوعیت سے بھی اور آپ بھی واقف ہیں۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے خاندان سے میری کوئی مراسم نہیں۔۔۔

پروف

اور اگر پہلے ہی دن سے آپ نے مجھے ونود اور میں نے آپ کو شیاما کہا تو ممکن ہے کہ غلط سمجھنے والے میری غیر جانب داری ہی پر شکوک میں مبتلا ہو جائیں۔ ہم لاکھ روشن خیال سہی۔ رہتے ہیں تو ہندوستان میں ہی ہیں۔۔۔ اور خصوصاً یہاں۔۔۔''

''میں سمجھ گئی مسٹر ونود۔۔۔!'' شیاما نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ لندن نہیں ہے۔ وہاں تکلفات نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں کا ماحول اور معاشرہ اور اس کے انداز کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔۔۔ آیئے میں آپ کو پاپا سے ملاؤں۔ کھانے میں ابھی ذرا دیر ہے۔ آپ کو کافی بھی مل سکتی ہے اور دل چاہے تو آپ پاپا کے ہم مشرب بھی بن سکتے ہیں۔''

''کیا کہانی واقعی کافی ہو گی۔۔۔؟'' ونود نے کہا۔ ''ویسے اچھی کافی میری بہت بڑی کم زوری ہے۔ مجھے اس کا بڑا نفیس ذوق بھی ہے۔''

شیاما کے ساتھ اسے نیچے جاتے ہوئے اسے اطمینان ہوا کہ وہ اس شوخ اور بے باک لڑکی کی پیش قدمی روکنے اور درمیان میں رسمی ادب و آداب کی دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب رہا۔۔۔ اور اگر یہ اسے اپنے حسن میں اسیر کر لینے کی کوشش تھی تو شیاما ناکام رہی تھی۔

وہ اس کے ساتھ اتنے کم فاصلے پر چلتی رہی کہ ونود کو ایک عجیب سی ہیجان انگیز حواس پر چھا جانے والی نرم و لطیف خوشبو کا احساس ہوا۔ ہلکی سی ضرب آفریں مہک جو کسی قیمتی کلون کی بھی ہو سکتی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ نہیں یہ انوکھی اور لطیف سی سوندھی سوندھی خوشبو کنواری بدن کی ہے جو کسی پرفیوم میں نہیں ہو سکتی اور اس کے گلستان کی بھی۔

نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا جیسے وہ کسی جادوگرنی کے حصار سے نکل آیا ہو۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔

ساٹھ برس سے زائد عمر کا سرخ و سفید بارعب

...ااا بوڑھا کنور وجے سنگھ تخت پر قیمتی شال
او... کا دتکیہ لگائے نیم دراز تھا۔ اس کے قریب
...ے کام والی میز پر پورا اہتمام تھا۔
...سرائیس برس کالا ابالی سا نوجوان تھا۔ جس
...ن کھلے گریبان والی قمیص اور ڈینم کی نیلی
...ن پہن رکھی تھی۔ وہ صوفے پر دراز تھا۔ سگریٹ
پی رہا تھا۔

ونود کے اندر آنے پر بھی اس کے اندازِ بے رخی
...ں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس طرح سگریٹ کے
...ش لیتا رہا۔ سگریٹ پینے کا انداز نشہ بازوں کا سا
تھا۔ پھر وہ ونود کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"یہ میرے پاپا ہیں۔۔۔ کنور وجے سنگھ۔"
...یامالا نے تعارف کرایا۔ "پاپا یہ ہیں۔۔۔ آپ مسٹر
ونود کمار ہیں۔" کنور وجے سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کی
اور اپنا بھاری بھرکم ہاتھ بڑھا کے مسکرایا۔

"آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ ایس پی صاحب۔۔۔!
معاف۔۔۔ معاف کرنا۔۔۔ میں اٹھ کے تمہارا
استقبال نہیں کرسکتا۔ کنور وجے سنگھ۔۔۔ وجے یعنی
فتح۔۔۔ اور سنگھ۔۔۔ چوں کہ آپ سنگھ نہیں ہیں اس
لیے بتا دیتا ہوں۔۔۔ شیر۔۔۔ مگر یہ شیر بوڑھا ہو گیا
ہے۔۔۔ یہ اس کی فتوحات کا نہیں۔۔۔ شکست کا
دور ہے۔"

پھر توقف کر کے جام اٹھا کے حلق میں انڈیل
لیا۔ پھر خالی گلاس رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا پیو گے۔۔۔؟ کس ملک کی۔۔۔ کس سن
کی۔۔۔؟ کون سی شراب بولو؟ کون سی ایسی شراب
ہے جو میرے پاس نہیں۔"

"کنور صاحب۔۔۔! میں کافی کی درخواست
کر چکا ہوں۔" ونود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس
نے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "غالباً یہ
آپ کے ولی عہد ہیں۔ کنور بلونت عرف بلی۔"

"بریفنگ تمہاری اچھی کی گئی ہے۔" بلونت
نے ... لہجے میں کہا۔ "مگر ایس پی بہادر۔۔۔! یہ
یہاں نہیں چلے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔۔۔ اس لب و لہجے میں یہ
بات کہنے کا مقصد کیا ہے۔" ونود نے متانت آمیز
خشک لہجے میں کہا۔

بلونت اٹھ بیٹھا۔ "یہ تحقیق و تفتیش کا چکر یہاں
نہیں چلے گا۔۔۔ اس حویلی میں در معقولات۔۔۔"

"قتل کسی کا نجی معاملہ نہیں۔۔۔ بلونت!" ونود
نے سخت لہجے میں کہا۔ "نہ قانون کی نظر میں۔۔۔ نہ
میرے لیے۔۔۔ لہٰذا قتل ایک سنگین اور وحشیانہ فعل
ہے۔ مجرم کو تختہ دار پر پہنچانا۔۔۔"

"ہمارے لیے ہے۔۔۔" بلونت سرکشی سے
بولا۔ "اس حویلی میں ہے اور اس حویلی میں ہمارا راج
ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں؟"

"بار بار حویلی میں میرے قیام کا حوالہ مت
دیں۔" ونود نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ "تمہاری بہن
خود مجھے لے کر آئی۔ اسٹیشن پر گاڑی لے کر آئی
تھی۔۔۔ میں نے کوئی درخواست نہیں کی تھی اور
رہائش میرے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ اب بھی نہیں ہے۔
تھانہ موجود ہے جس میں حوالدار بھی موجود ہے۔

تمہارا خیال رکھنے والی کتنی اچھی بہن ہے۔"
ونود چوکس ہو کر کہنے لگا۔ "آج کل ایسی بہنیں کہاں
ہیں جو بھائیوں کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔۔۔ انہیں اپنی
گڑیاؤں اور سہیلیوں سے بھی فرصت نہیں ہوتی
ہے۔ ویسے تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تمہاری پیاری
بہن تمہاری بوریت اور تنہائی اس طرح دور کرتی آ
رہی تھی۔۔۔ وری گڈ!"

بلونت بگولے کی طرح اٹھا۔ اس کی آنکھوں
میں خون اتر آیا تھا اور چہرہ نفرت اور غصے سے چقندر
کی طرح ہو گیا تھا۔

ونود نے اس کے بشرے سے بھانپ لیا تھا۔
اس لیے وہ اس سے پہلے کھڑا ہو چکا تھا۔ بلونت کے
جست لگاتے ہی ونود نے خود کو بچا کے پوری قوت
سے اس کے مکا رسید کیا جو اس کے سر پر لگا جس نے
اس کی کھوپڑی سنسنا دی۔

وہ چکرا کر پیچھے گرا اور کنور صاحب کے پیمانے

فرش پر ڈھیر ہوگیا۔
ونود اس کے دوسرے حملے کے لیے سکون اور اطمینان سے کھڑا ہوا تھا اور منتظر تھا۔ بلونت سنگھ کو فیصلے کی مہلت دے رہا تھا۔
مگر شیاما ایک ہذیانی چیخ مار کر تیزی سے ان کے درمیان آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔
نشے میں دھت کنور جی وجے سنگھ نے ایک زور دار قہقہہ مار کر دوسرا جام حلق سے اتارا۔
''کم آن بلی۔۔۔! ایک راؤنڈ اور۔۔۔ طاقت ور نوجوانوں کو لڑتے دیکھ کر۔۔۔ میری بوڑھی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔۔۔ مگر اب ادھر مت گرنا۔۔۔ سب تخلیہ کر دیا۔
کنور وجے سنگھ نے تالی بجائی ''یہ صاف کرادو۔۔۔ ہمارے لیے نیا جام لاؤ۔۔۔ پرانی شراب لاؤ'' اس نے پھر ایک زوردار قہقہہ مارا۔ ہنسا پھر اس نے بلونت سنگھ کو للکارا۔
''اٹھ بھائی۔۔۔ شیر کی اولاد۔۔۔! تو نے تو ناک کٹوادی اس خاندان کی۔۔۔ ایک مکا کھا کر تختہ ہو گیا'' بلونت دیوار کے سہارے بیٹھا ونود کو خون آشام نظروں سے گھور رہا تھا اور اس کے چہرے پر درندگی تھی۔
مگر ناز و نعم میں پلے ہوئے شہزادے کو پہلا مظاہرہ مہنگا پڑا تھا۔ اب تک اسے کمزوروں سے اور غلاموں سے واسطہ پڑا تھا جو اس کے لاتوں، جوتوں اور گھونسوں کو اس لیے برداشت کرتے تھے کہ وہ رعایا تھے۔ زر خرید غلاموں کی طرح۔۔۔ اس نے کسی کو سفاکی سے نشانہ ہی کیوں نہ بنایا جو اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرات ہی نہیں کی تھی۔ اب کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا تو اس کے اپنے گھر پر۔۔۔ وہ بھی اس کے باپ کے سامنے۔
بلونت سنگھ نے اندازہ کر لیا تھا کہ مقابلہ بے سود ہے۔ اس کا دشمن سرکاری حیثیت ہی میں نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی اس سے بہت برتر تھا۔ اب وہ دوسرا مکا کھانے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اسے اپنے دانت ٹوٹنے کا خدشہ تھا۔ اس کا متاثرہ جبڑا بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ سہلانے لگا تھا۔
شیاما نے ونود کا بازو تھام کر کھینچا۔ وہ خائف اور سراسیمہ تھی کہ اس کے بھائی نے ماحول میں بدمزگی پیدا کر دی تھی۔
''پلیز۔۔۔ ونود۔۔۔ مسٹر ونود کمار۔۔۔! چلیں۔۔۔ اوپر کمرے میں چلیں۔۔۔ کافی وہیں آ جائے گی۔ پاپا ہوش میں نہیں ہیں۔''
''اس بلونت کے ہوش تو ٹھکانے آ گئے ہیں۔'' ونود نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ''طاقت ور کو بلونت کہتے ہیں نا۔۔۔ اسے اپنی طاقت تو آزمانے دیں۔ ورنہ یہ کہے گا کہ بزدل تھا بھاگ گیا۔ میری بہن اسے بچا کے لے گئی۔''
''پلیز۔۔۔ ونود سر ونود کمار!'' وہ روتے ہوئے گڑگڑائی۔ ''اس بے وقوف کو معاف کر دیجیے میری خاطر۔''
''آپ کی خاطر۔۔۔'' ونود نے پلٹ کر تلخی سے کہا۔ ''اس سب خرابی کے باوجود جس کی ذمے دار آپ ہیں۔ یہ بے وقوف ہرگز نہیں ہے۔۔۔ بزدل ہے۔ اس نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔
مگر اس کے باوجود وہ شیاما کے ساتھ کسی فرماں بردار بچے کی طرح چل پڑا اسے خود پر تعجب ہوا۔
شیاما کے پھول جیسے گالوں پر آنسوؤں کو پھسلتے دیکھ کر وہ پگھل گیا تھا۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے کہا۔
''آئی ایم سوری۔۔۔ لیکن دیکھیے نا۔۔۔ اس نے بکواس کی۔۔۔ طعنہ دیا اور پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔۔۔ میں نے صرف اپنا دفاع کیا۔''
''میں آپ کو الزام نہیں دے رہی ہوں۔'' شیاما دوپٹے میں آنسوؤں کو جذب کر کے مسکرائی۔ ''آپ کچھ خیال نہ کریں۔''
ونود کو یوں لگا جیسے بادلوں کے برستے برستے دھوپ نکل آئی ہو۔ بادل ایک ایک کر کے چھٹ گئے ہوں۔

''میں تو شکر گزار ہوں کہ بات بڑھانے کے بجائے تم نے میری بات مان لی۔۔۔ چلو۔''

وہ پھر اس کا بازو تھام کر زینے کی طرف بڑھی۔ اس وقت اوپر سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔۔۔ ہذیانی۔۔۔ پاگل ہسٹریائی چیخ سنائی دی۔ ونود کے قدم بے اختیار رک گئے۔ اس نے شیاما کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ سرجیت ہے۔'' شیاما نے اسے اطمینان بھرے لہجے میں بتایا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے چیخنے چلانے کی عادت ہے۔''

''تمہارا یہ گھر نا صرف عجیب ہے بلکہ ایک معمہ ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں سب پاگل ہیں۔۔۔ کسی پاگل خانے سے کم نہیں ہے۔۔۔ تم سمیت یہاں سبھی پاگل ہیں۔۔۔ اس بات کو جانتے ہوئے بھی تم مجھے یہاں لائیں اور میں بھی یہاں سے گیا تک نہیں۔'' اس کا موڈ اب تک خراب تھا۔

دوسری منزل پر کلدیپ نے سرجیت کو دبوچ رکھا تھا۔ کلدیپ صحت مند عورت تھی۔ اس نے دبلی پتلی بیمار نظر آنے والی سرجیت کی نازک کلائی موڑ دی۔ کلدیپ کے ہاتھ خوب صورت اور مضبوط بھی تھے۔

شکاری چاقو سرجیت کے ہاتھ میں تھا۔ بڑی آواز کے ساتھ راہ داری کے رنگین ٹائلوں والے فرش پر گرا۔

کلدیپ نے فوراً ہی سرعت سے جھک کر چاقو اٹھایا اور سرجیت کو ایک طرف زور سے دھکا دے دیا۔

''سرجو۔۔۔'' شیاما ایک دم سے چلائی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے دیدی۔۔۔! کیا بات ہے؟''

سرجیت کے لمبے لمبے گہرے ریشمی سیاہ بال بکھر گئے تھے۔ اس کے رخسار پر خراش لمبا نشان سرخ ہو رہا تھا۔ وہ دیوار سے لگ کر ہانپنے لگی۔

''شیاما۔۔۔! شیاما۔۔۔! دیدی۔۔۔ دیدی میرے کمرے میں سے میری دوا چرا کر لے جا رہی تھی۔''

''کیا۔۔۔؟'' شیاما بولی۔ ''دیدی تمہاری کیا چیز چرا کر لے جا سکتی ہے۔ تمہیں شک ہو رہا ہے۔ تمہارا وہم ہے۔''

''دیدی میرے کمرے میں ہے میری دوا چرا کے لے جا رہی تھی۔۔۔ یہ پکی چور ہے۔ چوری چکاری اس کی پرانی عادت ہے۔ اپنی سسرال سے کیسی کیسی چیزیں چرا کے لائی تھی۔ آج بھی اس سے باز نہیں آئی ہے۔'' سرجیت نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کمینی سے کہو کہ میری دوا واپس کر دے۔۔۔ میری گولیوں کی شیشی مجھے واپس کر دے۔۔۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میرا دماغ سن ہو رہا ہے۔۔۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔'' سرجیت نے اپنے بالوں کو پیچھے کیا۔

سرجیت کی گالیاں اور اتنی ساری تیز و تند باتیں سننے کے باوجود کلدیپ کی متانت اور وقار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ سرجیت کو نفرت اور حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور غصے میں اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ ونود کو اس کے حسن و شباب نے بڑا متاثر کیا تھا۔ اس کا گداز جسم اور پیچ و خم قیامت کے تھے۔

''دوا کی گولیاں۔۔۔ کس بیماری کی دوا ہے یہ۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔'' کلدیپ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''اس کا نام شیشی کے لیبل پر لکھا ہوا ہے۔۔۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی۔'' سرجیت نے بگڑ کر جواب دیا۔

''دیدی پلیز!'' شیاما نے لجاجت سے پوچھا۔ ''ان باتوں کا کیا فائدہ۔۔۔ تم جانتی ہو۔''

''کیوں کہ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور اس لیے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔'' کلدیپ بولی۔ ''باپ کے سفید بالوں پر خاک کوئی نہیں ڈال سکتا۔۔۔ اسے اپنے باپ پر بھی رحم نہیں آتا اور نہ ہی

اس خاندان کی عزت کا کوئی خیال ہے۔ میں بلونت سے بھی سمجھ لوں گی۔ جو اسے یہ زہر لا کر دیتا ہے۔۔۔ تو بیچ میں مت بول شیاما!''

''دیدی۔۔۔! میں مر جاؤں گی۔'' سرجیت نے نرم پڑ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''صرف ایک گولی۔۔۔ اچھا ایک گولی۔''

ونود آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کلدیپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جیسے آتش فشاں تھی۔ وہ دہک رہی تھی۔ اس کی تپش اسے جیسے جھلسانے لگی۔ اس کے قریب سے لگا وہ بجلی بن کر گر رہی ہے۔

''کیا بات ہے۔۔۔۔'' کلدیپ نے چونک کر اسے گھورا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔

''کیا میں دیکھ سکتا ہوں کہ یہ کیا زہر ہے؟'' ونود نے اس کے گورے گورے خوب صورت اور گداز ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کلدیپ نے شیشی پیچھے کر لی۔ پھر اس کے چہرے پر سختی اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک سی کوندی تیز لہجے میں بولی۔

''آپ یہاں قتل کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔۔۔ ہمارے معاملات میں دخل دینے نہیں۔ اس بات کا خیال رکھیں۔''

''مجھے اوپر کی منزل پر قدم رکھتے ہی چرس کی بو محسوس ہوئی تھی۔'' ونود نے اس کے لہجے کی تیزی تندی اور کرخت آواز کو نظر انداز کر دیا۔ ایک لحظہ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آواز بھی اس کی طرح کتنی خوب صورت ہے۔ اگر شیریں گفتار کرے تو کانوں میں رس گھول دے۔ دل کو چھو لے۔ لیکن اس عورت کو کون سمجھائے۔ پھر اس نے پوچھا۔

''کون پیتا ہے چرس۔۔۔؟''

مگر یہ سوال اسے غیر ضروری سا لگا۔ سرجیت کی صورت اور صحت سے اس کے جرم کی ناقابل شہادت ملتی تھی۔

''میں۔۔۔ میں مجبور ہوں۔۔۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' سرجیت نے شرمساری سے کہا۔

''مجبور ہوں۔۔۔'' وہ سسک ہی پڑی۔

''اب میں دیکھتی ہوں کہ تو کیسی مجبور ہے۔۔۔ کیسے زندہ نہیں رہے گی۔'' کلدیپ نے سختی سے کہا۔ ''ایک دو دن تڑپے گی۔۔۔ چیخے چلائے گی۔۔۔ مکار۔۔۔ مگر میں اب تیرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گی۔۔۔ میں تجھے باتھ روم میں بند کر دوں گی۔۔۔ یہ منحوس عادت تجھے برباد کر رہی ہے۔''

''میری عادت تو مجھے ہی برباد کر رہی ہے نا۔۔۔'' سرجیت نے چیخ کر کہا۔ ''کسی کا گھر تو برباد نہیں کر رہی ہے۔۔۔ تو کیا کر رہی ہے فاحشہ۔۔۔ چھوٹی بہن کے منگیتر پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ تجھے روکنے والا کوئی نہیں۔''

کلدیپ کا ہاتھ گھوم کر پوری قوت سے سرجیت کے چہرے پر پڑا۔ وہ لڑکھڑائی، گری اور پھر کھڑی ہو گئی۔

''میری ساری گولیاں دے دے مجھے ذلیل۔۔۔ کمینی۔۔۔ چڑیل۔'' سرجیت وحشیانہ لہجے میں بولی۔ ''ورنہ میں تیرا شروع سے آخر تک کچا چٹھا کھول دوں گی۔۔۔ پڑھنے لندن گئی تو وہاں کیا گل کھلاتی رہی۔۔۔ صرف لڑکوں سے دوستی رکھی۔۔۔ سنا تو نے۔۔۔ میں سب کچھ بتا دوں گی۔۔۔ ورنہ مجھے شیشی واپس کر دے۔۔۔ یہاں بھی رنگ رلیاں منا رہی ہے۔۔۔ ایس پی صاحب۔۔۔! میں چرس بھرے سگریٹ پیتی ہوں۔۔۔ چرس مجھے میرا بھائی لا کر دیتا ہے۔۔۔ کالج میں میری ہم جماعت لڑکیوں نے جن کا تعلق اعلا گھرانوں سے تھا۔۔۔ وہ نشہ کرتی تھیں۔۔۔ مجھے سب سے پہلے انہوں نے ہی اس نعمت سے متعارف کرایا تھا۔۔۔ اب میں اس کی عادی ہو گئی ہوں۔۔۔ تو میرے اخلاق کی ٹھیکہ دار بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بس اپنا اخلاق اور کردار کسی طوائف سے نہیں۔۔۔ وہ سویرے سویرے گھوڑے پر سوار جنگل کے اندر کیوں جاتی ہے۔۔۔ کہتی ہے کہ مجھے سواری کا شوق ہے۔۔۔ یہ جنون ہے۔۔۔ مگر

والی ہے مہربان ہونے۔۔۔ اور پھر اسے شرم نہیں آئی کہ اپنی چھوٹی بہن کے منگیتر پر ڈورے ڈال کر ڈاکہ مار رہی ہے۔۔۔" وہ درمیان میں قہقہہ مار کے ہنسی "یہ سب مجھے پاگل سمجھتے اور کہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ خود ہی پاگل ہیں۔ مجھے ہر کسی کے بارے میں پتا ہے۔۔۔ کون کیا کرتا ہے۔۔۔ کیا گل کھلا رہا ہے۔۔۔ موج اڑا رہا ہے۔۔۔ یہ سب لوگ مجھے پاگل بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ میں ان سب کے بارے میں جانتی ہوں۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔۔۔ میں سچ بولنے کی ہمت رکھتی ہوں۔۔۔ لیکن میں کسی وجہ سے سچ ہرگز نہیں بولوں گی۔۔۔ بس مجھے میری گولیاں واپس کر دو۔۔۔ میری زبان بندی کر دو۔۔۔ ورنہ آئینہ دکھا دوں گی۔"

کلدیپ کا چہرہ سرخ ہو کر اور حسین دکھائی دینے لگی۔ اس نے گولیوں کی شیشی سرجیت کے ہاتھ پر رکھی اور پلٹ کر پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ راہ داری عبور کر کے نیچے اتر گئی۔ ونود نے پلٹ کر دیکھا تو شیاما غائب تھی۔

"سرجیت۔۔۔!" ونود نے ممی سے کہا۔ "کلدیپ کو تم غلط اور اپنا دشمن نہ سمجھو۔۔۔ وہ تمہارا بھلا چاہتی تھی۔"

وہ ہنسی۔۔۔ "میرا بھلا چاہتی تھی۔ نہیں جناب! کلدیپ نے کبھی اپنا بھلا نہیں چاہا۔۔۔ کسی اور کی بھلائی سے اسے کیا غرض۔۔۔ کیا واسطہ۔۔۔"

ونود کو وہ بات یاد آئی کہ جو اسے یہاں لانے سے قبل بتا دی گئی تھی کہ کلدیپ نے خود اپنے شوہر کو گولی مار دی تھی۔

"پھر بھی تمہیں یہ بری عادت ترک کر دینا چاہیے۔" ونود نے کہا۔ "کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ کہاں سے پڑی تھی یہ لت۔۔۔؟"

"کرائسٹ کالج میں بوبی تھا۔ اور راج کمار تھا، سنڈریلا تھی۔۔۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور خوابوں کے اعلا خاندانوں کے سپوت تھے۔" وہ یادِ ماضی میں کھو گئی تھی۔ ماضی حال بن کر اس کی نظروں کے سامنے آ کھڑا تھا۔

"بوبی مجھے بہت چاہتا تھا۔ اس کا باپ انڈین سول سروس کا اعلا ترین رکن تھا۔ بوبی کا پورا نام کنور بلبیر سنگھ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو۔ ہم سول میرج کر لیتے ہیں۔۔۔ لعنت بھیجو ان اونچی ناک والے بزرگوں کے غرور پر۔۔۔ یہ ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتے، میں جانتا ہوں کہ ان سے کیسے سامنا اور مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں کمزور نہیں ہوں۔۔۔ لیکن میں ڈر گئی تھی۔

سنڈریلا کے بوائے فرینڈ نے۔۔۔ اس کے بوائے فرینڈ نے محبت کے نام پر۔۔۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔۔۔ اس نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ کھلونا بنایا ہوا تھا کیوں کہ نشہ کا دھواں سنڈریلا کے لیے ناممکن تھا۔ وہ نشے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔۔۔ وہ سنڈریلا سے کہتا تھا کہ محبت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔ فراق اور جدائی۔۔۔ چوں کہ سنڈریلا کو نشے کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے وہ بڑی فیاضی سے اس پر مہربان ہوتی رہی تھی۔ میں تم سے سچی بات کیا چھپاؤں۔ بوبی بھی سنڈریلا کے بوائے فرینڈ کی طرح خود غرض اور بھونرا تھا۔۔۔ بوبی مجھے نشہ لا کر دیتا تو اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھاتا۔۔۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔۔۔ لیکن جب میں نے بوبی اور سنڈریلا کو غلاظت کے دلدل میں دیکھا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔ بوبی سے نفرت ہو گئی۔ سنڈریلا نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا بوائے فرینڈ کسی اور لڑکی سے دوستی کر کے فائدہ جوانی کا کھیل۔۔۔ کھیل رہا ہے۔ چوں کہ مجھے نشہ چاہیے تھا۔ اس لیے بوبی نے میری ضرورت اور کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ تم جانتی ہو کہ نشے کے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔"

سرجیت نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ اس کے سینے میں سانسوں کی تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا۔ ونود نے اسے خاموش پا کر کہا۔

''کیا تم اس عادت کو ترک نہیں کر سکتیں۔ اس لیے کہ تمہاری صحت اور گرتی رہی تو تم ایک دن مر جاؤ گی۔''

سرجیت قہقہہ لگا کر دوہری ہو گئی۔ ''میں مر جاؤں گی۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ کسے چاہیے یہ بے مصرف زندگی اور کسے دکھ ہو گا میرے نہ رہنے کا۔۔۔ ویسے بھی اس پاگل خانے میں سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔۔۔ ان کے لہو سے نفرت کی بو نہیں آتی تمہیں۔۔۔ یہ سب ایک دوسرے کو مار ڈالیں گے۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں بھاگ جاؤں۔۔۔ اس قید سے نکل جاؤں۔۔۔ کیا مزا آئے گا کہ جب سارے زمانے کو معلوم ہو گا کہ کنور وجے سنگھ کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔ ان کی کھوکھلی آبرو کا اونچا محل دھڑام سے گر جائے گا۔'' وہ توقف کر کے پھر ہنسی۔

''پھر میں نے سوچا کہ میں جاؤں گی کہاں۔۔۔ باہر کی دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں میرا کون ہے۔۔۔ وہاں بھی بھیڑیے رال ٹپکاتے پھر رہے ہیں۔۔۔ چنانچہ میں قید ہوں۔ تم نے دیکھا ہے نا۔۔۔ محسوس کیا ہے نا کہ قیدیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔''

''کلدیپ تمہاری دھمکی سے ڈر گئی تھی کیوں۔۔۔؟'' ونود نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے پوچھا۔

وہ آہستہ آہستہ خوف زدہ سی ہو کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگی جیسے ونود اسے خطرناک آدمی سا دکھائی دینے لگا ہو۔

''میں۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گی۔ تم پولیس والے ہو۔۔۔ کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟''

ونود نے اسے راہ داری کے آخری کمرے میں داخل ہو کے دروازہ بند کرتے دیکھا اور پلٹ کے وہ اپنے کمرے کی جانب چلنے لگا۔ اس کی پوزیشن بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ وہ اس گھر میں مہمان تو تھا مگر اس لیے کہ میزبان اسے کہیں اور جانے کی اجازت دینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ انہی قا
کے درمیان موجود تھا جو بہت چالاک اور با اثر ہو
کے علاوہ آن پر جان دینے یا لینے والے لوگ
انہوں نے اجتماعی طور پر قتل کی ذمہ داری قبول ک
تھی۔

یہ معمہ اس کے لیے حل طلب چھوڑ دیا تھا ک
اصل قاتل کا پتا لگا سکتا ہے تو مشروط طور پر اس
اجازت ہے۔ تیج پور آنے سے پہلے اس کا خیال
کہ قتل کی یہ تفتیش بھی صابطے کی کارروائی ہو گی۔ ج
میں وہی بیانات۔۔۔ جائے واردات کا معائنہ
سراغ کی جستجو کا سلسلہ ہو گا اور اسے متعلقہ وغیر متع
افراد سے حاصل ہونے والی گواہی سے قاتل کا
چل جائے گا۔ نہ چلا تو یہ کوئی انوکھی بات نہ ہو گی۔

ایسی تفتیش وہ کئی بار کر چکا تھا جس میں کام
اور ناکامی کا تناسب ففٹی ففٹی رہتا تھا۔۔۔ مگر ا
تفتیش کا دائرہ سمٹ کر چند افراد پر مشتمل ایک جا
دارانہ ذہنیت کے مالک خاندان تک محدود رہ گیا تھ
اور اس خاندان کو بھی گردشِ حالات روایات ا
اقدار سے انحراف کرنے والوں کے چیلنج کے معا
بدحالی کے اور سیاسی تبدیلی کے خلفشار میں مبتلا
تھا۔ وہ ذہنی طور پر انتشار کا شکار تھے اور اخلاقی طور
دیوالیہ ہو چکے تھے مگر اپنی شکست تسلیم نہیں کر
تھے۔ خاندان کے اس کھوکھلے تماشے نے ان کو مضح
خیز ہی نہیں بلکہ قابلِ رحم بنا دیا تھا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو اسے
یقین نہیں آیا۔ شیاما بستر پر الٹی پڑی تھی۔

چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے زار و قط
روتی نظر آئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی
ہوئی تھی۔

سرجیت نے اس کے منگیتر اور اس کی بہن
بارے میں جو دل شکن اور دل آزار باتیں کی تھیں
ونود کے لیے یہ طے کرنا بھی مشکل تھا کہ دل آزار
سبب جھوٹ تھا یا سچ۔۔۔

کلدیپ میں جو بے پناہ کشش اور جاذ

ان کے نشیب و فراز جو توبہ شکن تھے وہ ہر مرد کو ... متوجہ اور اسیر کر سکتے تھے۔ وہ اس پر مہربان ... شیاما سے اس کا تعلق توڑ سکتی تھی۔ لیکن یہ کوئی ... بھی نہیں تھا ہر مرد کلدیپ کی طرف جھک ... شیاما کا منگیتر ضروری نہیں تھا کہ وہ شیاما کی ... کلدیپ سے دل بہلائے۔۔۔ سرجیت کے اس الزام میں اسے بظاہر یقین نہیں آیا۔ وہ دونوں شاید ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہوں گے۔

تاہم ان فضول باتوں اور سرجیت کے بے سروپا الزامات سے ہٹ کر اخلاقی طور پر اس کا یہ فرض تھا کہ وہ شیاما کی دل جوئی کرے۔۔۔ دلاسا دے اور سمجھائے کہ سرجیت کے بے سروپا باتوں کو دل پر نہ لے۔ اس نے جو کلدیپ سے بکواس اور بے ربط باتیں کیں وہ کلدیپ کو تپانے کے لیے تھیں تاکہ اسے گولیوں کی شیشی واپس کر دے۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شیاما کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بالوں کے گداز اور ریشمی سے لمس نے ونود کو بڑا لطیف سی مسرت کی سنسنی بخش کیفیت کا انوکھا احساس عطا کیا۔

''شیاما۔۔۔! پلیز۔۔۔! دیکھو مجھے معلوم ہے کہ سرجیت ہوش میں نہیں تھی اور اس کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ وہ کیوں کلدیپ کے خلاف زہر افشانی کر رہی تھی۔۔۔ اس کا ہدف تم نہیں تھیں۔۔۔ اور اگر اس کی بات کا برا مانتی تو شاید اس کا سر پھوڑ دیتی۔۔۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ نشے کے ٹوٹنے سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ قابو میں نہیں رہتا۔ تم تو سمجھدار ہو۔۔۔ پھر یہ رونا کیسا؟''

بمشکل تمام وہ شیاما کو یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ اس کی دونوں بڑی بہنوں، بھائی اور باپ کے جارحانہ اور احمقانہ رویے کے باوجود وہ اس کی عزت کو اپنی فرض شناسی سے اہم تر سمجھتا ہے۔ جو کچھ بھی اسے معلوم ہوا ہے یا ہوگا۔۔۔ وہ کسی اور کو معلوم نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو راز رکھے گا۔

اور پھر قتل کے مسئلے پر بھی وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گا جس سے ان کی رسوائی کا تماشا بن سکے۔

آہستہ آہستہ شیاما کے ہسٹریائی کیفیت کی شدت میں کمی آنے لگی اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھمنے لگے۔

بالآخر وہ پرسکون ہو کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں نہ جانے کون کس وقت کافی رکھ گیا تھا۔۔۔ مگر اب کافی پینے کا وقت نہ تھا اور نہ ہی موڈ۔۔۔ اس نے شیاما سے وعدہ کیا کہ کھانے کی میز پر کسی ناخوشگوار ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرے گا اور کسی بھی بات کا برا نہیں مانے گا۔ کیوں کہ وہ سب کی فطرت کو سمجھ چکا ہے۔

''معافی تو مجھے۔۔۔ مجھے مانگنی چاہیے ونود۔''

شیاما رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں نے تمہیں آزمائش اور پریشانی اور اذیت میں مبتلا کیا۔ لیکن میں کیا کرتی۔۔۔ میں مجبور تھی۔۔۔ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔'' اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ پھر وہ اپنی لانبی پلکیں جھپکا کر بولی۔ ''تم مجھ پر خفا ہو نا۔۔۔؟''

''خفا ہوں تو نہیں۔۔۔ البتہ تھا۔'' ونود نے جواب دیا۔ ''اب تو حقیقت یہ ہے کہ اب تک تو میں موجود ہوں تو محض آپ کے خیال سے۔۔۔''

اس بات کا غلط مطلب نکال کے شیاما مسکرائی تو ونود کو اپنے جھوٹ پر شرمندگی کے بجائے خوشی ہوئی۔

شیاما کے جانے کے بعد وہ سگریٹ سلگائے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ صورت حال واقعی بہت پیچیدہ تھی۔ قاتل اسی گھر میں موجود تھا اور اسے فیصلہ کرنا تھا کہ فرض کے تقاضوں کو اہمیت دے یا مجبوریوں کو۔۔۔

ایک مجبوری یہ تھی کہ وہ شیاما کو پسند کرنے لگا تھا لیکن وہ پسند کو چاہت یا محبت کا رنگ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ شیاما کسی کی محبت تھی۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ ایک لڑکی ہونے کے ناتے اپنے منگیتر سے محبت اور جذباتی لگاؤ ایک فطری امر تھا۔ اسے وہ ایک مخلص دوست کی طرح پسند کرنے لگا تھا۔

حالاں کہ حالات اور واقعات کی شہادت سے

مشتبہ افراد میں سرفہرست یہی تین لڑکیاں تھیں۔

جن میں سے کسی ایک نے اپنی لپ اسٹک سے لاش کے ساتھ دخل در معقولات کے انجام کی وارننگ چھوڑی تھی۔

لپ اسٹک اس گاؤں میں بھلا کون استعمال کرتا ہوگا۔۔۔ اور لپ اسٹک کے شیڈ سے بھی کیا معلوم ہوسکتا ہے۔

ہر جگہ وہی ہوتے ہیں۔۔۔ ان امکانات کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی نے عمداً لپ اسٹک استعمال کر کے ان لڑکیوں کی پوزیشن مشتبہ بنادی۔۔۔ یا پھر ایک بہن نے دوسری بہن کے خلاف نفرت کے ردعمل کا عملی اظہار کیا۔

گھوم پھر کے اس کا شک سرجیت یا کلدیپ پر جاتا تھا۔

کلدیپ اپنے کردار کے پیش نظر قتل کرنے کی اہل تھی تو۔۔۔ سرجیت پاگل نظر آنے اور بننے کے باوجود اتنی سیانی تھی کہ کلدیپ ایک داستان ماضی کے باعث مجرم بن سکتی تھی۔

اس سے بھی بڑھ کر انا کا وہ مسئلہ تھا جس نے پورے خاندان کو اس بحران سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہم خیال اور متحد کر دیا تھا۔ اور وہ سب مل کر قتل کے ذمے دار بھی ہو سکتے تھے اور قتل کے الزام سے اپنے آپ کو بچا بھی سکتے تھے۔

وہ اپنی غیر موجودگی اس گاؤں سے بھی باہر ثابت کر سکتے تھے۔ جیسا کہ کلدیپ نے اپنے شوہر کو قتل کیا تو اس کی موجودگی حویلی میں ظاہر کی گئی تھی۔ گواہوں کی بڑی تعداد سے کلدیپ بچ گئی تھی۔

اس حد تک شیاما بھی ان کے ساتھ تھی تو واقعی اس کی یہ مجبوری تھی۔۔۔ لیکن اس کے شریک جرم ہونے کا خیال ونود کے لیے ناقابل قبول ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دلدل میں اتر گیا تھا جس سے نکلنا اب اس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ''خیر اس نے اپنے آپ سے کہا۔'' یہ آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے تو یوں ہی سہی۔۔۔ صبح وہ حوالدار سے ملے گا اور پھر تفتیش کا آغاز باقاعدہ کرے گا۔

کھانے کی میز پر وہ سب اکٹھے ہوئے تو ونود یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں سے کسی کی صورت پر ان واقعات کے ناخوشگوار اثرات کا سایہ تک نہیں تھا۔ وہ سب نارمل تھے۔ مسکرا رہے تھے اور میزبانی کے آداب کو پوری طرح نبھانے کے لیے کوشاں تھے اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وجے سنگھ بہت کم بولتا تھا اور ذہنی طور پر غیر حاضر نظر آیا تھا لیکن کسی بات پر اچانک قہقہہ مارتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں اور کان سب کچھ سن رہے ہیں اور وہ کسی بات اور کسی کے حرکات وسکنات سے غافل نہیں لگتا تھا۔

کھانے کی میز پر اس کا تعارف ایک اجنبی سے بھی کرایا گیا۔ پینتیس سے چالیس برس کی درمیانی عمر کا آدمی جو جوان اور بے حد صحت مند بھی تھا جس کی شخصیت میں وجاہت اور جامہ زیبی نے دل کشی پیدا کر دی۔ وہ بڑے سلیقے کے کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کا رویہ بھی انتہائی مہذب تھا۔ لیکن ونود کو یوں لگا جیسے اس کے انداز واطوار میں تصنع ہے۔ یہ شائستگی فطری نہیں اور اس پرکشش صورت پر ایک نقاب ہے جس کے نیچے بالکل مختلف چہرہ ہے جو اس کا جانا پہچانا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اعلا ترین شخصیت ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ وہ اندر سے کھوکھلا تھا۔

اس نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔ ونود کو بتایا گیا کہ وہ منیجر ہے اور کنور وجے سنگھ کا سیکریٹری بھی۔۔۔ لیکن اس کی شیاما میں دل چسپی اور شیاما کی حیا سے جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر ونود کو کچھ اور شبہ ہوا۔ پھر بے خیالی میں یا عمداً سرجیت نے اسے بھائی جی کہہ کے مخاطب کیا اور کلدیپ کور نے مسکرا کے اسے ٹوکا تو ونود کو یقین آ گیا کہ چندر سنگھ شیاما کا وہ منگیتر بھی ہے جس کے بارے میں سرجیت نے نہ صرف افسوسناک بلکہ شرمناک تبصرے کیے تھے اور پھر کلدیپ کور پر الزام عائد کیا

تھا کہ وہ اس پر ڈورے ڈال رہی ہے۔

بلاشبہ کلدیپ کور ایک ایسی عورت تھی جو سب کچھ کرسکتی تھی۔ مگر تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بج سکتی اور ڈورے ڈالنے کا الزام اس صورت میں درست ہو سکتا تھا جب خود چندر سنگھ نے کلدیپ کور کو مواقع فراہم کیے ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں چندر سنگھ کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی اور بہرحال یہ ونود کا دردسر بھی نہیں تھا کہ ایک بھائی اپنی بہن کو چرس کیوں لا کے دیتا ہے اور کنور وجے سنگھ جانتے بوجھتے انجان بنتے ہیں۔ فائدہ نظر آتا ہے یا واقعی انہیں کچھ خبر نہیں۔۔۔ اسے تو کلدیپ اور چندر سنگھ کے رومانس اور تعلقات سے بھی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ وہ صرف قتل کی تفتیش کرنے آیا تھا مگر چندر سنگھ کا شیاما کو یوں ٹکٹکی باندھ کے دیکھنا اسے اچھا نہیں لگا۔ کئی بار اسے یہ احساس بھی ہوا کہ چندر سنگھ اسے غور سے اس طرح دیکھ رہا ہیں جیسے اس کے ارادے اور عزائم کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بشرے پر اس کے احساسات اور خیالات کو پڑھنا چاہتا ہے کہ کہیں رقیب تو نہیں ثابت ہوگا اور مہمان بن کے میزبان کے اعتماد کی شکست کے درپے تو نہیں ہوگا۔

ونود نے کھانا ختم ہوتے ہی ایک لمحہ بھی بیٹھنا گوارا نہیں کیا اور معذرت کی اور آرام کرنے کے بجائے اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

☆☆☆

وہ غسل خانے میں تھا جب اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ دروازے کو احتیاط اور غیر محسوس انداز سے کھولنے کے باوجود کھٹکے کی ہلکی سی آواز ونود کے کان تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے غسل خانے کے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ شیاما کا منگیتر اور کنور وجے سنگھ کا منیجر چندر سنگھ اس کے سوٹ کیس کے قریب بیٹھا کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ونود نے صابن لگے جسم پر تولیا لپیٹا اور باہر آ گیا۔ چندر سنگھ فرش پر لیٹا اپنی کارروائی میں مصروف رہا۔ اسے ونود کے غسل خانے سے نکل کر اپنے پیچھے آ جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

''منیجر صاحب۔۔۔!'' ونود نے کہا۔ ''کیا مہمانوں کے سامان کی تلاشی لینا بھی آپ کے انتظامی فرائض میں شامل ہے؟''

چندر سنگھ چونک کے اٹھا اور ایڑیوں پر گھوم گیا۔ ونود کا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور ریوالور کا رخ ونود کے سینے کی طرف تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' ونود نے تیز و تند لہجے میں کہا۔ ''اگر گولی چل گئی تو میں اس مضحکہ حالت میں مارا جاؤں گا۔''

چندر سنگھ کے منجمد چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے ریوالور نیچے کرلیا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ دراصل میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔۔۔ تولیا۔۔۔ شیونگ کریم اور بلیڈ۔۔۔''

''اول تو میں یہ ساری چیزیں ساتھ رکھتا ہوں اور نہ ہوں تو مانگنے کے بجائے خریدنا پسند کرتا ہوں۔'' ونود نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ تھینک یو مسٹر چندر سنگھ۔۔۔! اب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے ریوالور کیوں اٹھایا تھا؟''

''اٹھایا نہیں تھا۔۔۔ ہاتھ میں آ گیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''آپ نے اچانک پیچھے آ کے سوال کیا تو میں۔۔۔ بس ایک فطری ردعمل تھا کہ میں ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔'' اس نے رومال سے ریوالور کو صاف کیا اور واپس سوٹ کیس میں ڈال دیا۔

''آپ بہت احتیاط پسند آدمی ہیں مسٹر چندر سنگھ۔'' ونود نے کہا۔

''حالات کا تقاضا ہے ایس پی صاحب۔'' وہ بولا۔ ''کل کلاں کو کسی نے ریوالور سے کوئی قتل کر دیا اور میرے فنگر پرنٹ مل گئے تو میں خوامخواہ پھنس جاؤں گا۔ آپ بھی احتیاط پسند ہوتے تو کھلے سوٹ کیس میں ریوالور یوں چھوڑ کے نہ جاتے۔''

ونود کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چندر سنگھ نے غلط نہیں کیا تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ اچھا دو منٹ بیٹھو مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

پھر وہ مڑ کے غسل خانے میں گھس گیا اور پانچ منٹ بعد کپڑے بدل کے نکل آیا۔ چندر سنگھ نہایت اطمینان سے صوفے پر بیٹھا سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ ایک خادم اندر آیا اور کافی کی ٹرے رکھ گیا جو شاید چندر سنگھ نے طلب کی تھی۔

''تم اس گھر میں رہتے ہو۔۔۔'' ونود نے کہا۔

''گھر کے حالات سے زیادہ باخبر ہو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ ان لوگوں کا قتل سے کیا تعلق ہے۔ یہ باضابطہ تفتیش نہیں ہے اور تمہارا بیان ریکارڈ پر نہیں رہے گا۔ یہ ایک طرح سے تبادلہ خیال اور رسمی بات ہے۔''

''یہ آپ نے اچھا کیا کہ بات صاف کردی۔'' چندر سنگھ بولا۔ ''اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ تھانے دار کے قتل میں اس گھر کا کوئی فرد ملوث ہے شنکر نام کے ایک مخبوط الحواس اور نشے کے عادی شخص نے لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ شنکر ساٹھ ستر سال کا لاوارث اور بے گھر آدمی ہے۔ بیوی اور پھر جوان بیٹے کی حادثاتی موت کے بعد اس کا کوئی نہیں رہا اور اس کا ذہن صدمے سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ نشہ کرنے لگا اور اس نے گھر کو بھی چھوڑ دیا۔ بعد میں اس کے گھر کو گرا کے وہ گردوارہ تعمیر کیا گیا جو کنور وجے سنگھ کے پتا جی کی سمادھی ہے اور اس جسمے کے بالکل ساتھ ہے جہاں تھانے دار کی لاش لٹکی ہوئی تھی۔ شنکر وہیں ایک بنچ پر سوتا ہے جہاں پہلے اس کا گھر تھا۔ چنانچہ صبح آنکھ کھلتے ہی لاش اس نے دیکھی اور تھانے میں اطلاع دینے چلا گیا۔ کلدیپ کور ہر صبح شہسواری کے لیے جاتی ہے۔ اس نے مجمع دیکھا تو رک گئی اور لاش کو زبردستی وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہوگئی۔ واپس آکے اس نے اپنے پاپا کو بتایا اور پاپا نے تحصیل میں کسی سے رابطہ قائم کیا لیکن مقامی سطح پر تفتیش کے بعد معاملہ دبانے کی کوشش ناکام رہی۔ کسی نے انتظامیہ کو فون پر بتایا کہ کنور وجے سنگھ کا خاندان جو اپنے اثر و رسوخ سے پہلے بھی ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ہے اس قتل کو بھی نامعلوم قاتلوں سے منسوب کر کے داخل دفتر کرا دے گا۔ نتیجہ یہ کہ تفتیش اور یعنی آپ کے سپرد ہوئی۔ یہاں خاندان کی کابینہ کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں صورت حال کو سنگین قرار دیتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ شیاما کو خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر آپ کے استقبال کے لیے بھیجا گیا۔ اصل اغراض و مقاصد کچھ اور تھے۔''

''وہ سب مجھے معلوم ہے۔۔۔ شیاما نے سب مجھے بتا دیا ہے۔'' ونود نے کہا۔

''ان لوگوں کے لیے خاندان کی آن کا مسئلہ دنیا کے تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے۔'' چندر سنگھ کہنے لگا۔ ''چنانچہ ہر قسم کی رشوت سے قاتل کو بچانے اور بصورت دیگر افشائے راز کے خطرے سے نمٹنے کو جائز قرار دیا گیا۔ پچاس ہزار کی رقم اس وقت خرچ کر دینا بہتر تھا بجائے گرفتاری، مقدمے بازی، وکیل کی فیس اور قانونی اخراجات میں اتنی ہی رقم خرچ کرنے سے۔۔۔ اور اس طرح رسوائی سے بھی بچا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ اس بات سے بھی ڈرتے تھے کہ عدالت میں مقدمے کے دوران دوسرے معاملات نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ جس پر اب تک پردہ ڈالنے میں بھی کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔۔۔ مثلاً کنور وجے سنگھ کے بھائی کی پراسرار موت جو ندی میں ڈوب کے مرا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سی باتیں ہیں جو منہ پر کوئی نہیں کہتا لیکن بعض عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر کہہ سکتے ہیں۔''

''اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ تفتیش کے لیے میرے آنے پر خوف زدہ بلکہ کچھ بدحواس ہیں۔'' ونود نے کہا۔ ''اور یہ سب باتیں تو مجھے پتا چل ہی گئی تھیں۔ لیکن میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں جو مجھے کسی وجہ سے نہیں بتائی گئی۔''

چندر سنگھ بڑی شائستگی سے ہنستے ہوئے کہنے

''تھانے دار کے بارے میں ایک بات سب ہی جانتے ہیں کہ کنور وجے سنگھ کو اپنے علاقے پر اپنی حاکمیت میں اس کا دخل در معقولات پسند نہیں تھا۔ انہوں نے تھانے کے قیام کی سختی سے مخالفت بھی کی تھی اور تھانے دار کو پہلے دن بلوا کے بری طرح جھاڑا بھی تھا کہ اپنی اوقات نہیں بھولنا۔ وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا تھا جس کا کنور وجے سنگھ نے بہت برا منایا جیسے تھانے دار نے ان کی بات اور دھمکی کا کوئی اثر نہیں لیا اور اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ لیکن اس طرح تھانے دار اور حاکم کے درمیان ایک سرد جنگ چھڑ گئی۔ قتل سے دو دن پہلے وہ یہاں آیا تھا اور اس نے کنور وجے سنگھ سے ان کے بھائی کی موت کے متعلق کچھ دریافت کیا تھا اور ان کی خاصی گرما گرمی ہوئی تھی۔ کنور صاحب نے بھی اس ملاقات کے دوران تھانے دار کو گالیاں دی تھیں اور اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ ان کا ملازم یا مزارع نہیں۔۔۔ وہ انہیں تھانے میں بھی بلوا سکتا ہے۔ ایک پولیس افسر کو اتنا کمزور اور تابع نہ سمجھو پھر اس نے تھانے دار کی بے عزتی کی اور اسے دھکے دے کر نکال دیا۔

اس نے شاید حاکم ضلع سے اس رویے کی فریاد کی ہو گی تو اسے اندازہ ہوا ہو گا کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جاسکتا۔ تاہم اس نے اپنے طور پر لوگوں سے پوچھ گچھ جاری رکھی اور اس جگہ بھی گیا جہاں سے کنور مہندر سنگھ کی لاش ملی تھی۔ اس کی سرگرمی اور مصروفیات کی خبریں برابر کنور وجے سنگھ کو مل رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ عاقبت نااندیش تھا۔ اگر وہ محاذ آرائی کے بجائے مفاہمت سے کام لیتا تو مارا نہ جاتا۔ ونود نے اس کا بیان بڑی دل چسپی اور نہایت غور سے سنا تھا۔ لیکن اسے کوئی بات کھٹک رہی تھی لیکن اس نے اس بات کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ چندر سنگھ کے خاموش ہوتے ہی اس نے بریف کیس میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کے دیکھا۔ اس کے چیمبر میں ایک گولی کم تھی۔ نال کو سونگھ کر دیکھتے ہی ونود کو اندازہ ہو گیا کہ یہ گولی ابھی ابھی چلائی گئی ہے۔ بارود کی بو بہت نمایاں تھی۔ اس نے ریوالور کا رخ پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ چندر سنگھ کی طرف کیا پھر اس نے بغیر کسی تذبذب اور جھجک کے کہا۔

''مسٹر منیجر۔۔۔! یہ ٹھیک ہے کہ میں ذرا دیر سے سمجھا مگر کئی اوقات دیر آید درست آید والا نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ میں فوراً سمجھ جاتا تو شاید اس وقت مارا جاتا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس میں ایک گولی کم کیوں ہے؟ جب میں نہا رہا تھا تو کسی نے میرا ریوالور نکالا اور ایک گولی چلائی سائیلنسر لگا کے۔۔۔ چنانچہ میں آواز نہ سن سکا۔ غسل خانے میں شاور کی آواز بھی تھی۔ میں کچھ گا بھی رہا تھا اور دروازہ بند تھا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تو یہی سمجھا کہ تم ریوالور نکال رہے ہو حقیقت اس کے برعکس تھی۔ تم ریوالور رکھ رہے تھے۔ یہ گولی کس پر چلائی گئی ہے چندر سنگھ۔'' چندر سنگھ کا رنگ اڑ گیا اور اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ کسی مردے کی طرح دکھائی دینے لگا۔ وہ صوفے کے بازو پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے بیٹھا رہا اور ونود کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے جان تھی۔ ویران قبر میں اترنے والی چاندنی کی طرح۔۔۔ پلاسٹک کے پھولوں کی طرح۔۔۔ وہ بولا تو اس کی آواز کسی خالی کنوئیں سے آتی سنائی دی۔

''میں کیا بتا سکتا ہوں ایس پی صاحب!'' آواز گلے میں پھنسنے لگی تو وہ کھنکار کے بولا۔ ''اچھا جو بتانا چاہتا تھا بتا دیا اب میں چلتا ہوں۔''

''ایسے نہیں چندر سنگھ!'' ونود فوراً ہی اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ''مجھے میرے سوال کا جواب دیے بغیر تم کیسے جاسکتے ہو؟''

چندر سنگھ کی نظریں منجمد ہو گئیں۔ یہ احساس کہ وہ ونود کو نہیں بلکہ اس کے پیچھے کسی کو دیکھ رہا ہے، ونود کو اس وقت ہوا جب سر پر ہونے والے وار نے اسے چکرا دیا۔ اس کی نظروں کے سامنے یک لخت اندھیرا

پھیل گیا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور اس کی ٹانگیں جسم کے بوجھ سے کانپنے لگیں۔ کمرا اس طرح گھومتا لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ پھر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ پھر وہ ریوالور سمیت فرش پر گر گیا۔

بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں لوٹنے کا وقفہ زیادہ نہیں تھا۔

جب ونود نے آنکھیں کھولیں تو اسے ماحول کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ اس نے اٹھنے سے پہلے اس تبدیلی پر غور کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ کمرے میں قالین پر وہیں لیٹا ہے جہاں گرا تھا۔ ریوالور بدستور اس کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کے قریب ہی کوئی اور بھی دراز ہے۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے بلونت سنگھ عرف بلی کی کھلی آنکھیں اپنی طرف مرتکز نظر آئیں۔ ونود کے سر کی چوٹ کا اثر باقی تھا۔ مگر اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ بیٹھ سکے۔ بلونت سنگھ لیٹا پڑا تھا اور اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ پیشانی کے وسط میں گولی کے سوراخ سے نکلنے والا خون دونوں کنپٹی تک بہہ کر سرخ لکیریں سی بنا رہا تھا۔ اس کے سر کے پیچھے دیوار پر پلستر اکھڑ گیا تھا۔ شاید گول سوراخ کرنے کے بعد سر کے اوپر والے حصے سے نکل کر دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ ونود نے حیرانی سے اس ریوالور کو دیکھا جو اس کے ہاتھ میں تھا اور پھر بلونت کی لاش کو دیکھا اور پھر اس جگہ کو دیکھا جہاں چندر سنگھ کھڑا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے سر پر پیچھے سے کوئی چیز مارنے والا بھی غائب تھا اور کمرے میں وہ تھا یا ایک لاش تھی جس کے بارے میں وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اسے گولی مارنے والا وہ خود نہیں ہے۔

اچانک کسی کے استہزائیہ انداز سے ہنسنے کی آواز پر وہ چونک کے پلٹا۔

''مار دیا اسے تم نے۔۔۔'' سرجیت کھل کھلا کے ہنسی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور نشے سے اس کی آواز بھی ڈول رہی تھی۔ ''اچھا کیا۔۔۔ بہادر آدمی ہو تم۔۔۔ ہیرو ہو۔۔۔ تم نے کنور وجے سنگھ کے جانشین کو زیر کر دیا۔۔۔ تم نے بلی کو مارا تھا نا۔۔۔ اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب یا تو وہ بے عزت ہو کر جی سکتا تھا جو اس کے لیے مشکل تھا۔۔۔ بالکل ناممکن۔۔۔ یا یہی کر سکتا تھا جو اس نے کیا۔ کہ مار دے یا پھر مر جائے۔ اس کی قسمت کے وہ مارنے آیا اور مارا گیا۔۔۔ وہ خالی تھا نا۔۔۔ بے وقوف۔۔۔''

''بکواس بند کرو، میں نے نہیں مارا۔۔۔ یہ سازش ہے تم سب کی۔''

سرجیت نے نفی میں سر ہلایا اور لمحاتی توقف سے کہنے لگی۔

''میں خوش ہوں۔۔۔ بلی کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اس کا وجود ہمارے درمیان کسی ناسور کی طرح تھا۔۔۔ لیکن ہم اسے کاٹ کے نہیں پھینک سکتے تھے۔۔۔ ہم اس ناسور پر بھی کسی کو نفرت اور حقارت سے ہنستا نہیں دیکھ سکتے تھے۔۔۔ ہائے کیسی مجبوری تھی۔۔۔'' پھر وہ اس کے قریب آ گئی۔

''تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔۔۔ میرا ایک چچا تھا۔ کنور مہدر سنگھ۔۔۔ میرے باپ کا چھوٹا بھائی۔۔۔ جیسے اس نے اسے بیٹوں کی طرح پالا اور پڑھایا تھا۔۔۔ ونڈر فل مین۔۔۔ اسے بلی نے قتل کیا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔۔۔ لوگ تو باتیں کرتے ہیں۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا۔۔۔ لیکن، لیکن جب میں نے یہ بات ان سے کہی تھی۔۔۔ ان سے جو یہاں رہتے ہیں۔۔۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔۔۔ تم پاگل ہو۔۔۔ ہم تمہیں پاگل خانہ میں داخل کرا دیں گے۔۔۔ میں ڈر گئی تھی کیوں کہ میں نے پاگل خانہ دیکھا ہے۔۔۔ پھر میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ پاپا نے کہا تھا۔۔۔ جو یہ بات اگر کسی کو معلوم ہوئی تو ہمارا سب کچھ چھن جائے گا۔۔۔ ہم فاقے کریں گے اور سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔۔۔ میری مانتا ہی نہیں کوئی۔۔۔ وہ سب ایک طرف تھے۔۔۔ وہ مجھے جھوٹا

کہہ سکتے اور خود سچے بن سکتے تھے۔'' وہ ونود کے اور قریب آ گئی۔ اب وہ اس سے ایک قدم سے کم فاصلے پر کھڑی تھی۔

''تم نے یہ بات کیوں بتائی ہے۔۔۔ کیا اب تمہیں ڈر نہیں لگ رہا کہ تمہیں پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا۔'' وہ بولا۔

سرجیت ہنسی۔ ''اب تم یہاں ہو۔۔۔ اور تم کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہو۔۔۔ ایس پی ہو۔۔۔ کیا تم مجھے نہیں بچاؤ گے۔۔۔ بولو۔۔۔؟''

''اچھا۔۔۔ مجھے تم پوری بات بتاؤ۔۔۔ کیا دیکھا تھا تم نے۔۔۔'' ونود نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے اعتماد میں لے کر بہت کچھ آسانی سے معلوم کر سکتا تھا۔

''لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ۔۔۔ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں۔'' اس کے قدم نشے میں ڈگمگا رہے تھے۔

''تم۔۔۔ تم بہت اچھی ہو۔۔۔ بہت خوب صورت ہو۔'' ونود نے دل پر جبر کر کے کہا۔

''دیدی کلدیپ سے بھی زیادہ۔۔۔ شیاما سے بھی زیادہ۔۔۔؟'' وہ اٹھلا کے بولی۔

''ہاں۔۔۔ ان دونوں سے کہیں زیادہ۔'' ونود نے اسے فوراً سنبھال لیا۔ ورنہ وہ گر جاتی۔ ''اب بتاؤ۔''

اس کا جملہ نامکمل رہ گیا۔ دروازہ دھماکے سے کھلا اور روشنی کا ایک کوندا لپکا جس نے ونود کو وقتی طور پر اندھا کر دیا۔ جب وہ سرجیت کو چھوڑ کے الگ ہوا تو اسے دروازے میں کلدیپ دکھائی دی۔ کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ فلیش لائٹ کے جل کر خراب ہو جانے والے بلب کو نکال رہی تھی۔ ونود کا وجود مفلوج ہو کے پتھر ہو گیا۔

''واہ۔۔۔ ایس پی صاحب!'' کلدیپ کور نے طنزیہ لہجے میں اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیسی تصویر آئی ہو گی۔۔۔ ایک ہاتھ میں ریوالور دوسرے ہاتھ ایک لڑکی کی مرمریں اور گداز اور لچک دار کمر کے گرد جو ساڑی اور بلاؤز کے درمیان۔۔۔ لڑکی کی بغیر آستینوں کے بلاؤز میں عریاں، سڈول اور سنگ مرمر جیسی عریاں باہیں۔۔۔ آپ کے گلے میں۔۔۔ انتہائی رومانی اور جذباتی منظر۔۔۔ اور دوسری طرف غیرت مند بھائی کی لاش جو خون آلود ہے فرش پر پڑی ہے جس نے شاید اس رومانی ہیجان خیز منظر میں کسی ولن کی طرح مداخلت کی ہو گی۔۔۔ ہم اسے فریم کرا لیں گے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔۔۔ یہ کسی انگلش فلم کا سنسنی خیز منظر ہے نا۔'' وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح بل کھا کے ہنسی۔

ونود نے آہستہ آہستہ ریوالور اٹھایا اور سنبھل کے بولا۔

''تم نے سب غلط اندازہ لگایا کلدیپ کور۔۔۔! کہ میں تم سب کے جال میں ایسے گرفتار ہو گیا ہوں جیسے مکڑی کے جال میں مکھی آ پھنستی ہے۔ میں سمجھا تھا یہ مہذب اور شائستہ گھرانہ ہے اور واقعی یہاں عزت دار لوگ رہتے ہیں۔ مگر یہاں جسے عزت سمجھا جاتا ہے وہ ایک پردہ ہے جو تم سب نے اپنے مکروہ چہروں پر ڈال رکھا ہے۔۔۔ تم بے غیرت اور بے عزت اور بے ضمیر لوگ ہو۔۔۔ خونی اور قاتل۔۔۔ نشے کے عادی ہو اور اخلاقی طور پر دیوالیہ۔۔۔ جہاں عورتیں طوائف سے بدتر کردار کی مالک ہیں اور مرد شیطان۔۔۔ تم نے سازش کا بہت اچھا جال پھیلایا تھا مگر میں اس میں گرفتار ہونے پر موت کو ترجیح دوں گا۔۔۔ کیوں کہ معاشرے میں میری واقعی عزت ہے۔۔۔ ایک مقام بھی ہے۔۔۔ میں تمہیں گولی مارنے کا اختیار بھی رکھتا ہوں۔۔۔ یہ کیمرا مجھے دے دو کلدیپ۔۔۔ میں تمہیں یہ موقع ہرگز نہیں دوں گا کہ تم مجھے بلیک میل کر سکو۔۔۔ اس لیے بھی کہ میں ایک پولیس افسر ہوں جو اس کا توڑ جانتا ہے۔''

کلدیپ نے تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور قہقہہ مار کے ہنسی۔

''آپ اس ریوالور پر اکڑ رہے ہو۔۔۔

گولی چلاؤ اگر چلا سکتے ہو۔۔۔ ریوالور میں گولی کہاں ہے ایس پی صاحب۔۔۔! جب آپ بے ہوش پڑے ہوئے تھے نا ہم نے آپ کا ہاتھ تھام کے ریوالور کی سب گولیاں چلا دی تھیں۔۔۔ ان کے نشانات آپ کو دیوار پر ملیں گے۔۔۔ یا پھر اس لاش پر۔۔۔ آپ تو ایک سمجھ دار پولیس آفیسر ہیں۔۔۔ ذرا سوچیے کہ قانونی طور پر آپ کی کیا پوزیشن ہے۔۔۔ اگر تجزیہ کیا گیا تو کیا ثابت ہوگا۔۔۔ گولیاں آپ کے ریوالور کی ہیں اور آپ کے ہی ہاتھ سے چلائی گئی ہیں۔۔۔ بارود کے ذرات تو آپ کے ہاتھ پر مل جائیں گے۔۔۔ غالباً اسے پیرافین ٹیسٹ کہتے ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ یہ تصویر ہوگی۔''

ونود نے بے یقینی سے اس آتشیں کھلونے کو دیکھا۔ اس نے کلدیپ کی بات کو غلط جان کر چار بار فائر کیا مگر ٹریگر کی خالی آواز پر وہ ہنسنے لگی۔ ونود نے ریوالور کو یوں دیکھا جیسے سیزر نے بروٹس کو دیکھا تھا اور کہا تھا۔

''بروٹس۔۔۔ تم بھی۔۔۔ سب دغا دے ہی رہے ہیں۔۔۔ تم بھی دغاباز ہو گئے۔۔۔''

ونود کچھ دیر شکست خوردہ سا کھڑا رہا۔ کلدیپ اس سے دور تھی ورنہ وہ اسے دبوچ کے قابو میں کر لیتا اور بے بس کر کے کیمرا چھین لیتا۔ کلدیپ نے ایک چہرہ شناس کی طرح اس کے چہرے سے اس کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کیمرا چھیننے کے لیے قدم بڑھاتا وہ دروازہ باہر سے بند کر کے غائب ہو سکتی تھی اس لیے پھر اسے روکے اور باتوں میں الجھائے رکھنا ضروری تھا۔

''تمہارے لیے اب ہمارا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ایس پی صاحب!'' کلدیپ کور نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

''اسے۔۔۔ اپنے بھائی کو تم نے مارا ہے۔۔۔'' ونود کچھ دیر بعد کلدیپ سے بولا۔

''نہیں۔۔۔ اسے سرجیت نے قتل کر دیا تھا۔۔۔ وہ تمہارے سوٹ کیس سے ریوالور نکال کر لے گئی تھی۔ آواز سن کر چندر سنگھ دوڑا۔۔۔ مگر چندر سنگھ کے پہنچنے تک بلونت سنگھ مر چکا تھا۔ سرجیت ریوالور واپس رکھنے جا رہی تھی۔۔۔ چندر سنگھ نے اسے تمہارے کمرے میں گھستے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔۔۔ جب تم غسل خانے سے باہر نکلے تھے تو چندر سنگھ ریوالور نکال نہیں، رکھ رہا تھا۔۔۔ تمہاری نظر نے سرجیت کو نہیں دیکھا جو تمہارے پیچھے تھی اور پردے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اس نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا جب تم پانچ منٹ کے لیے پھر غسل خانے میں گئے تھے۔۔۔ اس کے علاوہ خوف سے اس کی بری حالت تھی۔۔۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہاری اور چندر سنگھ کی گفتگو کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔۔۔ کہیں چندر سنگھ اس کا نام تو نہیں لیتا۔۔۔ اگر تم نے چندر سنگھ کو جانے دیا ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔۔۔ اور ہمیں یہ موقع نہ ملتا جو تمہاری ذہانت نے فراہم کیا۔۔۔ سرجیت نے دیکھا کہ اب چندر سنگھ کے لیے افشائے راز کے سوا بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو وہ پردے کے پیچھے سے نکل آئی اور پھر اس نے سرہانے والی میز پر سے ٹیبل لیمپ اٹھا کے تمہارے سر پر دے مارا۔۔۔ چندر سنگھ سب دیکھ رہا تھا لیکن اس نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔۔۔ بعد میں ہم سب نے مل کر طے کیا کہ موجودہ حالات میں اپنے بھائی کو رونے پیٹنے اور سرجیت کو مجرم بنانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔۔۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور ہمیں اس کی فکر زیادہ جو اس کے بعد ہو سکتا تھا۔۔۔ اور ہم نے بلونت کے قتل کا الزام تمہارے سر منڈھ کے قسمت کے فراہم کردہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور بلونت کو لا کے تمہارے کمرے میں ڈال دیا۔۔۔ اب تمہاری بہتری بھی اس میں ہے کہ اس راز کو راز رکھنے میں ہماری مدد کرو۔۔۔ صرف یہی راز نہیں۔۔۔ ہر راز پر پردہ پڑا رہنے دو۔''

''چندر سنگھ۔۔۔ اب کہاں ہے۔'' ونود نے کھوکھلی میں کہا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

...باغ میں ایک قبر کھود رہا ہے۔"
...وہاں ہمارے آباؤ اجداد کے وقتوں
...ہیں لیکن ان میں وہ خود دفن نہیں ہیں۔
...ہیں جو اپنی شامت اعمال کے باعث
...تھے اور بس یوں سمجھ لو کہ کرہ ارض سے
...غائب ہو گئے۔

"تمہارا کیا خیال ہے کنور بلونت سنگھ کی موت
...کو تشویش نہیں ہو گی۔" ونود نے اسے سوالیہ
...سے دیکھا۔ "کیا اس پر سوال نہیں ہوں
...؟" کلدیپ کور ہنس پڑی تو اس کے موتی جیسے
دانت دکھائی دینے لگے۔

"ایس پی صاحب۔۔۔! جب ہمیں تشویش اور
پریشانی نہیں ہے تو کسی اور کو کیوں ہو گی۔۔۔؟ کیا
اس کے نہ ہونے سے کسی کا کام رکے گا۔۔۔؟ اور ہم
...ت کی بات کریں گے ہی نہیں۔۔۔ ہم کہیں گے وہ
ولایت پر چلا گیا۔۔۔ لوگ ہماری بات سچ مان لیں
گے۔۔۔ تم یہاں تفتیش مکمل کرنے کے بعد جو
رپورٹ دو گے اس میں تھانے دار کے قتل میں
ہمارے کسی تعلق کی بات کو بے بنیاد افواہ قرار دو
گے۔۔۔ اور یہ لکھو گے کہ حاسد اور دشمنوں، پس ماندہ
ذہنیت رکھنے والوں نے ہمارے بارے میں بے
سروپا باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔۔۔ تھانے دار کا قاتل
ان بدمعاش نوجوانوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے جن کی
تھانے دار نے پٹائی اور سرزنش کی تھی۔۔۔ ایک آدھ
کا حوالہ بھی دے دینا۔۔۔ اس کا جیسے چوک میں مرغا
بنا کے جوتے مارے گئے تھے۔۔۔ تحصیل اور ضلع کے
حکام تمہاری رپورٹ سے بہت ہی خوش ہوں
گے۔۔۔ اور پاپا کی کوشش سے اگر قاتل پکڑا نہ
گیا۔۔۔" وہ معنی خیز طور پر ہنسی اور اس کے سینے میں
سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھانے لگا۔ "دیکھو نا۔۔۔
یہی تو موقع ہوتا ہے کسی کو بتانے کا۔۔۔ کنور وجے
...سے بیر رکھنے کا نتیجہ نکلتا ہے۔۔۔ کسی ایک کو دھر
لیا گیا قتل کے جرم میں تو اس کے ہوش ٹھکانے
آ جائیں گے۔۔۔ تو لہٰذا رپورٹ ہر لحاظ سے بڑی
جان دار اور بھرپور ہونی چاہیے۔۔۔ کہیں بھی جھول
نہ رہ جائے۔"

"اگر میں نے تمہاری حسب منشار پورٹ دینے
کے بجائے حقائق بیان کر دیے تو۔۔۔؟"

"حقائق تو وہ ہوتے ہیں جن پر اعتبار کیا
جائے۔" کلدیپ کور نے تکرار کے سے انداز میں
کہا۔ "اور اعتبار کرنا یا نہ کرنا دوسروں کی مرضی پر منحصر
ہے۔ تم کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے لکھے کو
سچ مانے اور زبان خلق کو جھٹلا دے۔۔۔ کیوں کیا تم
اس بات سے اتفاق کرتے ہو یا انکار۔۔۔؟ اس میں
اختلاف کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے؟"

ونود نے سر ہلایا۔ اس نے چند لمحوں بعد
قدرے تذبذب سے جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔ جھوٹا تو میں ہی ٹھہروں گا۔۔۔ پھر
کلدیپ کے بجائے وہ تھوڑا سا گھوم کر سرجیت سے
مخاطب ہوا جو سہمی ہوئی سی چپ چاپ کھڑی تھی اور
اس کا چہرہ متغیر سا تھا۔ "سرجیت۔۔۔! کیا یہ ٹھیک
ہے کہ تم نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔۔۔؟"

"میں نے۔۔۔؟" وہ خشک حلق کو تھوک نگل
کے تر کرتی ہوئی بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔۔۔
دیدی تو ہر الزام مجھ پر عائد کر دیتی ہے۔۔۔ بلونت کو
تم نے مارا ہے۔ میں نے نہیں۔۔۔ دیدی نے تو اس
تھانے دار کے قتل کا الزام بھی مجھ پر لگا دیا تھا۔۔۔
لیکن یہ سب جھوٹ ہے میں نے ان دونوں میں سے
کسی کو بھی نہیں مارا۔۔۔ کیوں ماروں گی۔۔۔ کیا
بگاڑا تھا ان دونوں نے۔۔۔؟"

کلدیپ کور نے سرجیت کی طرف دیکھا اور
اس کی ہنسی استہزائیہ سی تھی۔

"سرجیت کی یادداشت بھی ایسی ہی ہے۔۔۔
نشے کی حالت میں کچھ کر بیٹھتی ہے جو اسے یاد نہیں
رہتا۔۔۔ اچھا اس سے پوچھو کہ کیا ایک بار اس نے
کھڑکی کھولنے کی کوشش میں ہاتھ مار کے شیشہ توڑا
تھا۔۔۔ اور کلائی کی ایک رگ شیشہ سے کٹی تھی تو اتنا
خون نکلا تھا کہ لالے پڑ گئے تھے۔۔۔ مگر اسے کچھ یاد

نہیں تھا۔۔۔ بھلا یہ واردات جو اس نے کی ہے بھلا یاد رہے گی؟''

''وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر میں نے قتل کب کیا ہے۔'' سرجیت نے احتجاجاً کہا۔

''قتل کیا ہوتا تو مجھے یاد نہیں رہتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''تم۔۔۔ تم پاگل ہو۔۔۔'' کلدیپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''دیکھنا۔۔۔ تم کسی دن اپنا نام بھی بھول جاؤ گی۔ مجھے کیا ضرورت پڑی کہ میں جھوٹ بولوں۔''

''میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔ پاگل نہیں ہوں۔۔۔'' سرجیت ہذیانی لہجے میں زور زور سے چلانے لگی۔ ''اصل بات یہ ہے کہ تم سب مجھے پاگل بنانے کا فیصلہ کر چکے ہو۔''

ان دونوں کو آپس میں تکرار کرتے اور الجھا پا کر اس وقت ونود نے جست لگائی لیکن کلدیپ اس کی توقع سے کہیں زیادہ چالاک عورت تھی۔ دروازہ ایک دم بند ہو گیا اور باہر سے کنڈی لگانے کی آواز کے ساتھ کلدیپ کا زوردار قہقہہ سنائی دیا۔

''سوری۔۔۔ ایس پی صاحب۔۔۔! ایسے تو آپ کیمرا نہیں لے سکتے۔۔۔ منہ دھو رکھیے۔۔۔ آپ۔'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ غصے اور بے بسی کی انتہا سے ونود کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پھر اس نے مکا مار کے شیشہ توڑا اور باہر ہاتھ نکال کے کنڈی کھولی۔ اتنی دیر میں کلدیپ زینے سے نیچے اتر چکی تھی۔ پھر بھی وہ اس کے تعاقب میں لپکا تاکہ اسے ہر قیمت پر پکڑ لے۔

کلدیپ نے آخری زینے سے راہ داری میں مڑتے ہوئے اسے چیلنج کے انداز میں دیکھا۔۔۔ ہنسی اور دروازہ کھول کے سامنے والے ایک کمرے میں گھس گئی۔ شاہ بلوط کا مضبوط دروازہ بند ہو گیا۔ کلدیپ کی ہنسی اس کا تمسخر اڑاتی رہی۔

''کلدیپ۔۔۔'' اس نے کچھ دیر کے توقف کے بعد دروازہ بجایا اور شکست خوردگی کے لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہاری شرط اور بات منظور ہے۔۔۔ رپورٹ وہی ہو گی جو تم چاہتی ہو۔۔۔ یعنی تمہارے حسب منشا۔۔۔''

اندر سے کلدیپ کی مترنم ہنسی پھر سنائی دی جو اسے بڑی زہر لگی اور اس کا لہجہ بھی زہریلا لگا جو اس کے وجود پر ڈنک بن کر لگا۔ وہ بولی۔

''قتل ایسے ہی تجربات سے آتی ہے ایس پی صاحب۔۔۔! کیا آپ نے مجھے نادان بچی سمجھ لیا تھا۔۔۔''

ونود کے دل میں دروازے کو توڑ کے اندر گھس جانے کی وحشیانہ خواہش نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔ مگر دروازہ ناقابل شکست تھا۔ وہ اپنی بے بسی اور احساس ذلت وندامت پر پیچ وتاب کھا کے رہ گیا تھا۔ پھر اسے کنور وجے سنگھ کے چلانے کی آواز نے متوجہ کر لیا۔ ورنہ اس نے سوچا اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ بڑے زور سے دروازے سے ٹکرائے گا۔۔۔ دھکا دے گا۔ شاید اندر کی چٹخنی بچنے سمیت اکھڑ جائے۔

پھر وہ تین دروازے چھوڑ کر پھر اسی کمرے میں داخل ہوا جس میں اس کی اور بلو کی پہلی ملاقات ناخوشگوار ماحول میں تصادم پر ختم ہوئی تھی اور اب بلو اس کے کمرے میں اس کے ریوالور کی گولی سے اور اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو۔ ہر شہادت اسے مجرم ثابت کرتی تھی اور اس کی بے گناہی کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔

کمرے میں نازک اندام شیاما اپنے سے دگنی حیات کے اور شراب سے مدہوش کنور وجے سنگھ کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

''پاپا۔۔۔! پاپا۔۔۔! پلیز آپ ضرورت سے زیادہ پی چکے ہیں۔۔۔ چلیے اب سو جائیے۔'' وہ التجا کر رہی تھی۔ کنور وجے سنگھ نے اس کا نرم ونازک ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور پھر وہ غرائے اور شیر کی طرح دہاڑے۔

''سو جاؤں۔۔۔ ابھی سے۔''۔۔۔ اس نے نفی میں زور زور سے سر ہلایا۔

''جی پاپا۔۔۔ میرے اچھے پاپا'' شیاما پھر لڑ گرائی۔ ''آپ نشے میں ہیں۔''

''میں بالکل ہوش میں ہوں۔۔۔ تو جا۔۔۔ جا کے سو جا اگر نیند آ رہی ہے۔۔۔ دیکھو۔۔۔ یہ بوتل خالی ہو گئی ہے تو کیا۔۔۔ اس میں ایک گھونٹ بھی نہیں ہے۔۔۔ دیکھ رہی ہے نا۔۔۔'' اس نے جھک کر میز سے دوسری بوتل اٹھائی۔

''دوسری بوتل نہیں ہے پاپا۔۔۔ اور دوسری بوتل اتنی رات کہاں سے آئے گی۔۔۔ پلیز۔۔۔ پاپا۔۔۔! آپ سوچیے گا۔۔۔ دکانیں بند ہوتی ہیں۔ اور سویرے دیر سے بھی کھلتی ہیں۔'' شیاما انہیں سمجھانے لگی۔

یہ سنتے ہی ان کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے بوتل گھما کے دیوار پر دے ماری۔

''جہنم سے آئے گی۔۔۔ جہاں مجھے۔۔۔ ہم سب کو جانا ہے۔ اس دھرتی پر پھر ایک بھی نہیں رہے گا۔'' وہ بگڑ کے برہمی سے بولے۔ پھر اس کی نگاہ نے ونود کو دیکھا اور چونک کے گھورنے لگا۔

''تم۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔ کنور وجے سنگھ کی حویلی میں تمہیں قدم رکھنے کی جرات کیسے ہوئی تمہیں۔۔۔ شوٹ کر دوں گا۔'' پھر اس نے ہاتھ ماتھے پر ہاتھ رکھا اور چندھیائی ہوئی نظروں سے ونود کی صورت کو فوکس کرنے لگا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تم وہ ایس پی ہو۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔۔ ونود سنگھ۔۔۔'' وہ ہنسا ''دیکھ شیاما۔۔۔! تو کہتی ہے کہ میں ہوش میں نہیں مگر۔۔۔ مگر میں نے ایس پی صاحب کو پہچان لیا۔۔۔ ایس پی صاحب! آپ نے ان سب کو پکڑ لیا ہے۔۔۔ اگر کہیں پکڑا ہے تو فوراً پکڑ لیجیے۔۔۔ اور سب کو جیل بھیج دیجیے۔۔۔ تمام عمر کے لیے۔۔۔ دماغ درست ہو جائے گا۔ جب چکی پیسیں گے نا تو ان کو۔۔۔ یہ سب شہزادے سے۔۔۔ ہیں نا۔۔۔ ان کو۔۔۔ جو خود کو میری اولاد کہتے ہیں نا۔۔۔ ان تمام کو بھیج دیجیے جس دام۔۔۔ دریائے شور۔۔۔ کالے پانی۔۔۔ پھر ان کو اس حویلی کے عیش یاد آئیں گے۔۔۔ بس اسے چھوڑ دیجیے۔''

پھر اس نے شیاما کے سر کو سینے سے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''یہ میری بیٹی ہے۔۔۔ کنور وجے سنگھ کی بیٹی۔۔۔ اس کی جانشین۔۔۔ چاند بی بی۔۔۔ رانی۔''

وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کے ہنسا۔۔۔ ونود نے دیکھا کہ اس کی بوڑھی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے چہرے کی جھریوں سے گزر کے اس کی جھاڑ جھنکار داڑھی کو تر کر رہے ہیں۔

''شیاما۔۔۔'' ونود نے نرمی سے کہا۔ ''میں کنور صاحب کو سنبھال لوں گا۔۔۔ تم جاؤ۔۔۔ آرام کرو۔۔۔ تم بہت تھکی ہوئی لگتی ہو۔'' لیکن اس کے باوجود شیاما وہیں کھڑی رہی۔ ونود نے وجے سنگھ کو سہارا دے کر صوفے پر لٹا دیا۔

''ایس پی صاحب۔۔۔!'' وجے سنگھ پھر اٹھ بیٹھا ''یہ آپ نے بلی کو دیکھا ہے کہیں۔۔۔ بلونت سنگھ۔۔۔ میرے بیٹے کو۔۔۔ مجھے اس سے ایک بات کرنی تھی۔۔۔ اس ذلیل، کمینے۔۔۔ میرے سیکریٹری۔۔۔ تمہیں معلوم ہے وہ شیاما سے شادی کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اس کی جرات دیکھو۔۔۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنا چاہتی ہے۔۔۔''

''مگر کنور صاحب۔۔۔! آپ تو اس کی منگنی کر چکے ہیں۔۔۔ شیاما کے ساتھ۔۔۔''

''کون۔۔۔ کون کہتا ہے یہ۔۔۔ میرے سامنے لا ڈالے۔۔۔ میں شوٹ کر دوں گا اسے۔۔۔ وہ میری شیاما کی جوتی کا غلام۔۔۔ وہ اس قابل بھی نہیں کہ اس کے ساتھ شیاما کا نام لے۔۔۔ مگر یہ سب۔۔۔ کلدیپ اور بلونت۔۔۔ ان سب نے کہا تو میں نے کہا کہ اچھا۔۔۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کون ہے۔۔۔ کس خاندان سے ہے۔۔۔ اس کا خاندان۔۔۔ کنور وجے سنگھ کے خاندان کا ہم پلہ ہے بھی یا نہیں۔۔۔ مگر بلونت کو بھی

معلوم ہو چکا ہے اور۔۔۔ اور میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ یہ غلط نہیں ہے۔۔۔ اس بدمعاش چندر سنگھ کو۔۔۔ اس کا کیا خیال تھا کہ ہم اندھے ہیں۔۔۔ وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا تھا۔۔۔ میں اسے بتادوں گا۔ کنور وجے سنگھ کون ہے۔۔۔ وہ ابھی زندہ ہے۔۔۔ مگر پہلے مجھے اپنے بیٹے سے بات کرنی ہے۔۔۔ ابھی بلاؤ۔۔۔ بلی کو۔۔۔ بلونت کدھر ہے۔۔۔ ۔ آج وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔۔۔ اس کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آئی۔

شیاما کا چہرہ جو پہلے سرخ پڑ گیا تھا زرد ہونے لگا۔ پھر سفید پڑتا گیا۔

''اس وقت کوئی بات ضروری نہیں پاپا۔۔۔! آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' وہ بولی۔

''آپ اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔'' ونود نے شیاما کی صورت کو غور سے دیکھا اور پھر وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''اگر کوئی بات چندر سنگھ کے بارے میں ہے تو۔۔۔ میرا خیال اس وقت ہو جانا چاہیے۔۔۔ اس لیے کہ بات عزت کی جو ہے۔''

''ایسی۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔'' شیاما نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ''او۔۔۔ اور پھر بلونت۔۔۔''

کنور وجے سنگھ آنکھیں بند کیے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔ مسکرا رہا تھا۔۔۔ اور ہنس بھی رہا تھا۔۔۔ صرف اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔۔۔ کنور وجے سنگھ کی جذباتی اور ہیجانی کیفیت تھی۔

ونود نے شیاما سے اشارے سے باہر آنے کے لیے کہا۔۔۔ شیاما نے ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا۔۔۔ کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑی رہی۔ پھر جب اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا باپ خود کلامی میں دنیا مافیہا سے بے نیاز ہے تو پھر وہ ونود کے ساتھ باہر آ گئی۔

''دیکھو شیاما۔۔۔! حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔'' ونود نے اسے صاف صاف بتا دینا بہتر سمجھا۔ اسے اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر اس نے بتایا۔۔۔ ''کسی نے تمہارے بھائی بلونت سنگھ کو قتل کر دیا ہے۔ اور اس کی لاش میرے کمرے میں پڑی ہے۔۔۔ یہ بات وجے سنگھ کو معلوم نہ ہو اچھا ہے۔۔۔ ورنہ وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکے۔۔۔ کیا تمہیں وہ بات معلوم ہے جو کنور وجے سنگھ کو معلوم ہے جس کا تعلق چندر سنگھ سے ہے۔''

شیاما کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید اور بے لہو ہو گیا۔ ''بلونت۔۔۔ بلونت مر گیا۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔ یہ غلط ہے۔''

''مجھے جھوٹ اور غلط بیانی سے کیا فائدہ ہو گا شیاما۔۔۔!'' ونود نے کہا۔ ''لیکن تم حقائق کو چھپانے کی کوشش کرو گی تو۔۔۔''

''بلونت کو کس نے قتل کیا ہے۔'' وہ ونود کی بات کاٹ کے دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ آنسو خاموشی سے اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

تمہاری دیدی کے بیان کے مطابق سرجیت نے۔۔۔ ونود نے کہا۔ ''مگر مجھے اس کی بات کا یقین نہیں۔۔۔ مجھے اس کی بات جھوٹی لگی۔''

''دیدی۔۔۔'' شیاما نے نفرت کے زہر کی تلخی میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ تو سرجیت کے وجود کو بھی منحوس اس لیے برداشت کرتی ہے کہ ہر جرم و گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا جا سکے۔۔۔ اس نے سرجیت کو تو پاگل بنا ہی دیا ہے۔۔۔ اب خونی اور قاتل بنا کے مرواد بنا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اب تک پاگل نہیں ہوئی۔۔۔ وہ ہم سب سے زیادہ ذہین ہے اور سب سمجھتی ہے۔ تھانے دار کے قتل کا ذمے دار اس نے سرجیت کو بنا دیا تھا۔۔۔ اب وہ بلونت کا قاتل کہتی ہے ونود!''

پھر وہ توقف کر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''مجھے معلوم ہے اس لیے میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔'' وہ ہولے ہولے اس کے سر کو تھپکنے لگا۔

''تم چنتا مت کرو۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ مگر مجھے پہلے اپنے پاپا سے بات کرنے دو۔۔۔ پھر میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔۔۔ اور ہاں اب خاموشی سے کافی بنالاؤ۔۔۔ چینی اور دودھ کے بغیر۔۔۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کے علم میں یہ بات نہ آئے کہ میں کہاں ہوں۔''

''لیکن ونود۔۔۔! آپ نے کھانا بھی تو نہیں کھایا ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں بس کافی پی لوں گا۔۔۔ جاؤ۔۔۔ شاباش۔'' اس نے شیاما کو جدا کرکے رخصت کیا۔

دس پندرہ منٹ میں ونود نے کنور وجے سنگھ کے حلق سے تلخ سیاہ کافی کے دھار زبردستی اتارے اور فریج میں سے برف نکال کے اس کی گردن کی پشت سے رگڑتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کنور وجے سنگھ کا نشہ اترنے لگا۔

اس دوران وہ بار بار پوچھتا رہا کہ بلونت کہاں ہے۔۔۔

''وہ کس لیے۔۔۔؟'' ونود نے ٹالنے کے بہانے اس سے سوال کیا۔

''اس لیے کہ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' کنور وجے سنگھ بولا تو وہ اسے پھر ٹالتا رہا۔

جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تو ونود نے اسے ذہنی طور پر ایک بری خبر سنانے کے لیے تیار کیا۔ بالآخر بتایا کہ اس کے بیٹے کو بلونت کو قتل کردیا گیا ہے۔

وہ یہ خبر سن کے بت بنا بیٹھا رہا اور شیاما کی موجودگی میں ونود نے بتایا کہ۔۔۔ کس طرح اس کے سوٹ کیس سے ریوالور نکالا گیا۔۔۔ اور اسے کیسے بے ہوش کیا گیا اور بلونت کی لاش اس کے کمرے میں ڈال دی گئی۔۔۔ اور پھر کلدیپ کور نے چالاکی سے اس کی اور لاش کی تصویر اتار لی جس میں وہ جو بھی اس کے ساتھ ہے۔۔۔ اس نے کلدیپ کی دھمکی اور کیمرے سمیت بھاگ جانے کا ذکر بھی کر دیا۔ اسے شیاما اور بوڑھے کنور وجے سنگھ پر ترس آیا جو ذلت و رسوائی اور دکھ کی اس بار گراں کو اٹھا کے جینے پر مجبور تھے اور چپکے آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

پھر کنور وجے سنگھ نے بے ربط جملوں۔۔۔ الفاظ میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ چند دن پہلے نیا تھانے دار ان کے پاس آیا تھا۔۔۔ اس نے کہا کہ تیج پور میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اشتہاری مجرم ہے۔۔۔ اس کا اصل نام دھریندر سنگھ تھا اور وہ میرٹھ سے آگے مراد نگر کی آرڈیننس فیکٹری میں کیشیئر تھا۔ میرٹھ اور دہلی کے درمیان واقع آرڈیننس فیکٹری میں مہندر ناتھ نام کا ایک اکاؤنٹس آفیسر بھی تھا۔ اس سے مل کر بوگس بل پاس کروائے جو کنٹرولر آف آرڈیننس فیکٹری نے اس لیے پاس کر دیے کہ ان پر اکاؤنٹس آفیسر کے دستخط اور مہر اصلی ہوتے تھے۔ چوں کہ کیشیئر کے دستخطوں کی تصدیق میں یہی اکاؤنٹس آفیسر کرتا تھا۔ اس لیے چیک بھی کیش ہوگئے اور ان دونوں نے مل کر پچیس لاکھ کی رقم کا غبن کیا اور غائب ہوگئے۔ ان کا حلیہ اور تصویر مشتہر بھی کیا گیا تھا مگر پولیس کو ان کا سراغ نہ ملا۔ عام خیال تھا کہ انہوں نے پولیس کو بھی رشوت دی اور ملک سے باہر نکل گئے۔

لیکن تیج پور کے تھانے دار کو پہلے کیشیئر دھریندر سنگھ نظر آیا۔۔۔ پھر اس نے مہندر سنگھ نام کے ایک شخص کے پراسرار حالات میں مرجانے کا ذکر کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ کنور مہندر سنگھ وہی کیشیئر کا ساتھی اکاؤنٹس آفیسر تھا اور وہ کنور وجے سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا جس نے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کی پوزیشن اچھی نہیں تھی چنانچہ اسے کلاس ون گزیٹڈ پوسٹ کے بجائے کلاس ٹو آفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا جو اس نے قبول کرلیا۔ مہندر سنگھ کا فرار ہوکر آنا تو سمجھ میں آتا مگر اس کے دوسرے دھریندر کا یہاں موجود ہونا بالکل

ناقابل فہم تھا۔

مہندر کے قتل کے بارے میں ابتدائی رسومات سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ غالباً مہندر پچیس لاکھ کی ساری رقم لے کر دھرمیندر کو دغا دے گیا اور دھرمیندر اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ پہنچا اور اس نے مہندر کو قتل کر دیا مگر اس کے باوجود وہ فرار نہیں ہوا۔۔۔ وہ مہندر کے خاندان میں چندر سنگھ بن کے شامل ہو گیا۔ غالباً مہندر نے وہ رقم اپنے خاندان کے حوالے کر دی تھی جن کی آمدنی کے سارے ذرائع محدود ہو چکے تھے مگر شاہانہ ٹھاٹ باٹ باقی تھے۔ ان کی گرتی ہوئی ساکھ اور مالی حالات کو سنبھالنے میں پچیس لاکھ کی رقم نعمت سے کم نہ تھی۔

کنور مہندر سنگھ خاندان کی عظمت کے مینار کو سر بلند رکھنے کے جنون میں اپنے آباواجداد سے کم نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی قربان کر دی اور خاندان کی آن پر حرف نہ آنے دیا۔۔۔ تاہم دھرمیندر سنگھ یعنی چندر سنگھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے موقع ملے گا اور تقدیر نے ساتھ دیا تو وہ اپنا تمام تر حق معہ سود وصول کر لے گا۔ تھانے دار نے قیاس آرائی کی بنیاد پر اصل حالات معلوم کر لیے تھے۔

کنور وجے سنگھ کا خاندان اس دولت پر عیش کر رہا تھا جو مہندر سنگھ نے اپنی زندگی دے کر حاصل کی تھی۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ تھانے دار کو ان حالات پر سے پردہ اٹھانے کی اجازت دی جائے۔ کنور وجے سنگھ اور بلونت سنگھ نے پہلے رشوت دے کر اس کا منہ بند رکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایمان داری کے مرض میں مبتلا تھا۔ دھمکی بھی غیر موثر ثابت ہوئی اور وہ چندر سنگھ کے بارے میں قانونی کارروائی کی دھمکی دے کر چلا گیا۔۔۔ اگلے روز تھانے دار کی لاش وجے سنگھ کے دادا تیج سنگھ کے مجسمے سے معلق پائی گئی۔

کنور وجے سنگھ نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے تھانے دار کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا درست تھا۔ وہ آرڈیننس فیکٹری مراد نگر میں تین برس سے تعینات رہا تھا اور محض اپنی ایمان داری کے جرم میں وہاں سے اٹھا کے اس دور افتادہ قصبے میں پھینک دیا گیا تھا جہاں کنور وجے سنگھ جیسے لوگ اس کا دماغ درست کر سکیں۔۔۔ مگر ونود جانتا تھا کہ ایک کیا ہزار کنور وجے سنگھ بھی اس تھانے دار پروجے نہیں پا سکتے تھے جس کی اصول پرستی اور ایمان داری اور فرض شناسی کتے کے دم کی طرح تھی جسے بارہ برس کی پوری عمر کوشش کر کے بھی سیدھا نہیں کیا جا سکتا تھا جب اس کے غلط رویئے کے بارے میں نیچے سے شکایات اور اوپر سے دھمکیاں موصول ہونے لگی تھیں۔۔۔ وہ اس تھانے دار کو بچپن سے جانتا تھا اس وقت سے جب وہ چھوٹا سا بچہ اور اس کے ساتھ اسکول جاتا تھا۔ اس وقت وہ کوئی تھانے دار نہیں تھا۔ ونود کا چھوٹا بھائی تھا۔ گو وہ تھانے دار بننا چاہتا تھا۔ لوگ انہیں سقراط یا بقراط کہتے تھے۔ بقراط بڑے بھائی کو اور سقراط چھوٹے میاں کو۔۔۔ بقراط تو سب ہیں مگر بیسویں صدی میں سقراط کون ہے۔

''شیاما۔۔۔!'' اس نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ ''مجھے ایک ریوالور چاہیے ابھی اور اسی وقت۔۔۔''

''ریوالور تو کوئی نہیں۔۔۔ البتہ ایک شکاری بندوق ہے۔'' شیاما نے کہا۔

''مگر اس کا تم کیا کرو گے۔۔۔؟''

''مجھے وہ بندوق چاہیے۔'' ونود نے سخت لہجے میں کہا۔

شیاما نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دیوار پر سے بارہ بور کی دو نالی بندوق اتار اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''تم یہ دروازہ بند کر لو۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں اس دروازے کو مت کھولنا۔'' وہ باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''کسی کے لیے بھی نہیں۔۔۔ اور نہ اپنی دیدی کے لیے اور نہ سرجیت کے لیے۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔؟''

☆☆☆

چندر سنگھ درخت کے نیچے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھا

لیے کھڑا تھا اور اس دونالی بندوق کو دیکھ رہا تھا جس کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔

''انکار کی اب گنجائش ہی کہاں رہی ہے ایس پی صاحب!'' اس نے کہا۔ ''تھانے دار نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں اسے قتل نہ کرتا تو کیا کرتا۔۔۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ گدھا۔۔۔ کنور وجے سنگھ اور بلونت سے بھی بات کر چکا ہے۔۔۔ ان دونوں نے مجھ پر کچھ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ باتوں سے اور نہ رویئے سے۔''

''پھر تم نے بلونت کو قتل کیوں کیا۔۔۔'' ونود نے رائفل کا رخ بدستور اس کی طرف رکھا۔

''آج تم نے اسے ذلیل کیا تھا۔ وہ بہت مشتعل تھا۔ اس نے بھی مطالبہ یہ تھا کہ میں اس کا ساتھ دوں۔۔۔'' وہ تمہیں اس قبر میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ بہت خطرناک اقدام ہو گا۔۔۔ ایک تھانے دار کی موت پر ایس پی آ پہنچا ہے تو کیا اس ایس پی کی گم شدگی سے پولیس کا پورا محکمہ تیج پور پر یلغار نہیں کرے گا۔۔۔ وہ میرے انکار پر مشتعل ہو گیا اور اس نے کہا کہ دھرمیندر میرا ساتھ دو گے یا جیل جاؤ گے۔۔۔؟ میرے لیے یہ اطلاع کسی خوف ناک دھماکے سے کم نہ تھی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔۔۔ میں نے جذباتی خطرہ مول لینے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچا۔۔۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ رات سوتے وقت ایس پی صاحب کا کام تمام کر دیا جائے گا مگر موقع ملتے ہی میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح راستے کے ایک پتھر کو جیسے ٹھوکر مار کے ہٹا دیا۔ پھر میں نے کلدیپ سے بات کی۔ وہ سب کچھ جانتی ہے۔

''کیا سرجیت نے تمہارے اور کلدیپ کے تعلق کے بارے میں جو کچھ کہا تھا درست تھا۔'' ونود نے سوال کیا۔

''ہاں۔۔۔ دیکھو۔۔۔ ایس پی صاحب! شیاما بڑی اچھی لڑکی ہے۔۔۔ نہایت حسین و جمیل، محبت کرنے والی اور نیک سیرت ہے۔'' چندر سنگھ یعنی دھرمیندر بولا۔ ''مگر اپنے مطلب کی نہیں۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔ مجھے کلدیپ جیسی عورت چاہیے۔۔۔ ہم فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک ہیں۔۔۔ وہ جس محبت اور فیاضی سے مہربان ہوتی ہے وہ کوئی اور عورت نہیں ہو سکتی۔۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔۔۔ کلدیپ نے اس عرصہ میں مجھ سے قریب اور بے تکلف ہونے پر اس بات کو محسوس کر لیا تھا اور پھر اس نے کھل کر بات کی تھی کہ شیاما کو چھوڑ دو۔۔۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔۔۔ بھگوان نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بنایا تھا۔''

''کیا کلدیپ نے تمہیں تیج پور کے کنور وجے سنگھ کا وارث بنانے کا موقع فراہم کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ وچن دیا تھا۔'' ونود نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ یہ موقع تو تقدیر نے تمہیں بھیج کر فراہم کیا۔'' چندر سنگھ بولا۔ ''کلدیپ نے کہا تھا کہ جنگل کا ٹھیکہ لے لوں جو کئی برسوں سے پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔ اس سے لاکھوں کمائے جا سکتے ہیں۔ جب میں نے بلونت کو مار دیا تو کلدیپ نے اور میں نے مل کر طے کیا کہ اب حالات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔۔۔ سرجیت کو کلدیپ ہی تمہارے کمرے میں لے گئی تھی۔۔۔ ظاہر ہے اس وقت تک میں وہاں بلونت کی لاش ڈال آیا تھا۔۔۔ چنانچہ کلدیپ کے لیے سرجیت کو یہ یقین دلانا مشکل ثابت نہ ہوا کہ بلونت کو تم نے قتل کیا ہے۔ وہ نشے میں تھی اور کسی بھی بات پر یقین کر سکتی تھی۔''

مگر اس نے یہ نہیں مانا تھا کہ وہ قتل کی ذمہ دار ہے۔۔۔ تھانے دار کے قتل کی۔'' ونود نے کہا۔ ''بعد میں جب کلدیپ نے جب اسے بھائی کا قاتل قرار دیا تو وہ ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی تھی۔''

''وہ کلدیپ کی غلطی تھی۔'' چندر سنگھ بولا۔

''اگر وہ تمہیں مجرم رکھتی تو اچھا تھا۔۔۔ ایک قتل کا الزام سرجیت پر رہتا اور دوسرے قتل کا تم پر آتا۔۔۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ ایک ایس پی کو قاتل ثابت

کرنا آسان نہ ہو۔ اس لیے اس نے تم سے دوسرا کام لیا۔۔۔ یعنی اپنی منشا کے مطابق رپورٹ حاصل کرنے کا۔ تم واپس چلے جاتے۔ سرجو گرفتار ہو جاتی اور بوڑھا وجے سنگھ شاید اس صدمے سے مر جاتا اس کا دل پہلے ہی سے کمزور ہے اور کلدیپ ڈاکٹر کی ہدایت نظر انداز کر کے اسے خوب پلا رہی ہے۔ اس کی مرضی کے آگے شیاما بے بس ہے ورنہ کلدیپ چاہے تو کنور وجے سنگھ کو ایک بوند شراب نہ ملے۔ شراب اس کے لیے زہر ہے۔ مگر اسے یہ زہر پی کے ہنسی خوشی مر جانا بہتر ہے۔ ہم اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کے گنہگار کیوں بنیں۔۔۔ رہ جائے گی شیاما۔۔۔ تو اس کا بندوبست بعد میں ہو جائے گا۔۔۔ دو چار برس بعد جب لوگ ان واقعات کو بھول ہو چکے ہوں گے۔۔۔ جائیداد دونوں بہنوں میں تقسیم ہو چکی ہو گی اور میں شیاما کا منگیتر ہی رہوں گا۔ شادی کو دو چار برس ٹالنا میرے اختیار میں ہو گا اور جب وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر جائے گی تو کلدیپ اور تیج پور کی وراثت دونوں پر میرا حق ہو گا۔ وہ کون چھین سکے گا۔۔۔ صورت حال اب بھی وہی ہے۔۔۔ تم مجھے غبن کے الزام میں گرفتار کروا سکتے۔۔۔ زیادہ سے زیادہ سات برس کے لیے جیل بھی بھجوا سکتے ہو۔۔۔ مگر سرجیت کو نہیں بچا سکتے اور خود بھی نہیں بچ سکے۔۔۔ تمہاری گواہی مجھے اور کلدیپ کی گواہی تم دونوں کو جیل بھیج سکتی ہے۔۔۔ انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

ونود نے بندوق کی نال نیچی کر لی۔ پھر اس نے چندر سنگھ سے کہا۔

"شاید تم نے انگریزی کا یہ محاورہ تو یقیناً سنا ہو گا کہ خیرات اپنی مرضی سے نہیں ملتی۔۔۔ انتخاب کا حق کلدیپ کور نے پہلے ہی چھین لیا ہے۔"

چندر سنگھ یعنی دھرمیندر نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ونود کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس وار سے کبھی نہ بچتا اور سر پھٹنے کے بعد سیدھا قبر میں جاتا مگر ونود کو اس کے پیشے نے اچانک اور غیر متوقع خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ چھٹی حس عطا کر دی تھی جو حیوانی جبلت ہے۔ وہ غوطہ مار گیا اور چندر سنگھ سنبھل نہ سکا۔ وہ اپنے ہی زور میں گھوما اور توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے سنبھلنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلائے مگر قدموں کے نیچے سے تازہ مٹی پھسل گئی۔ وہ منہ کے بل اس قبر کی طرف گیا جو اس نے دوسروں کے لیے کھودی تھی۔ اس کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور بیلچہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ونود نے دیا سلائی جلا کے دیکھا تو دو تین فٹ قطر کے چار فٹ گہرے گڑھے میں نہایت مضحکہ طریقے سے سمٹا پڑا تھا۔ اس کا سر پیشانی پر بہنے والے لہو سے سرخ ہو رہا تھا۔ کسی ہارے پہلوان کی طرح چت ہو گیا تھا۔

"چندر سنگھ۔" حویلی کی طرف سے کلدیپ کی آواز آئی۔ "کیا وہ ایس پی۔۔۔ ادھر آیا ہے۔۔۔ کیا تم نے اپنا کام ابھی تک ختم نہیں کیا۔۔۔ جلدی سے کرو۔۔۔ ہمیں تو بہت کچھ کرنا ہے۔۔۔"

ونود اس کی طرف پشت کیے کھڑا رہا۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔۔۔ لیکن کلدیپ مکار اور عیار صورت ہی نہیں بلکہ بڑی اچھی اداکارہ تھی۔ شاید اس نے اندھیرے کے باوجود پرچھائیں سے اندازہ کر لیا تھا کہ مٹی کے ڈھیر پر کھڑا ہوا شخص چندر سنگھ نہیں ونود ہے۔ لیکن اس نے لہجے سے ونود کو کچھ اندازہ نہ ہونے دیا۔ وہ اسے برابر جلدی کی تاکید کرتی رہی۔۔۔ عین اس وقت جب ونود گھوم کر اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ کلدیپ نے ایک جست لگا کے اسے دھکا دیا اور ونود سیدھا گڑھے میں چندر سنگھ پر گرا اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"ایس پی کے بچے۔۔۔ ذلیل۔۔۔ کمینے۔۔۔ تو مجھے دھوکا دینا چاہتا تھا۔"

اس نے کلدیپ کی آواز سنی جو دھکا دیتے ہی پلٹ کر بھاگ گئی تھی۔۔۔ اگر وہ اداکاری کا سہارا نہ لیتی تو ونود اسے بندوق کی زد میں لے کر بے بس کر دیتا اور وہ کیمرا چھین لیتا جو کلدیپ کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کے لیے آدھے راستے واپس لوٹنا بھی نا

...ان تھا۔ اس چالاکی نے اسے فرار کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ ونود اس کے محبوب کو گولی مار چکا ہے۔

ونود کا سر چندر سنگھ کے لہو آلودہ سر سے ٹکرایا اور اسے چندر سنگھ کے خون کی نمی اپنی پیشانی پر اور ہاتھ پر بھی محسوس ہوئی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ چندر سنگھ یعنی دھرمیندر زندہ تھا۔ اس نے گڑھے کے کنارے کو تھام کے نکلنے کی کوشش کی۔ مٹی کے ڈھیر پر پڑی ہوئی بندوق یوں نیچے آئی کہ اس کا دستہ ونود کے سر پر لگا۔ ونود پھر چندر سنگھ پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

کلدیپ نے بیوک کی ڈگی میں سے پٹرول کے سربند ڈبے کو نکال لیا۔

سرجیت اسی طرح بے سدھ پڑی تھی اور اسے بالکل خبر نہ تھی کہ نشے میں وہ کلدیپ کا سہارا لے کر اپنے پیروں پر چلتی ہوئی کنور وجے سنگھ کی خواب گاہ تک آ گئی ہے۔ وہ بند دروازے کے باہر رنگین ٹائلوں کے سرد فرش پر گٹھری بنی پڑی تھی اور آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔

”ڈیڈی۔۔۔! میں۔۔۔ میں نے بلی کو نہیں مارا۔۔۔ تم جانتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کے سر کی سوگند۔۔۔ پاپا۔۔۔! میں قاتل نہیں ہوں۔۔۔ بھگوان کی سوگند لے لیں۔۔۔ وہ جانتا ہے کہ میں نردوش ہوں۔“

لیکن اس وقت حویلی میں کوئی آواز سننے والا نہیں تھا۔۔۔ بوڑھا شوفر اور اس کی بیوی جن کے بال اس حویلی کا نمک کھاتے سفید ہو گئے تھے اپنے کوارٹر میں رات کی تنہائی میں اپنے ماضی کے ان خوابوں کو سمیٹے سو رہے تھے جن کو تعبیر نہ ملی۔ اگر ان کے بچے جیتے تو شاید زندگی کے یہ دن ان کی کمائی اور خدمت گزاری کے سہارے بسر ہو جاتے۔۔۔ مگر نصیب میں تو یہی غلامی کی زندگی تھی۔ بیٹے پوتوں، نواسے نواسیوں اور ان کے آباد گھروں کی تمنا فقط اب تھی۔ زندگی تھی کہ بے جان گزر رہی تھی۔ نا آسودہ سی۔

اس سے اگلے کوارٹر میں بوڑھا مالی تھا جس نے بیٹے کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا اور آخری وقت اس حویلی میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ پرانے وفاداروں میں یہی تین اب تک حویلی میں موجود تھے۔ باقی دو خادم یعنی راجو اور اس کی بیوی جو صفائی کے کام پر مامور تھی۔ قصبے میں اپنے گھر میں رہتے تھے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے آئے اور سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد چلے جاتے تھے۔

حویلی کے ایک گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیے۔۔۔ کلدیپ نے ایک نظر اس طرف دیکھا جہاں درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی قبر میں بلونت کی جگہ خود چندر سنگھ کی لاش پڑی تھی۔ اس لاش کے اوپر وہ ایس پی بے ہوش پڑا تھا جسے بروقت پہچان کے اس نے رائفل سمیت گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ پھر وہ ریوالور لیے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی رہی تھی کہ وہ نکلے تو اس کے سر پر دستہ دے مارے اور پھر اس قبر میں ڈال دے۔ اس نے یقیناً چندر سنگھ کو مار دیا تھا اور اب کلدیپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ ان دونوں کو زندہ دفن کر دے۔

کل کیا ہوگا۔۔۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔۔۔ ایس پی نے چندر کو دھرمیندر کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا مگر وہ خود اس لیے بھاگ گیا کہ بلونت کو قتل کرنے کے بعد اسے اپنا انجام صاف نظر آیا تھا۔ تصویر کی گواہی اس کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ یہ ایسا ٹھوس ثبوت ہے کہ اسے ہر گز ہر گز کسی قیمت پر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

وہ کافی دیر تک انتظار کرتی رہی تھی اور اس کے بعد دبے پاؤں پوری طرح چوکس رہتے ہوئے اس گڑھے کے قریب گئی تو اسے چندر سنگھ اور ایس پی دونوں یک جان دو قالب نظر آئے تھے۔ دونوں کے سر پھٹ گئے تھے اور وہ اگر مرے نہیں تھے بے ہوش تھے۔ ان پر بعد میں مٹی ڈال کر زمین برابر کی جا سکتی تھی۔ یہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ قبر کھودنے کا مشکل کام تو چندر سنگھ کر ہی گیا تھا۔ ایک

ڈرم کو کناروں پر لڑھکانے میں کلدیپ کو سخت محنت کرنی پڑی مگر وہ صحت مند عورت تھی۔ دس منٹ بعد وہ الٹے خالی ڈرم کے پیندے پر چڑھ گئی اور اس نے پٹرول کے ٹین کے ڈھکن کو کھولا۔ ڈبے کو اٹھایا اور جالی والے روشن دان میں سے پیٹرول کی دھار اندر گرانے لگی۔

''دیدی۔۔۔ دیدی۔۔۔!'' شیاما نے ایک ہذیانی چیخ ماری۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو۔''

دیدی۔۔۔! کیا تم پاگل ہوگئی ہو کیا۔ میں تمہاری چھوٹی بہن شیاما ہوں۔'' شیاما ہسٹریائی کیفیت میں چلائی۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا۔''

کلدیپ قہقہہ مار کے ہنسی۔ ''اگر کھول کے دروازہ نکل سکو تو نکل جاؤ۔ پہلے تم نے کنڈی کھولنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب میں نے باہر سے تالا لگا دیا ہے۔''

''دیدی۔۔۔! اندر تمہارا باپ ہے۔۔۔ تمہارا بوڑھا باپ۔۔۔'' شیاما کی دہشت زدہ چیخ سنائی دی۔

کمرے میں پٹرول کی بو پھیل گئی۔ کلدیپ نے ایک کپڑا پٹرول میں بھگویا۔ دیا سلائی دکھاتے ہی کپڑے نے آگ پکڑ لی۔ کلدیپ نے اسے جالی دار روشن دان میں سے اندر گرا دیا۔ پھر شیاما کی آخری چیخ سنائی دی۔ پھر وہ دروازے سے ٹکرانے لگی۔ کلدیپ نیچے اتر آئی۔ آگ کمرے میں پھیل چکی تھی۔ کچھ دیر میں سب خاک ہو جائے گا۔ تمام فرنیچر، پردے اور قالین۔۔۔ کھڑکیوں کے پٹ اور دروازے۔۔۔ پھر دروازے کی آگ سرجیت تک پہنچ جائے گی۔۔۔ اتنی دیر میں لوگ آ جائیں گے۔ پٹرول کا ٹین قریب ہی رکھا ہوگا۔ وہیں ماچس بھی پڑی ہوگی۔۔۔ پاگل اور نشے کی عادی سرجو کا جرم ثابت ہو جائے گا جس نے دیوانگی کے دورے میں اس گھر کو آگ لگا دی جس کے مکین یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ سرجیت کو تھانے دار کے قتل کے جرم میں قانون کے حوالے کر دیا جائے۔۔۔ اس نے ایس پی ونود سنگھ کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی اور بلونت مداخلت نہ کرتا تو کام یاب ہو جاتی۔۔۔ مگر بلونت کو اس کی حمیت کی سزا ملی اور ایس پی نے۔۔۔ تصور ملاحظہ ہو۔۔۔ سرجیت پر صدمے کا اثر تھا۔

اس نے پٹرول کا خالی ٹین اور ماچس سرجیت کے پاس چھوڑے اور اوپر اپنی خواب گاہ کی طرف چلنے لگی۔ اس کے کان اب شیاما کی چیخ و پکار سن ہی نہیں رہے تھے۔۔۔ حویلی کے اندر پرانی لکڑی کے جلنے کی بو پھیلنے لگی تھی۔ شیاما دروازے کو توڑنے کی ناکام کوشش کے بعد اب باپ کو ہوش میں لانے کے لیے اسے پکار رہی تھی مگر پوری بوتل پی کے پھر مدہوش ہو جانے والے کنور وجے سنگھ کو اس جہنم کی قطعی فکر نہ تھی جس میں وہ جل کے خاکستر ہونے والا تھا۔ یہ کمرا اس کے لیے چتا بننے کو جا رہا تھا۔

☆☆☆

ونود آہستہ آہستہ اس گڑھے سے نکلا جو خوش بختی کے باعث اس کی ابدی آرام گاہ نہیں بنا تھا۔۔۔ ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس بے ہوشی کے وقفے میں زمین اسے ڈھک لیتی۔ اس نے بندوق اٹھا کے ایک پیر چندر سنگھ کے کندھے پر رکھا اور رائفل باہر پھینک کے دونوں ہاتھ کنارے پر مضبوطی سے جما دیئے۔

باہر آ کر اس نے وہ شکاری بندوق پھر اٹھائی اور حویلی کی طرف چلنے لگا۔ درختوں کی آڑ میں پناہ لیتا کسی غیر متوقع گولی کا نشانہ بننے سے خود کو بچاتا وہ دبے پاؤں آگے بڑھتا گیا۔ درختوں کی آڑ میں پناہ لیتا۔ کچھ جلنے کی بو اسے حویلی سے چند گز کے فاصلے پر محسوس ہوئی۔ اس نے غور کیا تو اسے نچلی منزل کے سامنے والے حصے سے اٹھنے والا کثیف سیاہ دھواں بھی نظر آیا۔

وہ بے تحاشا اس سمت بھاگا۔ اس کے لیے کلدیپ کی مایوسی کا اندازہ کرنا دشوار نہ تھا۔ مایوسی اور شکست کا احساس اس سے ظاہر ہوتا تھا۔

چندر سنگھ کی ناکامی اس کے ارادوں کی اور اس

لے شاطر ذہن کی ناکامی تھی۔ فتح مندی کے احساس لو شکست کا خطرہ درپیش تھا۔ ونود اب اس کی گرفت میں تھا مگر وہ جس کے لیے کلدیپ نے سب کچھ کیا تھا مارا گیا تھا۔ کلدیپ نے یہی سمجھا ہوگا کہ وہ مر گیا۔ اسے ایس پی نے جہنم دفع کر دیا ہے۔ ایک بہن کو تختہ دار تک پہنچانے کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ چھوٹی بہن کو آج نہیں تو کل مرنا ہی مرنا تھا۔ باپ کو وہ شراب پلا پلا کے تیزی سے موت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اب اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ آج کا کام کل نہیں چھوڑنا چاہیے۔۔۔ جو بہن ایک بھائی کی قاتل ہے وہ پاگل ہے اور نشے کی عادی ہے۔ آگ لگانے کا الزام بھی اس کی دیوانگی کے دورے پر عائد کیا جا سکتا ہے۔ سب مل کر راکھ ہو جائیں گے تو کلدیپ کے پاس ونود کا منہ بند رکھنے کے لیے ایک تصویر رہ جائے گی۔۔۔ اور اس کی اپنی گواہی۔۔۔ اس نے خود کو جس شکنجے میں جکڑا ہے وہ اس سے نکل جائے ناممکن ہے۔

عقبی دروازے کو بند پا کر وہ سامنے پہنچا۔ صدر دروازہ بھی بند تھا اور اس بھاری بھرکم دروازے سے ٹکرانا بے سود تھا۔ دروازہ بجانے اور کنڈی کو زور سے کھٹکانے کے باوجود اندر داخل ہونے میں ناکام رہا۔ اس نے پلٹ کر اس کھڑکی کا رخ کیا جس کے شیشوں سے شعلوں کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ رائفل کے ایک وار سے اس نے شیشے توڑ دیے مگر اب اس کی راہ میں لوہے کی مضبوط سلاخیں حائل تھیں۔

''شیاما۔۔۔'' وہ بے اختیار پوری قوت سے چلایا۔ کمرے میں بھڑکتے شعلے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ بستر۔۔۔ چادریں، پردے اور صوفے سبھی جل رہے تھے اور کوئی بھی چیز اس سے محفوظ نہیں تھی۔ پھر دھوئیں میں شیاما کا ہیولا ابھرا۔

''ونود۔۔۔ ونود۔۔۔!'' شیاما نے ہذیانی لہجے میں چیخنا چاہا اس کی آواز حلق میں گولے کی طرح پھنس گئی اور دھوئیں سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''دیکھو شیاما۔۔۔! تم اس کھڑکی کے پاس رہو۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔ میں دوسری طرف سے گھوم کے اندر گھستا ہوں۔۔۔ یہاں تازہ ہوا ہے۔۔۔ تمہارا دم نہیں گھٹے گا۔۔۔ اگر تم کنور صاحب کو لا سکتی ہو تو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ کے ادھر لے آؤ۔ ہمت اور حوصلے سے کام لو۔''

''اس کا۔۔۔ اس کا کوئی۔'' شیاما کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا سانس رک گیا۔ ''کوئی۔۔۔ کوئی فائدہ نہیں اب۔۔۔ ونود وہ۔۔۔'' اس نے کھڑکی کی سلاخیں بڑی مضبوطی سے پکڑ لیں اور اپنا سر کھڑکی پر لگا دیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تو سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھانے لگا۔ ونود نے رائفل نیچے رکھی اور شیاما کے پھول سے رخساروں پر تھپکی دی اور آنسوؤں کو پونچھا۔

شیاما کا جسم ہچکیوں اور سسکیوں سے لرزنے لگا۔۔۔ ونود سمجھ گیا کہ کنور وجے سنگھ کو بچانے کا وقت گزر چکا ہے۔

اس کی نظر ڈرم پر گئی جو کھڑکی سے چند قدم کے فاصلے پر رکھا تھا۔۔۔ اوپر چھت کے قریب ایک روشن دان سا تھا جو اندھیرے میں ایک خلا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ونود نے ڈرم پر چڑھ کے دیکھا۔ روشن دان میں موٹے تاروں کی جالی لگی ہوئی تھی۔ اس نے بندوق کی مدد سے اسے توڑنے کا فیصلہ کیا اور ڈرم پر سے چھلانگ لگائی۔ عشق پیچاں کی بیلوں کے نیچے کیاری میں باغ بانی کے آلات رکھے تھے۔ ونود کا پیر اس قینچی پر پڑا جو شاخیں اور پتے چھانٹنے کے کام آتی تھی۔ اس نے جھک کر قینچی اٹھائی اور پھر ڈرم پر چڑھ گیا۔

موٹے تاروں کی پرانی جالی زنگ خوردہ تھی۔ اس نے قینچی سے وار کیا اور اس کے دونوں بلیڈ جالی میں سے گزر گئے۔ دونوں ہاتھوں کا استعمال روشن دان کی اونچائی کے باعث ممکن نہ تھا۔۔۔ اس نے قینچی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کے تاروں کو کاٹنا شروع کیا۔ چند منٹ میں تار کٹ گئے مگر اس سخت کوشش

میں ونود کے ہاتھ کی انگلیاں یوں درد کرنے لگیں جیسے کسی بھاری پتھر کے گرنے سے سن ہوگئی ہوں۔ اس نے خود کو اوپر اٹھایا اور روشن دان میں سر ڈال کے داخل ہوا۔ جگہ بمشکل اتنی تھی کہ اس کا جسم گزر سکے۔ اس نے روشن دان کی چوکھٹ کو پکڑا اور پھر ٹانگوں کو کسی بازی گر کی طرح ہاتھوں کے حلقے سے گزار کر لٹک گیا۔ روشن دان غسل خانے کا تھا مگر آگ نے اس کے دروازے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ونود نیچے گرتے ہی اٹھا اور ایک جست میں دروازے سے گزر گیا۔ دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں شعلوں کی چمک کے درمیان اسے شیاما کا وجود کھڑکی پر جھکا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سانس روکا اور دھوئیں کو ہاتھ سے ہٹاتا آگے بڑھا۔

''شیاما۔۔۔!'' وہ چیخ کر جلتے ہوئے فرنیچر کے اوپر سے کود گیا۔ بے ہوش شیاما کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر وہ واپس ہوا تو اسے اپنی راہ میں آگ کا دریا مائل نظر آیا جس کی طغیانی بڑھ رہی تھی۔ اگر شیاما ہوش میں رہتی تو وہ اسے روشن دان سے نکال دیتا۔۔۔ مگر اب اسے دروازے سے گزرنا تھا جو دھڑا دھڑ جل رہا تھا اور بند بھی تھا۔ شاید دروازہ باہر سے بھی بند تھا۔ اس نے جلتے دروازے پر لات ماری۔ دروازہ باہر کی طرف ٹوٹ کے گرا۔ روشنی میں ونود کو یوں لگا جیسے جلتا ہوا پٹ کسی کے اوپر جا گرا ہو۔

پھر اس نے سرجیت کی چیخ سنی اور ونود چھلانگ لگا کے اس کے اوپر سے گزر گیا۔

وہ اور شیاما ایک ساتھ فرش پر گرے مگر اب وہ آگ سے نکل آئے تھے۔ تازہ ہوا میں ونود نے ایک گہری سانس لی اور شیاما کو دیکھا جو صرف بے ہوش تھی۔ اس کے سینے میں سانس چل رہی تھی جس سے سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس کی جلد کی نازک گلابی سطح شعلوں کی حدت سے دہک رہی تھی مگر جلد کہیں سے جھلسی نہیں تھی۔ ہاتھوں کے آبلوں کے سوا بظاہر اس کے جسم پر کہیں زخم نہ تھا۔ اس نے شیاما کو چند گز دور ہٹایا ہی تھا کہ اسے کلدیپ نظر آئی۔

کلدیپ کا ہاتھ فائر کرنے کے لیے اٹھ چکا تھا۔ ونود نے بچنے کی جدوجہد میں پھر غوطہ لگایا۔۔۔ مگر ریوالور کی پہلی گولی اس کے شانے میں پیوست ہوگئی۔ اس کے شانے کا گوشت جیسے آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔۔۔ مگر ونود نے دوسرے فائر سے پہلے ہی کلدیپ کو جا لیا۔ ونود کی ٹکر سے وہ دیوار پر جا لگی اور اچھل کے واپس آئی۔ دوسری گولی دیوار میں اتر گئی پھر ونود نے اس کی کلائی تھام لی۔۔۔ ایک جھٹکے میں کلائی ٹوٹنے۔۔۔ ریوالور کے نیچے گرنے اور کلدیپ کے چیخنے کی آواز آئی۔ پھر ونود نے اسے بری طرح گھسیٹ کے مقابل کی دیوار پر بھی زور سے دے مارا۔

کلدیپ صحت مند ہونے کے باوجود ونود جیسے مرد کی وحشیانہ قوت کے سامنے کھلونا تھی۔

دیوار سے تصادم نے اسے پلٹنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ نیچے گری اور ساکت ہوگئی۔ ونود نے پلٹ کے دیکھا تو سرجیت کا وجود شعلوں میں چتا کی طرح جل رہا تھا۔ اس کے قریب رکھا ہوا پٹرول کا ڈبا گرنے سے رہا سہا پٹرول بہہ گیا تھا اور پاگل سرجیت بے ہوشی سے موت کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔ ونود نے اپنے دل کو آگ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح پگھلتے محسوس کیا۔ اس کے آنے کے بعد سے اب تک اس گھر کا مالک مر چکا تھا۔ اس کا بیٹا مر چکا تھا۔۔۔ اور ایک بیٹی بھی مر چکی تھی۔ تیج پور کے گھرانے کی عزت کو آگ لگا کے خاک کرنے والی عورت زندہ تھی اور وہ شخص زندہ تھا جس نے اس عورت کو زندگی کے سفر میں شریک کیا تھا۔ مگر اب ان دونوں کی منزل ایک تھی۔

ونود نے وہ کیمرا اٹھایا جو کلدیپ کے گلے سے اب بھی کسی سانپ کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کیمرے کو سرجیت کی چتا پر ڈال دیا اور اسے جلتا ہوا دیکھتا رہا۔ باہر کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ونود نے شیاما کو اٹھایا اور آگ سے دور لے گیا جو ابھی

ایک ہی کمرے تک محدود تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور بوڑھے شوفر سے کہا کہ وہ فائر بریگیڈ کو فون کرے۔۔۔ مگر اس قصبے میں فائر بریگیڈ کا نام بھی لوگ نہیں جانتے تھے۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر میں شاید ہو مگر ان کے آنے میں دیر لگے گی۔

''میں بستی والوں کو بلاتا ہوں۔'' بوڑھے شوفر نے کہا۔ ''وہی آگ بجھا سکتے ہیں۔''

مگر اسے کہیں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کھڑکی سے نظر آنے والے شعلوں نے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ آدھی رات کے وقت بھی کچھ لوگ کھیتوں کو پانی لگا رہے تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی دوڑتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد گھر کے ہر برتن کی مدد سے پانی ڈال کے اس کمرے کی آگ بجھائی جا چکی تھی جس میں کنور وجے سنگھ کی سوختہ لاش پڑی تھی۔ تیج پور کے چوک میں کھڑا ہوا کنور وجے سنگھ کے دادا کا مجسمہ انصاف کی ترازو ہاتھ میں لیے اس بے حسی کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیاما کو شوفر کے سپرد کر کے ونود اس کھڑے کی طرف چل پڑا جس میں چندر سنگھ یعنی دھریندر سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔

''ونود۔۔۔!'' شیاما نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا دیدی کو پھانسی ہو جائے گی؟''

افق پر ایک سورج غروب ہو رہا تھا۔ تھانے دار کی موت سے شروع ہونے والا خونی ڈراما ایک دن میں ختم ہو گیا تھا۔ ونود نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کنور وجے سنگھ کی چتا کی راکھ سریجیت کی راکھ کے ساتھ گوردوارے کے آنگن میں دفن کر دی گئی تھی جہاں اس کے ماتا پتا جی پہلے سے دفن تھی۔ چندر سنگھ پولیس کی تحویل میں تھا اور کلدیپ کور کو ضلع کی زنانہ جیل بھیج دیا گیا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والے بھی جا چکے تھے۔

''ہم صبح یہاں سے چلے جائیں گے نا۔۔۔'' شیاما بولی۔ ''تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے نا۔۔۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں یہ سب چھوڑ

مسکراہٹیں

کنجوس لڑکے کو کنجوس لڑکی سے پیار ہو جاتا ہے۔

لڑکی: ''جب ابو سو جائیں گے تو میں گلی میں سکہ پھینکوں گی آواز سن کر فوراً اندر آ جانا، لیکن لڑکا سکہ پھینکنے کے ایک گھنٹے بعد آیا۔''

لڑکی: ''اتنی دیر کیوں لگا دی؟''

لڑکا: ''وہ میں سکہ ڈھونڈ رہا تھا۔''

لڑکی: ''پاگل! وہ دھاگہ باندھ کر پھینکا تھا، واپس کھینچ لیا تھا۔''

☆☆☆

پہلا دوست: ''یار! میں جس لڑکی کو پیار کرتا تھا اس سے میری شادی نہیں ہوئی۔''

دوسرا دوست: ''تم نے اس کو بتایا تھا کہ تمہارے ابو بہت پیسے والے ہیں؟''

پہلا دوست: ''ہاں یار.....''

دوسرا دوست: ''تو پھر؟''

پہلا دوست: ''تو پھر کیا! اس نے میرے ابو سے شادی کر لی۔''

☆☆☆

گھر کی مالکن نئی متوقع ملازمہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ہاں ملازمت کرنا اس کے لئے بہت آسان ہوگا اور اس گھر میں وہ خوش رہ سکے گی۔

اپنے گھر کی بہت سے خوبیاں گنوانے کے بعد مالکن بولی۔ ''اور یہاں بچے بھی نہیں ہیں جو تمہیں تنگ کریں۔''

''ارے بیگم صاحبہ! بچوں سے میں تنگ نہیں ہوتی..... آپ میری وجہ سے خوامخواہ فیملی پلاننگ کا تکلف مت کیجیے۔'' متوقع ملازمہ نے فراغ دلی سے کہا۔

دوں گی ونود۔۔۔! مجھے یہاں پھر لوٹ کے نہیں آنا ہے۔''

''تمہارا یہ سب قانونی حق ہے جو تمہیں مل ہی جائے گا۔'' ونود کہنے لگا۔ ''مگر میں کل تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم میری ماں سے ملو گی نا تو۔۔۔ مگر میں یہ کیسے کہوں کہ وہ خوش ہو گی۔۔۔ مجھے اسے یہ بھی تو بتانا ہے کہ اس کے اب دو بیٹے نہیں رہے۔''

شیاما نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ونود خلا میں دیکھتا رہا۔

''ایک بات پوچھوں ونود!'' شیاما بولی۔ ''تم نے شنکر چاچا کو دس ہزار روپے کیوں دیے تھے۔۔؟''

''انصاف خریدنے کے لیے۔'' ونود نے جواب دیا۔ ''اس کی گواہی کے بغیر چندر سنگھ یعنی دھرمیندر کو صرف جیل ہوتی۔۔۔ اب اسے پھانسی ہو گی۔۔۔ شنکر نے گواہی دی تھی کہ اس نے چندر سنگھ کو قتل کرتے بھی دیکھا تھا۔۔۔ اس نے کلدیپ کے ساتھ مل کر تھانے دار کو اس مجسمے پر پھانسی دی تھی۔ اس گواہی کے بغیر قتل کا جرم ثابت نہیں ہوتا تھا۔۔۔ اگر انہیں پھانسی نہ ہوتی شیاما۔۔۔! تو یہ انصاف نہ ہوتا بلکہ انصاف کی بے بسی کا تماشا ہوتا اس لیے میں نے انصاف کو تماشا بننے نہیں دیا بلکہ درس عبرت بنا دیا۔۔۔ اس کے لیے گواہی خریدنا اور رشوت دینا جرم ہے تو میں مجرم ہوں۔ وہ اس رقم سے اپنے بیٹے کی سمادھی بنوائے گا جس کی اسے بڑی آرزو تھی۔

''کیا دیدی کے لیے بھی کوئی سمادھی بنے گی ونود!'' شیاما نے پوچھا۔

ونود نے اس لڑکی کو بڑے دکھ سے دیکھا جسے نفرت کرنا آتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے بھائی کے اور باپ کے قاتل سے بھی نفرت کرنے کی اہل نہ تھی۔

''سمادھی کیا ہوتی ہے شیاما۔۔۔! مر جانے والوں کی وہ نشانی جو وارث رکھتے ہیں۔'' ونود نے کہا۔ ''ان کو یاد رکھنے کے لیے تاکہ جب وہ خود نہ ہوں۔ تو ان کے وارث انہیں یاد رکھیں۔۔۔ مگر وہ تو دل میں رہتی ہے۔ سمادھی ہو یا نہ ہو۔۔۔ قبروں کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ زمین ہو جاتے ہیں اور سمادھی بکھر جاتی ہے۔ مگر یاد دل میں محفوظ رہتی ہے۔۔۔ تم انہیں ان سب کو جو یہاں رہ جائیں گے یاد رکھنا چاہو تو ان سب کی سمادھی اپنے دل میں تعمیر کر سکتی ہو۔''

شیاما نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے اب کوئی سمادھی نہیں بنانی ہے۔۔۔ مجھے تو اپنا گھر بنانا ہے۔۔۔ حویلی نہیں ایک چھوٹا سا پیار بھرا گھر۔۔۔ سکون عافیت اور مسرت کا ضامن۔۔۔ میرا ایک ہم جماعت سریش ہے جو میرا جیون ساتھی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

''ویسے تم مجھے بہت یاد آؤ گے۔ میں تمہیں عمر بھر نہیں بھولوں گی۔ تمہارا خلوص، جذبہ اور ایثار اور ایک دوست کی سی محبت۔۔۔ تم مجھ سے ملتے آتے رہنا۔۔۔ میں ہر پوجا پاٹ میں تمہارے لیے پرارتنا کروں گی تمہیں اچھی اور مثالی شریک حیات مل جائے۔ آیا کرو گے نا؟''

''تمہاری جیسی شریک جیون شیاما۔۔۔!'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر مسکرایا۔ ''تمہیں نیا جیون مبارک ہو۔۔۔ میں تمہاری شادی میں ضرور شرکت کروں گا۔۔۔ مجھے ایک خطرناک مافیا کا قلع قمع کرنے کا حکم ملا ہے۔ اس کے بعد میں اپنا گھر بسانے کی سوچوں گا۔''

پھر شیاما کو قریب کر کے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اس بوسے میں میلا پن نہیں تھا۔ یہ دودھ کی طرح صاف اور اجلا تھا اس میں محبت کا گہرا، اچھوتا اور پاکیزہ جذبہ تھا۔

جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو ان دونوں کی آنکھوں میں موتیوں جیسے صاف و شفاف آنسو چمک رہے تھے۔

گڑبڑ جھالا

احمد صغیر صدیقی

امریکا کے رابرٹ، دہشت، جرائم اور پر اسرار کہانیوں کے عظیم لکھاری سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا ایک پرتجسس، افسوں بھرا، حیرت انگیز ناولٹ

سطر سطر پر حیرت کے دروازے وا کرتا ناولٹ

"**بہرحال** میں دوبارہ واپس آگیا ہوں۔ یاد آیا۔ ارے میں وہی شخص ہوں۔ جو جیولیس مارگریٹ کے ہاں ملازمت کرتا تھا۔ وہی مارگریٹ ۔۔۔ جادوگر جو ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتا تھا۔ جسے عفریت جمع کرنے کا خبط تھا۔"

"نہیں نہیں میں ان عفریتوں میں سے نہیں ہوں۔ میں تو ان عفریتوں کا نگراں تھا جو اس نے جمع کر رکھے تھے۔ میڈ کام ان کی دیکھ بھال تھا۔ میں ایک معنی میں ان دیومالائی عفریتوں کا چوکی دار تھا۔"

مثلاً ایک کام میرا یہ بھی تھا کہ میں مسٹر سمپسن کو غذا فراہم کروں۔ مسٹر سمپسن ایک خون آشام تھا۔ یعنی ویمپائر ۔۔۔ یاد ہے نا۔ میں جب بھی اسے یاد کرتا ہوں میری تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ میں جوری کی بھی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ ایک ویئر وولف تھا یعنی انسانی بھیڑیا۔"

میں تو فیلکس کی بھی نگہداشت کرتا تھا جس کا جسم

تو گھوڑے کا تھا مگر سر آدمی کا۔۔۔ یہ گھوڑا آدمی تھا اور میری سپردگی میں تو میٹرل بھی تھا۔ جو ایک درخت تھا مگر زندہ درخت۔ اس کے علاوہ وہاں ترانا بھی تھی جس سے مجھے مخصوص لگاؤ تھا۔ ترانا ایک جل پری تھی۔ اس کا نچلا دھڑ مچھلی کا تھا اور چہرہ عورت کا۔

میں نے اس کے لیے ایک سوئمنگ پول بنوایا تھا اور اسے پہننے کے لیے بالیاں لا کر دی تھیں۔ اس سے سمجھ لیں کہ وہ مجھے کتنی پسند تھی۔

بلاشبہ یہ سب لوگ مل کر ایک بہت عجیب مگر نہایت خوش و خرم گھرانا بناتے تھے۔ مارگریٹ کو اپنے عفریتوں کے ذخیرے پر فخر تھا اور میں ان سب سے بے حد مانوس تھا۔

پھر وہ منحوس دن آیا۔ جس روز مارگریٹ کے ذخیرے میں ایک نئے پالتو کا اضافہ ہوا تھا اور یہ اضافہ ''میڈوسا'' کا تھا۔ میڈوسا کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ ان سب کی نگاہیں جوں ہی اس پر پڑیں وہ سب کے سب پتھر کے بن گئے۔ مارگریٹ اور اس کے ساتھی بھی۔

میڈوسا سے میں نے کسی طرح نجات حاصل کی یہ ایک الگ کہانی ہے۔

لیکن جب میڈوسا مکمل طور سے تباہ ہوگئی تو اس عالی شان حویلی میں بس میں ہی ایک فرد رہ گیا تھا۔ بالکل تنہا۔ یہاں میں تھا یا وہ سارے پتھر کے مجسمے۔ یعنی مارگریٹ کا مجسمہ مسٹر سیمسن، جوری، نیکسی، زاٹا اور میٹرل کے مجسمے۔ ابھی زندہ درخت کا مجسمہ لان میں تھا۔ وہ وہیں اگا ہوا تھا مگر اب پتھر کا بن چکا تھا۔

میں مارگریٹ کے اسٹڈی میں بیٹھنے کا عادی تھا۔ یہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ یہ اس کی لائبریری تھی۔ یہاں بہت سی کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں طلسمات، جادو وغیرہ جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہاں بیٹھ کر میں غم و اندوہ میں ڈوبا رہتا تھا۔ چھیڑتا رہتا تھا۔ مارگریٹ کی بوتلوں کو جن میں جڑی بوٹیوں کے عرق بھرے ہوئے تھے، جس میں طرح طرح کے سیال اور زہر تھے۔ یہیں ایک بوتل اور تھی جس سے میں ہمیشہ دور ہی رہتا تھا۔ کیونکہ اس کے اندر ایک جنی بند تھی۔

کچھ دنوں بعد میں نے ان بوتلوں کو چھیڑنا بند کر دیا تھا اور ان کے اندر مشروبات کو پینے لگا تھا۔ کیونکہ مندرجہ بالا بوتلوں کے علاوہ مارگریٹ کے پاس عمدہ قسم کی شرابوں کا ذخیرہ تھا۔ یہ بوتلیں اس نے تہہ خانے میں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہیں وہ تابوت بھی رکھا ہوا تھا۔ جس میں کبھی مسٹر سمپسن یعنی ویمپائر سمپسن لیٹا کرتا تھا۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں رکھ سکتا۔ کوئی کہہ سکتا ہے مجھے کچھ۔ میں وہاں اکیلا تھا اور مجھے رفاقت کی احتیاج تھی۔ میں ان مجسموں کو ہر روز جھاڑتا پونچھتا تھا۔ خصوصیت سے ترانا کے مجسمے کو میں بڑے پیار سے صاف کرتا تھا۔ اسے یاد کر کے مجھے بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ میں اس کے چاندنی راتوں میں بیٹھا کرتا تھا اور پانی میں اس کے لیے مچھلیاں پھینکا کرتا تھا۔

ایسی یادوں کے ساتھ آدمی آسانی سے زندہ نہیں رہ پاتا۔ ضروری تھا کہ میں دل بہلانے کے لیے کوئی مشغل اپنا لیتا۔ بے شک میں کوٹھی سے کہیں اور جا سکتا تھا۔ لیکن میں سوچتا تھا اگر میں چلا گیا تو ان مجسموں کا کیا بنے گا یہ سب میرے دوست تھے۔ میں انہیں غیروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

تو میں وہیں رکا رہا اور مطالعہ کرتا رہا۔ جادو کی وہ قدیم کتابیں پڑھتا رہا جو مارکیٹ کی لائبریری میں موجود تھا میں یہیں اس دھندلی سی خاموشی میں بیٹھ کر جادوگری سیکھنے کی سعی میں لگ گیا تھا۔

میں انہیں بڑی لگن سے پڑھ رہا تھا۔ صفحے پر صفحے۔۔۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک مقصد موجود تھا کیونکہ میں ایک ایسے منتر، ایک ایسے افسوں کی تلاش میں تھا جس کے ذریعے میں اپنے ان دوستوں کو جو مجسموں میں بدل گئے تھے، دوبارہ زندگی

بخش سکوں۔ میں پتھر کے اس کفن کی دھجیاں بکھیرنے کے لیے کوشاں تھا۔

مجھے امید تھی یہ کیفیات کبھی کسی نہ کسی کتاب سے وہ طریقہ مجھے مل ہی جائے گا۔ جس کے استعمال سے میں ان دونوں کے پتھر کے خلاف سے باہر لے آؤں گا۔ میں ایک ایسی پراسرار طریقے کی کھوج میں تھا جس پر عمل کر کے میں کم از کم چھ عدد موکل فراہم کر سکوں۔۔۔ ایسی جنہی قوتیں جو مجھے میرے مقصد میں مدد دے سکیں۔

مجھے یقین تھا کہ ایسا کوئی طریقہ ہوگا ضرور۔

میں پڑھتا رہا۔ پڑھتا رہا۔ اِدھر اُدھر سے کچھ اشارے مل رہے تھے مگر میں کوئی زبان داں نہ تھا۔ کہ عبرانی لاطینی، وسطی فرنچ، جرمن، سنسکرت، عربی اور یونانی زبانوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا اور اگر جس کسی طرح انہیں سمجھ بھی لیتا تب بھی یہ ایسے طریقے تھے کہ ان پر وہی شخص عمل پیرا ہوسکتا تھا جو افسوں سازی میں ادراک رکھتا ہو۔ خفتہ قوتوں کے پیدا کرنے کا کام جان جوھم کا تھا تاہم ان قوتوں میں یہ صلاحیت ضروری تھی کہ وہ حیات ممنوعہ کو دوبارہ تحفتاً بخش سکتی ہیں۔

میں پھر بھی کوشش کرتا رہا۔ رات دن اسی مقصد پہ کام کرتا رہا۔ سیاہ راتیں جب میری نا امیدی کی طرح پھیلی تھیں تب بھی میں پڑھنے میں لگا رہتا تھا۔ طوفان زدہ دنوں میں بھی میں بوسیدہ کتابوں کے زرد صفحات پڑھتا رہتا تھا۔

قدیم رازوں نے میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بنا دیے تھے مگر میرا مطالعہ جاری رہا۔

ایسی ہی ایک رات تھی وہ۔ میں کتابیں کھنگال رہا تھا جب میں نے دروازے پر ہونے والی دستک سنی۔

یہ ایک حیرت کی بات تھی۔ میں پہلے سمجھا شاید یہ کوئی روح ہے۔ میں اٹھ کر ہال کی طرف چلا۔ چلتے ہوئے میں بڑے تذبذب میں تھا۔ میرے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ آدھی رات کے وقت بھلا ساحر مارگریٹ کے دروازے پر کوئی دستک دے سکتا ہے۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا اس وقت اس کی آمد میرے لیے بہتر ہی تھی۔ میں تو زمانے سے کسی ہم نفس کی شکل کو ترس گیا تھا۔

ہیجان زدہ ہاتھوں سے میں نے بڑے دروازے کی زنجیر ہٹائی اور دروازہ کھولا۔

دفعتاً ہوا کا ایک زور دار جھونکا چلا۔ پھر کسی جھاڑو کا سرا میرے سر سے ٹکرایا۔ اس جھاڑو پر ایک وچ (ساحرہ) بیٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

جھاڑو کی ٹکر سے میں فرش پر اوندھا گر گیا۔ میں نے کروٹ لے کر وچ کو دیکھا جو ہال بھر میں اپنی جادوئی جھاڑو پر بیٹھی اڑ رہی تھی۔

''ہوا''۔۔۔ وہ بڑبڑائی تو جھاڑو فرش پر ٹکراتی ہوئی ٹھہر گئی۔

وہ اس پر سے آہستہ سے اتری۔ اس کے عقب میں سے ایک بلی اور ایک کتا بھی کودے۔ وہ ساحرہ کے عقب میں اسی جھاڑو پر سوار تھے۔ وچ نے اتر کر فرش پر ایک بڑا سا تھیلا ڈال دیا۔

اس تمام عرصے میں، میں اسے تکے جا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کون ہو سکتی ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ ایک وچ ہی تھی۔ جھاڑو کی موجودگی اس کی تصدیق کر رہی تھی۔ اسی طرح اس کی ناک بھی تصدیق نامے جیسی تھی یعنی کسی چڑیا کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کے سفید بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔

مجھے عافیت اسی میں نظر آ رہی تھی کہ میں اسی طرح فرش پر پڑا رہوں بس پھر وچ نے میری طرف کڑی نگاہ سے دیکھا اور کڑکی۔ ''اٹھو اٹھ جاؤ۔۔۔ کیا مہمانوں سے اس طرح پیش آیا جاتا ہے۔''

اس نے اپنی جھاڑو کمرے کے کونے میں کھڑی کر دی۔ میں فرش سے اٹھا اور منمناتے ہوئے میں نے اس کا سامنے کیا۔ اسے اپنا نام بتایا۔ اتنی

ہمت مجھ میں نہ تھی کہ اس سے مصافحہ کرتا۔
بہر حال اس نے اس کوتاہی کا نوٹس نہیں لیا۔ اور مسکراتے ہوئے اپنے پوپلے منہ سے بولی۔
''میں مس ٹریسو ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں جوبس مارگریٹ کی ایک پرانی شناسا ہوں۔''
''اچھا۔'' میں نے کہا۔
''ہاں مجالس میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔''
''لیکن مجھے علم نہیں کہ وہ کبھی کسی مجلس میں گیا تھا۔'' میں نے کہا۔
''اوہ ۔۔۔ یہ صرف اس کا مشغلہ تھا۔ وچ کرافٹ سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ خاصا ذہین آدمی تھا یار گیٹ۔'' مس ٹریسو ہنسی۔ یہ ہنسی خاصی بھیانک سی تھی،
''اچھا تو کیا تم مجھے گھر میں نہیں لے چلو گے۔'' اس نے کہا۔
''نوجوان تمہارے اخلاق کو کیا ہوا ہے؟''
میں نے کمزور انداز میں پارلر کی سمت اشارہ کیا۔ مس ٹریسو کا دھان پان ہیولا ہال سے رینگتا ہوا پارلر کی طرف چلا۔ چلتے چلتے اس نے اپنی گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ یقین کریں اس کا سائڈ پوز ایسا ہی تھا جیسے کسی گدھ کا ہو۔ بوڑھی مادہ گدھ۔
''اوہ ۔۔۔ ہاں۔'' بوڑھی وچ نے منہ سے سیٹی جیسی آواز نکلی۔ ''میرے پالتو جانوروں کے لیے کچھ دودھ بھی فراہم کردو۔''
میں نے ان پالتو جانوروں کی طرف دیکھا۔
ایک مدقوق سا کتا۔
ایک سیاہ رنگ کی مریل سی بلی۔
یہ دونوں بوڑھی کے عقب میں بے آواز قدموں سے چل رہے تھے۔
عجلت کے ساتھ میں ہال میں پلٹا۔ پھر میں کچن میں گھس گیا جب میں لوٹا تو میرے ہاتھوں میں دودھ کی ایک پلیٹ بھی تھی۔ میں نے وچ کو اور دونوں پالتو جانوروں کو لیمپ لائٹ تلے بیٹھے پایا۔''
''تم اچھے با اخلاق نوجوان ہو۔'' وچ نے کہا۔
''انہیں دودھ پینے دو حالانکہ یہ اس سرخ غذا کے ہم پلہ نہیں لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا اچھا ہوتا ہے۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن اپنی کپکپی کو نہ روک سکا۔ ذرا ان پیارے جانوروں کے نام تو دیکھو۔'' وچ نے مجھ سے کہا۔
''کیا ہیں ان کے نام؟'' میں نے فرضی اشتیاق ظاہر کیا۔
''میں بلی کو فیڈ و کہتی ہوں اور کتے کو لپس۔''
''واہ ۔۔۔! کیا اچھے نام ہیں۔''
وچ نے بیٹھ کر اپنے پیر پھیلا دیے۔ پھر اس نے فرش پر پڑے ہوئے اپنے بڑے سے تھیلے کا منہ کھولا۔ اس نے تنگ بیگ کے اندر سے موم کی ایک چھوٹی سی گڑیا برآمد کی پھر اس نے سوئیوں کو اس کے بدن میں چبھونا شروع کردیا۔
''اگر تم برا نہ مانو تو میں باتوں کے ساتھ کام بھی کرتی رہوں؟'' بوڑھی وچ نے کہا۔
''بے شک جو جی چاہے۔''
جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ یہ ایک انسانی بازو تھا۔ کٹا ہوا۔ اور ایک پیر بھی تھا۔
''قاتلہ بھی ہو۔'' میں بڑبڑایا۔
مس ٹریسو بڑبڑائی۔ ''کیوں مذاق کرتے ہو۔ میں نے برسوں سے کسی کو قتل نہیں کیا۔ تم غلط سمجھے ہو یہ ہاتھ پیر انسان کے نہیں دکان میں رکھی جانے والی ڈمی کے ہیں۔''
پھر اس نے تھیلے سے چند مزید اعضا برآمد کیے۔ ایک اور بازو، ایک اور ٹانگ، پیٹ وغیرہ آخر میں اس نے ایک خوب صورت سا سر بھی نکالا جس کے اوپر ایک اخروٹی بالوں کی وگ بھی لگی ہوئی تھی۔
ماہرانہ انداز سے اس نے تمام اعضا کو ملا کر جوڑنا شروع کردیا اور چند لمحوں میں میرے سامنے ایک مکمل ڈمی موجود تھی اور یہ اخروٹی بالوں والی بڑی خوب صورت سی ڈمی گڑیا تھی۔

''میری اپنی گڑیائیں بہت چھوٹی تھیں۔'' مس ... نے بتایا۔ ''لہٰذا میں نے سوچا ایک ڈمی گڑیا ... دوں اس پر آسانی سے کام کیا جا سکتا ہے۔ پرلی ... مومی ڈمی ہی ہے اور قد آدم بھی۔ کیا خیال ہے۔ ... ہی ہے نا؟''

دفعتاً مس ٹریسو نے منہ بنایا اور بولی۔

''اب ہمیں کچھ کام کی بات کرنی چاہیے، اس نے کہا۔ ''میں یہاں ایک مقصد کے ساتھ آئی ہوں مجھے تم مارگریٹ سے ملواؤ۔''

''وہ تو نہیں مل سکتا۔'' میں نے خاصے غیر محتاط انداز سے کہا۔ ''وہ پتھر کا بن گیا ہے۔''

جواباً وچ مسکرائی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ وہ بھی اور اس کے سارے پالتو بت پتھر کے بن چکے ہیں مگر میں مارگریٹ کو چاہتی ہوں۔''

''یعنی تم اس کے مجسمے کی خواہاں ہو۔''

پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا واقعی میرے سوال پر مس ٹریسو شرما سی گئی تھی۔

''مارگریٹ سے میری پرانی شناسائی رہی ہے۔'' وچ نے کہا۔ ''اسی تعلق کی بنا پر میں اس کے مجسمے کو ذرا قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

نہ جانے کیوں مجھے بڑھیا کی بات دل کو نہیں لگی۔ وہ مجھے سرے سے جذباتی ہی نہیں لگتی تھی۔ ضرور اس کی تہہ میں کوئی راز تھا۔ میں نے سوچتے ہوئے ایک حکمت عملی مرتب کی۔

''ویسے مس ٹریسو۔۔۔!'' میں نے سوچتے ہوئے ایک حکمت عملی مرتب کی۔

''تفصیلی گفتگو سے قبل کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ تم کچھ کھا لیتی۔''

وچ نے بے دلی سے کہا۔ ''تم کہتے ہو تو کوئی حرج نہیں۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس کچھ انسانی خو۔۔۔'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ پھر بولی

''مگر تمہارے پاس یہ کہاں ہوگا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں ابھی آیا۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

تہہ خانے سے جب میں باہر آیا تو میرے پاس آئرش وہسکی کی ایک بوتل اور دو گلاس تھے۔ پارلر میں بیٹھ کر میں نے دو گلاس بنائے۔ مس ٹریسو نے اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ میں نے یہ گلاس پھر بھر دیا۔ مس ٹریسو نے اسے بھی خالی کر دیا تو میں نے پھر بھر دیا۔

''خوب۔'' وچ نے کہا۔ ''اس میں نشہ ہے۔''

''مارگریٹ کو یہ شراب بہت پسند تھی۔'' میں نے کہا۔

''خوب یاد دلایا۔'' وچ نے کہا۔ ''بوتلوں کی بات پر میں تمہیں بتا دوں کہ میں نا صرف مارگریٹ اور اس کے عفریتوں کے مجسمے خریدنے کی خواہاں ہوں بلکہ میں اس جن کو بھی چاہتی ہوں جو میرے خیال میں یہاں کسی بوتل میں بند ہے۔۔۔ ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''تاہم میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کا پانچواں گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم آخر ان مجسموں کا کیا کرو گی؟''

اس نے پانچواں گلاس بھی خالی کر دیا تو میں نے چھٹا بنا دیا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جذباتی تعلق کی بنا پر میں اس کا مجسمہ لینا چاہتی ہوں۔۔۔ کیوں یہی کہا تھا نا میں نے۔'' اس پر اب شراب نے اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔

''ہم لوگ دوست ہیں۔'' میں نے سیاسی فراست استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بتا سکتی ہو کہ تم ان مجسموں کا کیا کرو گی۔''

''خوب۔۔۔!'' مس ٹریسو نے کہا۔ ''نوجوان آدمی تم ہوشیار آدمی لگتے ہو مگر میں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گی کہ میں ان مجسموں کو صرف اس

لیے لے جا رہی ہوں کہ انہیں پھر سے زندگی بخش سکوں۔''

میں مسکرایا۔

''فرض کرو کوئی دوسرا شخص انہیں جگانا چاہے تو کیا جادو کے ذریعے یہ ممکن ہوسکتا ہے؟''

''میرے پالتو۔۔۔ ہاں افسوں کے زور سے سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔'' وچ نے کہا۔ ''کہیں اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔''

وچ نے ہاتھ بڑھا بوتل کو اٹھالیا۔

''اور یہ قیمت۔۔۔؟'' اس نے کہا۔ ''تم جیسے نوجوان کے لیے خاصی زیادہ ہوگی البتہ میرا معاملہ اور ہے۔ میں اس دشت کی پرانی سیاح ہوں۔ میں جو کچھ ادا کرواتی وہ معمولی قیمت ہوگی مثلاً میں خود ہی ایک شیطان کو طلب کرسکتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے اپنی روح کا سودا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں تو اپنی روح کا سودا ایک زمانہ پہلے کرچکی ہوں۔'' اس کے بعد وہ زمانہ۔۔۔ بہت زمانہ کی تکرار کرتے ہوئے نشے میں گنگنانے لگی۔ میں نے اسے ہوشیار کرنے کے لیے کھنکارا۔

''خوب! تو تم ان مجسموں کو پھر سے زندہ کرنے کے بارے میں کہہ رہی تھی۔'' مس ٹریسو نے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میرا مسئلہ آسان ہے۔ جہنم والوں پر میرے کچھ واجبات ہیں۔ اس کی رو سے میں کچھ طاقتوں کی وصولی کا استحقاق رکھتی ہوں۔ میں اپنے دوست شطان کو طلب کرسکتی ہوں۔ وہ میرے حکم پر پلک جھپکتے میں ان مجسموں کو دوبارہ زندہ کرسکتا ہے۔''

''لیکن شیاطین کو طلب کس طرح کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اس کے لیے ایک کالا عمل کرنا ہوتا ہے۔'' وہ ایک دم سے چپ ہوگئی۔ پھر بولی۔

''بس اب میں مزید نہیں بولوں گی۔''

میں اس کے لیے تیار تھا اور میرے پاس ایک اسکیم بھی تھی۔ میں اس پر عمل کر کے اپنے دوستوں کو پتھروں سے نکال سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اسی پر عمل کیا۔

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔'' میں نے وچ کو تاؤ دلایا۔ ''تم صرف شیخیاں بگھار رہی ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''سیاہ عمل وغیرہ کی باتیں کرنے سے کوئی مرعوب نہیں ہوسکتا۔'' میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم سرے سے کوئی وچ ہی نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے صرف بھیس بدلا ہے۔''

میری ترکیب اچھی تھی۔

''اچھا تو میں ایک نقلی وچ ہوں۔'' نشے کی حالت میں اس کی برہمی بڑھی ہوئی تھی۔ ''احمق آدمی میں سارے براعظموں میں سب سے مشہور وچ ہوں۔''

''عملِ سیاہ ہرایرے غیرے کا کام نہیں۔'' میں نے اس کے غصے کو مزید بڑھانے کے لیے کہا۔

مس ٹریسو نے بوتل منہ سے لگالی اور ساری شراب پی گئی۔ اس نے بوتل ایک طرف پھینکی اور اٹھتے ہوئے اس نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھا۔

''اچھا تو دیکھو۔'' وہ ہتھے سے اکھڑتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں دکھاتی ہوں یہ کالا عمل کیسے کیا جاتا ہے۔ تم چاہو تو میں عملِ سیاہ ہی نہیں عمل دھاری دار بھی تمہیں دکھا سکتی ہوں جو اس سے بھی اوپر کی چیز ہے۔''

مس ٹریسو غصے میں چھلانگیں مارتی باہر کی طرف نکل گئی میں اس کے پیچھے تھا۔ میری سانس پھول رہی تھیں۔

پھر ہم اس بڑے کمرے میں پہنچے جس میں وہ پتھریلے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک لیمپ جلایا اور اپنے دوستوں کے چہرے اسے دکھائے۔ یہاں خاصے بڑے سے پیٹ والا جولیس مارگریٹ تھا جس کے پتھریلے چہرے پر حیرت کھدی ہوئی تھی۔ یہاں دبلا پتلا سمپسن بھی تھا جس کے نقلی دانت مسکراہٹ سے جھانک رہے تھے۔ یہاں جوری تھا جو اب پتھر کا بھیڑیا بن چکا تھا اور ایک پنجہ اٹھائے

کھڑا تھا۔ ایک اعلانسل کا گھوڑا سوائے اس کے کہ سر آدمی کا تھا وہ اس پتھریلی حالت میں بھی شریف لگ رہا تھا اور ترانا تھی۔ وہ تو تھی ہی جل پری۔

وچ نے ناک چڑھائی۔

''تو تم سمجھتے ہو میں نقلی وچ ہوں اور میں کالا عمل نہیں کر سکتی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کہ تم زمین پر ایک ہشت پہلو ستارہ بناؤ گی نیلی چاک سے۔ پھر تم اس پر کچھ جڑی بوٹیاں یا متبرک پانی یا شراب چھڑکو گی پھر تم کسی منتر کا جاپ کرو گی۔۔۔ اور۔۔۔ اور شاید کسی کنواری کی قربانی بھی ہو گی۔''

''ہوں۔۔۔ پھر۔۔۔'' وچ نے ہنکاری بھری۔

''لیکن یہاں سارا سامان نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

مس ٹریسو بڑبڑائی۔ ''کوئی پروا نہیں۔۔۔ تمہارے پاس کچھ چاک تو ہو گی ہی مارکریٹ ضرور رکھتا ہو گا۔''

میں نے لائبریری کھنگالی اور نیلی چاک کے ساتھ پلٹا۔ مس ٹریسو کچن میں گھسی ہوئی تھی۔ وہ وہاں سے کچھ چیزیں نکال کر آئی۔

''یہ لو چاک۔'' میں نے کہا۔

وہ فرش پر جھک گئی اور ایک تصویر بنانے لگی۔ وہ ہانپتے ہوئے اٹھی۔۔۔ ''یہ کوئی ستارہ وتارہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں صرف چار کونے ہیں۔''

''چاک ختم ہو گئی تھی۔'' وچ نے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

پھر اس نے منہ میں کچھ ڈالا اور چبانے لگی

''یہ ہولی ویفر ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مس ٹریسو نے کہا۔ ''وہ یہاں نہیں لہٰذا میں نے گم سے کام چلایا ہے۔''

پھر اس نے پیالے میں سے کوئی چیز لی۔

میں نے کہا۔ ''اچھا تو یہ ہے وہ مقدس شراب۔''

''نہیں۔'' وچ نے کہا۔ ''یہ کوکا کولا ہے۔ کس کو پتا چلے گا بھلا۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ پھر وہ کمرے سے چلی گئی۔ آئی تو اس کے ہاتھ میں وہی ڈی گڑیا دبی ہوئی تھی۔ اس نے اسے دو کرسیوں کے اوپر رکھ دیا۔ ''قربانی کے لیے ہمارے پاس کوئی عریاں کنواری نہیں ہے۔ میں شیطان کو بلانے کے لیے ڈی کو استعمال کر لوں گی۔''

اندھیرے میں چاک نے چمکنا شروع کیا۔ وچ ڈی پہ جھک گئی اور منہ میں بدبدانے لگی۔

''ذرا ٹھہرو۔'' میں چیخا۔ ''مجھے تمہارا منتر اصلی نہیں لگتا۔ وہ تو لاطینی زبان میں ہے۔''

''مجھے اس وقت لاطینی نہیں آ رہی ہے۔'' بڑھیا نے کہا۔

''میں جیرانی میں پڑھ رہی ہوں۔''

وہ بدبداتی رہی۔ پھر اس نے اپنی استخوانی انگلیوں سے کچھ اشارے شروع کر دیے۔ اس کی آواز اب گہری ہو چلی تھی۔ پھر وہ تقریباً چیخنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے فرش پر بنا ہوا ستارہ رقص کرنے لگا ہے۔ دوسری نگاہ پر احساس ہوا کہ میرا تاثر درست ہے۔ پھر وچ جھومنے لگی۔ جھومتے جھومتے وہ فرش پر لڑھک گئی۔

''گئی۔۔۔'' میرے منہ سے نکلا۔ ''۔۔۔ مجھے پتا تھا اس میں اتنی جان نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہو گا۔''

''کیا نہیں ہو گا؟''

''یہی کہ۔۔۔'' میں ایک دم سے رک گیا۔ یہ سوال مس ٹریسو نے نہیں کیا تھا۔ یہ آواز تو کسی اور کی تھی۔ فرش پر بنے نقش کے اُدھر میں نے دیکھا کہ مجھ سے یہ سوال کس نے کیا ہے۔

اور تب۔۔۔ میں خود بھی بوڑھی وچ کی طرح ڈھلک گیا لیکن پوری طرح نہیں۔

یہ یقیناً کوئی شیطان تھا۔

اس کی آنکھیں سرخ سرخ تھیں۔ اس کا بدن کسی چھپکلی سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے کئی سر تھے اور یہ

سارے سر بالکل گنجے تھے۔ یہ شیطانی ہڈیوں کا ایک پنجر تھا اور یہ سو فیصد کوئی شیطان ہی تھا۔

''اور تب میں نے اس کی دم بھی دیکھ لی جو بے چینی سے ہل رہی تھی۔

''چلو شروع ہو جاؤ۔'' اس کے منہ سے غراہٹ نکلی۔

''اے احمق انسان۔۔۔ بول کیا کہتا ہے۔''

''کیا مطلب۔'' میں جواباً ہکلایا۔

''گدھے۔'' وہ چنگھاڑا۔ ''چکر دیتا ہے مجھے۔ ہر جگہ دھوکا۔ منتر میں ہیر پھیر، اشیا میں ملاوٹ ابے تو تو میرا ابھی باپ لگتا ہے۔''

''لیکن۔۔۔''

''سن۔'' وہ گرجا۔۔۔ اس کا بدن زلنے لگا۔ تیری وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا ہے، میری جلد گھٹنے سے چھل گئی ہے اور۔۔۔ اور یہ سب کیوں ہوا ہے۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''صرف اس لیے کہ ایک مکار افسوں گر نے مجھے غلط طرح سے طلب کیا تھا۔ جب تجھے نہیں معلوم تھا کہ مردوں کو کس طرح جگایا جاتا ہے تو تُو نے میرے ساتھ ایسی حرکت کیوں کی۔ کیا تیرے پاس وہ کتاب نہیں جس میں شیطانوں کو طلب کرنے کے طریقے درج ہیں۔''

''صبر۔۔۔ صبر۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

''دیکھو۔'' میں نے کہا ''تمہیں میں نے طلب نہیں کیا ہے۔ یہ کام مس ٹریسو کا ہے۔ وچ ٹریسو کا۔ وہ نشے میں تھی۔ اسے رسومات یاد نہیں آ رہی تھیں۔''

شیطان نے منہ بنایا۔ ''ٹھیک ہے پڑی رہنے دو بد بخت کو۔''

''میں تو شراب کو چھوتا بھی نہیں۔'' میں نے سر ہلا کر خوشی کا اظہار کیا۔

تب اس شیطان نے ایک چکرا دینے والی حرکت کی اس نے اپنی ربر جیسی گردن سے اپنے ایک سر کو کھینچا۔ وہ کوئی گز بھر لمبا ہو گیا۔ میں گھبرا کر اچھلا۔

''ٹھیک ہے اب تو میں آ ہی گیا ہوں۔ معاملہ کیا ہے آخر۔'' اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ ''کیا مجھے فضول میں بلایا گیا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے میں کسی کو کھانا چاہتا ہوں۔ یا پھر مجھ سے سودا کرو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔''

''میں تم سے سودے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم۔۔۔؟'' شیطان نے مجھے گھورا۔ ''مگر تم کوئی جادوگر نہیں ہو۔ پھر تم بھلا مجھے کیا دے سکو گے۔ اپنی روح دے سکتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''آج کل روح کے سودے پر خاصا منافع ملتا ہے۔'' شیطان نے کہا۔

''نہیں مجھے دلچسپی نہیں۔''

''تب تو مجھے واپس ہو جانا چاہیے۔'' شیطان نے کہا۔

''ذرا ٹھہرو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں دینے کے لیے میرے پاس ایک بہت عمدہ سی چیز ہے۔ یہ بتاؤ کسی جنی کو حاصل کرنا پسند کرو گے۔''

''جنی۔'' شیطان کے چہرے پر تعجب ابھر آیا۔ ''کیا واقعی تمہارے پاس کوئی مادہ حیات ہے۔''

''ہاں بالکل ہے اور ایک بوتل میں بند ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا رکو میں اسے لا کر دکھاتا ہوں۔'' وہ اشارہ کرنے لگا۔

گھنٹہ بھر بعد میں لوٹا تو جنی والی بوتل میرے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اسے گھورا اور مجھ سے پوچھا۔ ''لو کیا مانگتے ہو اس کے لیے؟''

''تمہیں میری ایک خواہش پوری کرنی ہو گی۔''

''صاف صاف بتاؤ۔''

''میں ان مجسموں کو زندہ کرانا چاہتا ہوں جو پتھر میں ڈھل گئے ہیں۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اردگرد کے مجسموں کو دکھایا، تم انہیں پتھروں سے آزاد کرا دو۔''

''یہ بہت مشکل کام ہے۔'' شیطان بڑبڑایا۔

''کوئی اور قیمت بتاؤ۔ کوئی حسین عورت چاہیے؟''

''تم عورت کو چھوڑو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ مجسمے زندہ کردو۔'' شیطان نے گردن جھٹکی۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''دیکھو معاملہ ایک اجنبی کے وصل کا ہے۔ میں نے بوتل اس کے سامنے لہرائی۔ ''یہ تمہاری وائف کی ہے۔ ابھی بوتل میں بند ہے۔ ذرا سوچو کہیں بوتل میں بند کردیا جائے تو تمہارا حال کیا ہوگا؟''

اس کا چہرہ پر خیال ہوگیا۔

میں نے سوچا۔ میں نے پالا مار لیا ہے۔

''میں خاصا نرم دل کا ہوں۔'' شیطان نے کہا۔ ''دیکھو، میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ کراہا۔۔۔ ''تم نے بہت بڑا کام میرے لیے رکھ دیا ہے۔ اس میں بہت پیچیدگی ہے۔''

''سوچ لو۔۔۔ معاملہ جنی کا ہے۔'' میں نے اسے اکسایا۔

''ذرا رکو۔'' شیطان نے کہا۔ ''اس میں گڑبڑ کا بھی بہت امکان ہے۔''

اور پھر واقعی۔۔۔ گڑبڑ ہو ہی گئی۔

شیطان جھک گیا۔۔۔ اور ہوا سنسنانے لگی۔

میں مسکرایا۔ پھر وہ زمین پر مینڈک کی طرح پھدکنے لگا۔ پھر دھواں سا اٹھا۔ کثیف سا دھواں۔ میں اطمینان سے سارا تماشا دیکھتا رہا۔

لیکن جب چھت کا فانوس زوردار دھماکے سے گرا تو میں اچھل کر دیوار سے جا بھڑا اور فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ میں مس ٹریسو کے ساتھ ہی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسی لمحے مجھے لگا جیسے کسی لمبے سے ہاتھ نے مجھ جنی والی بوتل چھین لی ہے۔ مگر مجھے ہوش کہاں تھا کہ میں کچھ کرسکتا۔

جب میں جاگا تو میرے رخساروں پر خون بہہ رہا تھا۔ فانوس کی کچھ کرچیاں میری پیشانی میں گھل گئی تھیں۔

''لعنت ہو۔'' میں کراہا۔

''اوہ۔۔۔ ایک اجنبی آواز کہیں سے ابھری۔

☆☆☆

پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مس ٹریسو اور فانوس دونوں ہی فرش پر پڑے تھے۔ لیکن شیطان غائب ہو چکا تھا اور جنی والی بوتل بھی موجود نہ تھی۔

میں نے روشنی کی تلاش شروع کی اور سنائی دینے والی آواز کا پتا چلانا چاہا۔

جس وقت روشنی ہوئی میں نے مجسموں کی طرف دیکھا تو پتا چلا وہاں مجسمے نہیں رہے ہیں۔

وہ سب کے سب جی اٹھے تھے مجھے ان کے جسم نظر آرہے تھے۔ آدمی، گھوڑے، بھیڑیے وغیرہ سب متحرک تھے۔

میں لپک کر جل پری ترانا کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے خوب صورت چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''ترانا۔۔۔ میری جان!'' میں نے اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

''اے ہٹو! ایک طرف ورنہ میں تمہارے سارے دانت پیٹ میں لے جاؤں گا۔'' ایک بھاری آواز ترانا کے منہ سے نکلی۔

میں نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ ''ترانا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''ترانا کے بچے میں کہہ نہیں رہی ہوں۔ کہہ رہا ہوں۔۔۔ میں جل پری نہیں ہوں۔ ایک گھوڑا ہوں۔'' وہی بھدی سی آواز ابھری۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اس آواز کو میں نے پہچان لیا تھا۔

یہ انسانی چہرے والے گھوڑے کی آواز تھی جو بول سکتا تھا۔ مگر یہ آواز جل پری ترانا کے منہ سے نکل رہی تھی۔ میں لپک کر گھوڑے کی طرف بڑھا۔

''ہیلو، میرے دوست۔'' اس کے منہ سے آواز نکلی یہ آواز ایک گھوڑے کے منہ سے برآمد ہوگئی تھی۔ لیکن۔۔۔ لیکن یہ آواز گھوڑے کی نہیں تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا یہ آواز تو میرے مالک

افسوس گر مارگیٹ کی تھی۔

''ت۔۔۔تم کون ہو۔'' میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

گھوڑا مسکرایا۔ اس کا منہ انسانی تھا۔ اس نے کہا۔ ''ارے میں جولیس مارگریٹ ہوں میاں!''

میں نے چکرا کر اسے دیکھا۔ ''واقعی۔''

''ہاں اور کیا۔''

''آدھر آؤ۔'' میں نے کہا اور گھوڑے کو گردن سے پکڑا اور اسے دیوار میں لگے قد آدم آئینے کے سامنے کر دیا۔

''ذرا اس میں اچھی طرح دیکھو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

☆☆☆

اس نے خود کو بغور دیکھا۔ اس کی گردن کے پیچھے گھوڑے کا بدن جڑا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی نڈھال ہو گیا۔ لیکن میں تو مارگریٹ ہوں۔'' وہ کراہا۔ ''مگر میرا جسم تو جرنیکس کا دکھتا ہے۔''

''اور جرنیکس ترانا کے بدن میں گھسا ہوا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تو پھر میرے بدن میں کون ہے۔'' مارگریٹ چیخا۔ وہ لپک کر اپنے جسم کی طرف بڑھا۔ اس نے احتیاط سے اس کے سینے کو چھوا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔'' ایک اونچی آواز سنائی دی۔

''مارگریٹ نے سرگوشی کی۔ ''اوہ میرے خدا۔۔۔میں ایک پیڑ کے اندر گھس گیا ہوں۔''

''ہاں، تمہارے بدن میں اب میں ہی براجمان ہوں۔'' میڈل نے کہا۔

''یہ سب کیسا چکر ہے۔'' وہ گونجیلی آواز مجھے سنائی دی جسے میں نے بے ہوشی سے نکلتے وقت سنی تھی۔ یا آواز ویمپائر سمپسن کی تھی۔ میں سمپسن کی طرف مڑا۔

''لیکن میں ایک بھیڑیے کے بدن میں نہیں ہوں۔'' اسی آواز نے کہا۔ ''میرا بدن کسی کے پاس ہے۔ میں تو اس مسٹر سمپسن کے جسم میں ہوں۔''

معلوم ہوا ویمپائر کے جسم میں جوزی ہے جوزی کے جسم میں ایک انسانی بھیڑیا تھا اور چارہ ویمپائر سمپسن اس وقت جوری کے قالب میں تھا۔ یعنی ایک بھیڑیے کے بدن میں۔

''یہ ایک ویمپائر کی صریحاً بے عزتی ہے۔'' بھیڑیا غرایا۔

''کوئی عجیب ہی خوف ناک سانحہ ہو گیا ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے اسے بتایا۔ ''تم لوگ زندہ تو ہو گئے ہو لیکن تمہارے قالب ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے ہیں یعنی تمہاری روحیں غلط جسموں میں چلی گئی ہیں

تب مجھے یاد آیا کہ ترانا کے بدن پر اس وقت جرنیکس کا قبضہ ہے مگر سوال یہ تھا کہ آخر ترانہ کہاں ہے؟''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تب مجھے وہ دکھائی دے گئی۔ میں نے اس پیڑ کو دیکھا تھا جو وہاں رکا ہوا تھا۔ یہ بھی ''میڈل'' ہوا کرتا تھا۔ بولتا درخت ظاہر ہے کہ ترانا کو اسی میں ہونا چاہیے تھا۔

کمرے سے نکل کر میں ان میں پہنچا اور درخت کے تنے سے لپٹ گیا۔

''ترانا۔۔۔میری جان!''

مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

''ترانا کہ بولتی کیوں نہیں۔'' میں کراہا۔

جب پھر کوئی جواب نہیں ملا تو میں دھیمے قدموں واپس ہو لیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے پھر آواز لگائی۔ ''ترانا۔۔۔!''

''ڈارلنگ! میں یہاں ہوں۔''

ایک سریلی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ میری طرف وہی ڈی گڑیا چلی آ رہی ہے۔ جو مس ٹریسو کی تھی۔

وہ آتے ہی میرے بازو میں جھول گئی۔

وہ بالکل زندہ تھی۔۔۔لیکن اس کا بدن موم کا تھا۔ اب میرے سمجھ میں آیا کہاں کہاں کیا کیا گڑبڑ

ہوئی تھیں۔ اس گڑبڑ میں ترانا کی روح کو شیطان نے گڑیا کے اندر منتقل کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی بے جان تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ۔۔۔ ایمپائر ہیئر یئے کے بدن میں تھا۔

ویئر دولف ویمپائر کے جسم میں تھا۔

ایک آدمی نصف گھوڑا نصف انسان بنا ہوا تھا اور ایک گھوڑا جل پری کے جسم میں تھا۔

اور جل پری ڈمی گڑیا کے اندر تھی۔

میڈل کے بدن میں کسی کی روح نہیں تھی۔ اور میڈل خود مارگریٹ کے بدن میں فروکش تھا اور میں اس گڑبڑ جھالے میں گردن تک دھنسا ہوا تھا۔

وہ بڑا ہی برا موقع تھا۔ جب مس ٹریسو کی غشی ٹوٹی تھی۔ جاگتے ہی اس نے رفتار سے کمرے کا جائزہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئی۔

''اچھا تو تم نے شیطان سے سودے بازی کر ہی لی۔''

اس نے کہا۔ ''خوب تم نے اسے جنی دی ہوگی خوب چالاک جوان ہو تم اور میں۔۔۔''

اس کی نظر مارگریٹ پر پڑی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا تاثر بدل گیا۔ وہ پہلے ہی بتا چکی تھی کہ مارگریٹ سے اس کا جذباتی تعلق ہے۔

اس نے خود کو سیدھا کیا۔ چہرے کے بالوں کو ہٹایا اور مسکرانے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مگرمچھ مسکرا رہا ہو۔ وہ مارگیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''اوہ۔۔۔ مائی ڈیر مارگریٹ!''

''اے اپنا ہاتھ پرے کرو۔۔۔ بوڑھی گائے!'' ایک تیز آواز ابھری۔

مس ٹریسو ٹھٹک گئی اور آدمی کی سمت دیکھنے لگی۔

''مجھے گھور و نہیں۔'' بوڑھے پیٹر میڈل نے کہا۔ جس کی روح اس وقت مارگریٹ کے جسم میں تھی۔

مس ٹریسو کو اس گڑبڑ کا علم نہیں تھا۔ وہ بڑی الجھن میں تھی۔

''میں ادھر ہوں ڈیئر!'' ایک آواز نے مس ٹریسو کو پکارا۔

''جولیس مارگریٹ!''

وچ نے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز ایک گھوڑے کے منہ سے نکل رہی ہے۔ وہ کانپنے لگی۔

''اوہ ڈیئر! تو تم مجھے پہچان نہیں پا رہی ہو۔'' دم ہلاتے ہوئے مارگریٹ نے کہا۔

مس ٹریسو آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ''یہ کیا مذاق کیا جا رہا ہے مجھ سے۔'' وہ بھنائی۔

''یہ مذاق نہیں ہے ڈیئر۔'' مارگریٹ نے کہا۔

''تم میرے پاس آؤ۔''

وچ اپنی جگہ جم گئی۔ ''میں یہاں سے جا رہی ہوں۔'' وہ لکی اس نے اپنے دونوں جانوروں کو پکارا تھیلا سنبھالا اور جھاڑو پر سوار ہوگئی تب اسے یاد آیا۔

''ہاں۔۔۔ وہ میری ڈمی گڑیا کدھر ہے؟''

''میرا نام مت لینا۔'' ترانا چیخی۔

''اچھا۔۔۔ تو تم بولنے بھی لگیں۔ خوب!'' وچ مسکرائی۔

''ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔''

''میں ادھر ایک بڑی گڑبڑ دیکھ رہی ہوں۔'' وچ بڑبڑائی۔

''یہی بات تو میں تم سے کہہ رہا تھا۔'' میں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا۔

مس ٹریسو نے سر ہلایا۔ ''کچھ بھی ہو میری ڈمی گڑیا میری ملکیت ہے۔''

''چلو چلتی بنو۔'' ترانا چیخی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' مارگریٹ نے کہا۔

''تمہارا اس کی روح پر کوئی حق نہیں بنتا۔ تم اب جاؤ۔''

''تم مجھے بھگا رہے ہو۔'' وچ چیخی۔

''ہاں تم جاؤ ورنہ میں دولتیاں مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔'' مارگریٹ بھی برہم ہوگیا۔

مس ٹریسو دروازے کی سمت بڑھی۔

''ٹھیک ہے گھوڑے! ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔

پھر اس نے جاتے جاتے دروازے کو زور سے بند کر دیا۔

☆☆☆

کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی تھی اور یہ خاموشی مہلک تھی۔ مجھے اس کا احساس تھا۔ میں جانتا تھا میرے اردگرد موجود لوگ اپنے جسموں میں با آسانی کنٹرول نہیں کیے جاسکتے۔ مگر اب اور کیا ہوسکتا تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی مناسب تدبیر سوچوں۔

''طویل سفر کی وجہ سے تم لوگ بھوکے ہو گے۔'' میں نے کہا۔

''چلو کچن میں چلتے ہیں۔''

میں ان سب کو کچن میں لے گیا۔

انہوں نے ڈٹ کر کھایا۔ جل پری کو دلیا کھاتے اور گھوڑے کو سگار پیتا دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ میری بھوک تو مرگئی تھی۔ ان سب کو نئے جسم ملے تھے اس لیے انہیں کھانا تک کھانے کا طریقہ نہیں آرہا تھا۔

کھانے کے بعد ان سب پر خوف طاری ہونے لگا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' جرمیکس نے کہا۔ ''ہم اب کیا کریں گے۔'' میں کھانے کے بعد کچھ دوڑ لگانے کا عادی ہوں مگر میں ایک جل پری کے جسم میں ہوں۔

''میرا جی چاہتا ہے کہ میں باہر کھلے میں جاؤں تاکہ مجھے ہوا لگ سکے۔'' میٹرل نے کہا۔ ''مگر میں آدمی کے بدن میں ہوں کوئی فائدہ نہیں مجھ پر تو کوئی پرندہ بھی نہیں بیٹھے گا۔''

''اے ۔۔۔ میرے جسم پر چڑیوں کو مت بٹھانا۔'' مارگریٹ نے کہا۔

''تمہارے بدن پر۔۔۔؟''

''ہاں اور کیا۔۔۔ یہ بدن بہرحال میرا ہے۔''

''اور میرے بارے میں کیا کہتے ہو۔'' جوری نے پوچھا۔ ''میں صبح منہ اندھیرے اٹھ کر ہنکارے مارنے کا عادی ہوں۔ لیکن میں ایک ویمپائر کے جسم میں ہوں جو صبح ہوتے ہی تابوت میں سو جانے کا عادی تھا۔''

''تمہیں اپنی پڑی ہے۔'' ویمپائر سمپسن نے مداخلت کی۔

''مجھے دیکھو۔ میں ایک چوپائے کے بدن میں پھنس گیا ہوں میں نے کتنی سوئیٹس لگالی ہیں مگر ابھی تک انسانی جون میں نہیں آسکا ہوں۔۔۔ جوری مجھے بتاؤ آخر تم انسانی جون میں کس طرح آتے تھے۔''

''تم سب کا مسئلہ اتنا بڑا نہیں۔'' مارگریٹ نے کہا۔ ''مسئلہ میرا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ایک گھوڑے کے بدن میں رہ کر ہائی سوسائٹی میں کس طرح بیٹھ سکوں گا۔ ڈرو۔ تم لوگ میرے انجام سے ڈرو۔''

قدآدم ڈمی کے بدن میں جل پری ترانا خاصی خوش تھی۔

''آؤ ہم دونوں تالاب میں نہاتے ہیں۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا موی بدن خراب ہوجائے گا۔''

''ایک دم سے اداس ہوگئی۔ اسے تو پانی سے ایک رغبت تھی۔''

''ہمیں اپنے اپنے بدن واپس ملنے چاہیے۔'' وہ بولی۔

''بہت مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے لیے ہمیں کسی کو اپنی روح کا سودا کرنا ہوگا اور آج کل تو سودے بازی میں بس روح کو ہی قبول کیا جارہا ہے۔ میں تو اپنی روح شیطان کے ہاتھوں ہرگز نہیں بیچ سکتا۔''

مارگریٹ نے سر ہلایا اور بولا۔ ''ہمیں کوئی نہ کوئی ترکیب کرنی ہی ہوگی۔ میں اس طرح کب تک

گھوڑا بنا رہوں گا۔''

''بالکل۔ میں بھی موی گڑیا نہیں رہنا چاہتی۔''

اسی طرح بک بک کرتے، اونگھتے ہم بستروں پر چلے گئے۔ میں تو فوراً ہی سو گیا۔

رات میں مجھے کوئی خواب نہیں دکھائی دیا۔ میں تو اس وقت ایسے ہی حال میں تھا جو خود کسی خواب سے کم نہ تھا۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر مارگریٹ نے پھر ہانک لگائی۔

''ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

سبھوں نے اس کی تائید کی۔

''میں تابوت میں بالکل نہیں سو سکتا۔'' جوری نے کہا۔

سمپسن نے غصے سے دم ہلائی۔ ''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کتبے خانے میں بہت خوش ہوں۔''

''یقین کرو۔'' گھوڑے نے فرش پر ٹاپ چلاتے ہوئے کہا۔

تبھی مارگریٹ کے بدن میں موجود پیٹر میسٹرن نے کپڑے اتارنے شروع کر دیے اور بولا۔ ''مجھ سے یہ لباس نہیں پہنا جا رہا ہے۔''

''اے ٹھہرو۔'' میں چیخا۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''نہیں ۔۔۔ میں روح میں ایک درخت ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے اسے سختی سے منع کیا اور کہا۔ ''میں جلد ہی کوئی تدبیر کروں گا کہ تمہارے جسم تمہیں دوبارہ مل سکیں۔''

''ہاں ۔۔۔ اور جلدی کرو۔'' مارگریٹ نے کہا۔ ''دن بھر میں دم سے مکھیاں نہیں ہنکار سکتا۔''

''واقعی تم سب کو کچھ مشکلات ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کچھ مشکلات۔ ارے کون سی مشکل نہیں ہے ہمیں۔''

''میرا خیال ہے تم وچ کے پاس جاؤ۔ اس سے کہو کہ ایک بار پھر سے ہمارے لیے کالا عمل کر لے۔ وہ شیطان کو بلا کر ہمارے بدن ہمیں دلوا سکتی ہے۔'' ترانا نے تجویز دی۔

''اچھی تجویز ہے۔'' مارگریٹ نے کہا۔

''مگر وچ تو خفا ہو کر گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسے مناؤ کسی طرح ۔۔۔ اس سے جھوٹ موٹ محبت کا ڈراما کرو۔'' مارگریٹ نے سمجھایا۔

''وہ بڑھیا بڑی رومان پرست ہے۔''

''میں اس گدھ جیسی عورت سے پیار نہیں کر سکتا۔''

''پیار کرنے کو کون کہہ رہا ہے ۔۔۔ دیکھو بس یہی ایک راستہ ہے۔''

ترانے نے میرے کان میں کہا۔ ''مجھے یہ تجویز اچھی نہیں لگ رہی ہے۔'' وہ غصے میں تھی۔

''تم کل ہی وچ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔'' مارگریٹ نے کہا۔

ترانا نے بددلی سے مجھے اجازت دے دی۔ اسے اپنا بدن درکار تھا۔

☆☆☆

آدھی صبح کو میں کوٹھی سے نکل کر پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ یہ ایک بل کھاتا راستہ تھا اور جنگلوں میں سے گزرتا تھا۔ اسی کے اوپر مس ٹریسو کی کاٹیج تھی۔

بالآخر میں اس کی کاٹیج پر پہنچ ہی گیا۔

باہر سے یہ جگہ کسی اصطبل جیسی تھی۔ بس یہاں آگ روشن اور چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔

میں نے کاٹیج پر لگی سائن بورڈ پڑھا۔ لکھا تھا ''مس ٹریسو''

''کالا، سفید اور ہر رنگ کا جادو، محبت، تقدیر کا احوال، نامانوس روحیں دور رہیں۔''

میں نے دروازے پر دستک دی۔

مس ٹریسو نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکی۔ پھر جلدی سے بولی۔

''ارے یہ تم ہو ۔۔۔ نوجوان آؤ اندر آ جاؤ۔''

''ہال میں ریچھ کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ جوں ہی میں نے اپنا پیر اس پر رکھا اس میں سے غراہٹ ابھری۔ ریچھ کا بڑا سا سر ہلا اور اس نے اپنا منہ کھول دیا۔''

''ڈاؤن۔'' وچ نے ریچھ کو حکم دیا۔

اس کا سر پھر بچھ گیا تاہم اس کی شیشے جیسی آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔

میں نے اپنے اردگرد کے فرنیچر کو دیکھا۔ یہ قدیم وضع کا تھا اور اس بوڑھی کے لیے مناسب تھا۔

مس ٹریسو نے آتش دان کے پاس جگہ سنبھال لی اور بُنائی میں مصروف ہوگئی۔

میں نے دیوار پر آویزاں کارڈ دیکھے اور پوچھا۔

''یہ تم کیا بن رہی ہو؟''

میں آہستہ سے ہنسا اور کہا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔''

''کیا؟''

''ایک مومی پھل۔''

''مومی پھل۔۔۔''

''ہاں تمہاری موم کی گڑیا۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ خوش ہوئی تو میں نے پانسہ پھینکا۔

''میں تمہیں اس روز دیکھ کر کس قدر خوش ہوا تھا کہ بس۔۔۔''

''اچھا۔۔۔؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر میں نے سوچا تھا عورت ہو تو ایسی۔''

''سچ۔۔۔''

''کیا تم میرے ساتھ آج رات سیر کے لیے چل سکو گی؟''

''آج۔۔۔؟'' اس نے اداکاری کی۔ ''آج تو سیٹ بھی نہیں ہے۔''

''میں سیٹ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں بس تمہارے ساتھ کچھ گھومنا گھامنا چاہتا ہوں۔'' اس نے شرما کر مجھے دیکھا اور بولی۔ ''تو پھر مجھے پہلے بیوٹی پارلر جانا ہوگا۔ میں راستے میں تمہیں تمہارے گھر پر چھوڑ دوں گی اور واپسی پر پک اپ کر لوں گی۔''

ٹریسو اٹھی اور جھاڑو کی طرف بڑھی۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ ''تو کیا ہم دونوں اسی پر سواری کریں گے؟''

''اور کیا۔'' اس نے کہا۔ ''آج کل پٹرول کے دام بڑھ گئے ہیں۔'' لڑکھڑاتے ہوئے میں اسی جھاڑو پر مس ٹریسو کے پیچھے سوار ہوگیا۔

اس نے کاٹیج کا دروازہ کھولا۔ چند الفاظ بدبدائے۔ دوسرے ہی لمحے جھاڑو اٹھی اور فضا میں اڑنے لگی۔

☆☆☆

مس ٹریسو نے مجھے گھر پر اتار دیا اور خود بیوٹی پارلر کو چل دی۔

جوں ہی میں گھر میں گھسا۔ پورا گینگ مجھے چمٹ گیا اور سوالوں کی بارش ہونے لگی۔

''تم ملے اس سے؟ کیا کیا اس نے؟ رومان چلایا یا نہیں؟''

جواب میں میں نے کہا۔ ''آج میں مس ٹریسو کو لے کر سیر پر جا رہا ہوں۔ میرا ارادہ کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانے کا ہے۔ پھر ہم ڈانس کریں گے۔''

رک کر میں نے مارگریٹ سے کہا۔

''میں تمہارا سوٹ پہنے جا رہا ہوں۔ اور کوئی 35 ڈالر کی رقم بھی لے رہا ہوں۔''

ترانا میری طرف بڑھی۔ اس چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''دیکھو مجھے بہت محسوس ہو رہا ہے۔۔۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

''کیا کہہ رہی ہو۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تو پھر میں بھی جاؤں گی۔ پیٹر کے ساتھ مارگریٹ کے جسم میں ہے۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں۔''

''میں اسٹیشن ویگن نکال رہا ہوں۔'' مارگیٹ نے کہا۔

''میں اس کے آگے خود کو جوت لوں گا۔ ویگن میں تم سب بیٹھ جانا۔ میں تمہیں شہر لے چلوں گا۔''

میں نے احتجاج کیا۔

''تم سارا کھیل چوپٹ کرنا چاہتے ہو۔'' میں چیخا۔

انسانی سوسائٹی میں تمہارا وجود خوف ناک ہو گا۔''تم یہ معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔''

''لیکن۔۔۔'' اسی وقت ایک آواز سی ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ وچ کی جھاڑو آ کر اتری ہے۔

''تم اِدھر اُدھر دفع ہو جاؤ۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''میں اوپر جا رہا ہوں۔ کپڑے بدل کے میں اس کائی لائٹ سے چھت پر چلوں گا۔ تم سب یہیں رہنا تا کہ کل تک تمہیں اپنے بدن واپس مل سکیں۔''

پانچ منٹ بعد میں، مس ٹریسو کے پاس چھت پر کھڑا تھا۔

میں نے ہکا بکا ہو کر اسے دیکھا جو ستاروں کی چھاؤں میں کھڑی تھی۔ مس ٹریسو بالکل ہی بدل گئی تھی بیوٹی پارلر والوں نے اسے جوان بنا دیا تھا۔

یہ اب بوڑھی نہیں رہی تھی۔ جبکہ ایک حسین عورت تھی جوان اور پرکشش۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور ہونٹ غنچوں کی طرح اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اس نے میرے تاثرات سمجھ لیے تھے۔

''کیوں کیا دیکھ رہے ہو۔'' اس نے پوچھا۔ ''میرے بدن میں ابھی کتنی زندگی باقی ہے؟''

میں نے جواب نہیں دیا بلکہ اس کے عقب میں جھاڑو پر چڑھ گیا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے اس کی قربت بڑی نشیلی لگ رہی تھی۔

ہم نے ایک کلب کے فائر اسکیپ پر لینڈ کیا۔ ہمارے درمیان مزے کی گفتگو جاری تھی۔

ایک ویٹر ہمیں ڈانس فلور سے گزرتا ہوا میز تک لایا۔

''شیمپین۔'' میں نے آرڈر دیا۔

ویسے شراب کی ضرورت نہ تھی مجھ پر تو مس ٹریسو کے حسن کا نشہ طاری تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ اچھی طرح یاد تھا کہ میرا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔

مجھے جلد ہی اسے اکسانا تھا کہ وہ اپنے دوست شیطان کو بلا کر میرے ساتھیوں کے جسم انہیں دلوا دے۔ تاہم ابھی رات جوان تھی اور میں اس کی مچلتی ہوئی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا اور اس کے مہکتے وجود میں خود کو ضم کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے بوتل کھولی۔ جام بھرے اور انہیں ٹکراتے ہوئے شراب نوشی شروع کی۔

ذرا دیر بعد نشہ اتنا ہو گیا تھا کہ میں نے مس ٹریسو کو اپنی گود میں بیٹھنے کی فرمائش کر دی۔

اب ان پرانی باتوں کو سوچتے ہوئے مجھے پتا چل رہا ہے کہ اصل میں ہوا کیا تھا۔

بوڑھی ساحرہ۔۔۔ ایک پرانی کھلاڑی تھی۔ اس نے مجھے جو جام دیا اس میں اس نے کچھ ملا دیا تھا۔

یقیناً اس میں کوئی تاثیر تھی کہ میں اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

مجھے تو اس موقع پر ترانا کا بھی کوئی خیال نہیں آ رہا تھا۔

اس نے میری طرف نشیلی نظر سے دیکھا تو میں جلدی سے میز پر جھک گیا۔ اس کی طرف میں اس کی نگاہوں میں اتر جانا چاہتا تھا کہ اسی وقت میری کھوپڑی سے ایک انسانی لات ٹکرائی۔

ہاں یہ ایک انسانی پیر تھا۔ جو فضا میں اڑتا ہوا آیا تھا اور میری کنپٹی سے ٹکرایا تھا۔ میں ایک دم حواسوں میں آ گیا۔

وہ پیر اب فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے نظر پڑتے ہی پہچان لیا۔ یہ پیر ترانا کا تھا۔ ڈی کا۔۔۔''

میں نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا میری

نظریں ذرا فاصلے پر ایک میز پر رک گئی۔

اس پر ترانا۔۔۔ میٹرل کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جو مارگریٹ کے جسم میں تھا۔ میں نے نظر بچا کر فرش پر پڑے پیر کو سنبھالا اور مس ٹریسو سے مہلت لے کر میں اس کی طرف چلا۔

''معذرت خواہ ہوں مادام غالباً آپ کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔'' ترانا نے اپنا پیر لے لیا۔ جھک کر اس نے اسے اپنی ٹانگ پر فٹ کر لیا۔ تب میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے منع کیا تھا تم کیوں اس۔۔۔''

''میں اس عورت کے ہاتھ تمہیں کھلی چھوٹ نہیں دے سکتی۔'' ترانا نے کہا۔

''اور ہم یہاں سارے کے سارے موجود ہیں۔'' میٹرل نے سرگوشی میں اطلاع دی۔

واقعی وہاں سمپسن اور جوزی ایک اور میز پر موجود تھے۔ البتہ جوری نے اس بار آدمی کی جوتی بدلی ہوئی تھی۔

مارگریٹ اور جرمنیکس باہر ہیں وہ دونوں گھوڑا گاڑی میں آئے ہیں۔

''حد ہو گئی، میں بڑبڑایا۔'' اگر یہاں کسی نے ان عفریتوں کو دیکھ لیا۔۔۔''

یہ خیال بہت پریشان کن تھا۔

معاً میں نے وہ گفتگو سنی جو میزل اور ساتھ والی میز کے آدمی کے مابین ہو رہی تھی۔

''معاف کیجئے گا'' ساتھ والی میز کے آدمی نے میٹرل سے کہا

''آپ کے ساتھ جو لیڈی بیٹھی ہے کیا اس کا ایک پیر لکڑی کا ہے؟''

''ہاں۔'' میٹرل نے کہا۔

''تعجب کی بات ہے۔'' شرابی بڑبڑایا۔

''اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔'' میزن نے کہا۔

''تم اس کے ایک پیر پر تعجب کر رہے ہو میرا تو پورا وجود ہی لکڑی کا ہے۔''

میٹرل پر بھی نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اس وقت مارگیٹ کے جسم میں ہے۔''

''اچھا تو تم لکڑی کے بنے ہوئے ہو۔'' شرابی نے آنکھیں نکالتے ہوئے پوچھا۔

''اور کہا تم چاہو تو چھو کر دیکھ لو۔'' میٹرل نے ہانک لگائی۔

شرابی نے اسے دیکھا اور میز سے اٹھ کر چل دیا۔

اسی وقت جوری نے جو سیمسن کے بدن میں تھا اس میز پر آیا۔ اس نے میٹرل کو اٹھایا اور لے کر باہر نکل گیا۔

میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ مس ٹریسو میری سمت آ رہی ہے۔ میں نے ترانا کے مومی پیر کو ٹھوکر ماری ''اپنا منہ بند رکھنا۔'' میں نے سرگوشی کی۔ پھر میں گھوما اور مس ٹریسو سے بولا۔ ''کیا خیال ہے رقص کرو گی؟''

میں نے وچ کو بازوؤں میں دبوچا اور ڈانسنگ فلور پر اتر گیا۔ ترانا کی مومی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

یہ خوش قسمتی تھی کہ میں رقص میں لگا ہوا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ باہر واقع بار پر کیا ہو رہا ہے۔ اس کا علم مجھے بعد میں ہوا تھا۔

مسٹر سمپسن جو جوری کے بدن میں تھا۔ بار کی طرف چلا گیا تھا تاکہ تنہا کچھ وقت گزار سکے۔

بارٹنڈر نے پوچھا۔ ''کیا پیو گے؟''

''ایک گلاس جوس۔۔۔ اسکاچ۔۔۔'' سمپسن نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور حلیہ درست کیا۔

بارٹنڈر نے اسکاچ رکھ دی۔ سمپسن نے اسے قیمت میں بیس ڈالر کرکا نوٹ دیا۔ نوٹ کو دیکھ کر دوسرے سرے پر بیٹھی عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور مٹکتی ہوئی سمپسن کے پاس آ گئی۔ ''تم اکیلے ہو۔'' گھاگ عورت نے کہا۔

سمپسن سمجھ گیا۔ وہ ایک مافوق الفطرت ہستی تھا۔ اس نے جواباً کہا۔

''میں ایک اداس شخص ہوں۔''

''میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔'' عورت نے ہمدردی جتائی۔

''ویسے تم اداس کیوں ہو؟''

''کیا کرو گی جان کر۔'' سمپسن نے کہا۔

''پھر بھی کہہ دو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔''

''بات دراصل یہ ہے۔'' سمپسن نے بے چینی سے کہا۔

''میں ایک ویمپائر تھا۔۔۔ مگر اب نہیں رہا۔''

اولگا نامی عورت نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولی۔

''اچھا۔''

''ہاں۔۔۔ بس یہی خیال اداس کیے ہوئے ہے۔'' سمپسن نے کہا۔

''مجھے اپنی مخصوص غذا نہیں مل رہی ہے میں کتے کے راشن پر گزارا کر رہا ہوں۔''

اولگا نے سمجھا شراب اس کے دماغ پر چڑھ گئی ہے اس نے کہا۔ ''مجھے تو تم ویمپائر سے زیادہ ایک تنہا بھیڑیے جیسے لگ رہے ہو۔''

یہ جملہ خاصا مہلک تھا۔

''میں واقعی ایک بھیڑیا ہوں۔''

اولگا ہنس دی۔ ''تم مذاق کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔۔۔ میں اس کا مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

سمپسن نے کہا۔

پھر تو میں یہ شو دیکھنا چاہوں گی۔'' عورت نے مسکرا کر اسے چڑھایا۔

جواب میں سمسن فرش پر چاروں ہاتھ پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک سرد آسمان کی سمت رخ دیا اور غرانے لگا۔ اچانک اس کا بدن کانپا پھر اس میں تبدیلی سی ہونے لگی۔ پہلے اس کا سر بدلا، پھر ناک تھوتھنی بن گئی۔ پھر اس کے بازو اور پیر سمٹے اور ان پر بال نمودار ہو گئے۔

چند ہی لمحوں میں ایک بھیڑیا بن چکا تھا۔ اولگا کا برا حال تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

ان لمحات میں میں مس ٹریسو کے ساتھ ناچتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا مس اولگا کی چیخیں سنیں تو اس نے ادھر دیکھا۔

اس کی توجہ سمپسن نے نہیں بلکہ جوری نے حاصل کی تھی۔ وہ پیکنگ کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مس ٹریسو کی جھاڑو دبی ہوئی تھی۔

''جلدی کرو۔'' مس ٹریسو مجھے چھوڑ کر اس کی سمت لپکی۔

''اے۔۔۔'' وہ چیخی۔ ''یہ تم نے میری جھاڑوں کیوں اٹھائی۔'' میں اسی سے باہر کا فرش صاف کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''مارگریٹ بے چارہ گھوڑے کے بدن میں ہے۔

''رکھو اسے۔'' مس ٹریسو چیخی۔

پھر وہاں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا۔ مس ٹریسو کا پنجہ نما ہاتھ جوری کی گردن پر جم گیا۔ اس نے جھاڑو چھین لی۔ اس لمحے ترانا لپکتی ہوئی آئی اور ٹریسو سے بھڑ گئی۔ اس سے قبل کہ میں ٹریسو کو روکتا اس نے موی گڑیا کو نوچ نوچ کے رکھ دیا۔

اب گڑیا کچی پھٹی فرش پر پڑی تھی۔

میرے عقب میں میٹرل نے چیخ ماری۔ وہ مارگریٹ کے بدن میں تھا۔ وہ اس شرابی سے بھڑ گیا تھا جس نے کچھ قبل اس سے ترانا کے پیر کے بارے میں باتیں کی تھیں۔

میں جلدی سے غراتے بھیڑیے کی طرف بڑھا جو فرش پر کھڑا تھا۔

تبھی دروازے سے مجھے مارگریٹ لپکتا دکھائی دیا وہ گھوڑے کے کالب میں تھا۔ اس کے قبضے میں جرمنیکس دبا ہوا تھا جو جل پری کے جسم میں تھا۔ گھوڑا اپنے سم زمین پر مار رہا تھا۔ اور زور زور سے ہنستا بھی جا رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' وہ گرجا۔

بولنے سے قبل ہی مجھے کسی نے بازو میں دبوچ

ایا

یہ مس ٹریسو تھی جو اپنی جھاڑو پر چڑھی ہوئی تھی۔

''چلو۔۔۔نکل لو۔'' وہ بولی۔

میں اچھل کر جھاڑو پر بیٹھ گیا۔

غراتا ہوا بھیڑیا۔۔۔چیختا ہوا آدمی۔ ہنہناتا ہوا گھوڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ڈمی نے میرا راستہ روکا مگر فضول۔ ہم دونوں ان کے سروں پر سے زوں کر کے نکل گئے۔

مگر کہاں؟

سیدھے پولیس والوں کے چنگل میں۔

☆☆☆

جج نمبو دم نے ہماری داستان غور سے سنی۔

سب سے پہلا بیان شرابی نے دیا۔ جس نے میٹرل سے بات کی تھی۔ پھر اولگا نامی عورت نے اپنی کہانی سنائی۔ جس نے اکھڑے اکھڑے انداز سے کچھ جملے کہے۔

آخر میں پیٹرول میں نور وچ نے ایک بیان دیا۔ اس نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کتھا دوہرائی۔

''یہ کہتا ہے کہ یہ ایک درخت ہے۔ یور آنر۔'' نوروچ نے کہا جبکہ یہ شخص بار میں کسی سے کہہ رہا تھا کہ یہ ایک ویمپائر ہے مگر اب ویئر وولف بنا ہوا ہے۔ اس نے بھیڑیے کے کالب میں جانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

کوروچ نے مس ٹریسو کو دیکھا اور بولا۔ ''اگر اس عورت نے دوسری عورت کے سارے ہاتھ پیر الگ کر دیے تھے۔ اس کے بعد گھوڑا اور جل پری بھی بیچ میں آ کودے اور بعد میں اس عورت نے اس آدمی کے ساتھ۔۔۔۔'' اس نے رک کر میری طرف اشارہ کیا۔

''فرار ہونے کی کوشش کی تھی دونوں ایک جھاڑو پر بھاگے تھے۔'' جج نمبو دم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

''یہ بکواس بند کرو۔'' وہ کسی طرح کمزور آواز میں بولا۔ ''یہ عدالت کا کمرا ہے کوئی چاند دخانہ نہیں۔ آفیسر! کیا تم اس وقت نشے میں ہو۔''

''نہیں۔۔۔یور آنر!''

''تو پھر یہ سب تم کیا بک رہے ہو۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر!''

''نہیں۔۔۔تم تمام قیدیوں کو یہاں لاؤ۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔'' جج نے کہا۔

پھر ہم سب جج کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

مس ٹریسو کے ہاتھ میں جھاڑو دبی ہوئی تھی۔

وہ بہت برہم تھی۔

جج نمبو دم نے ہم سب پر نظریں ڈالیں۔ اس نے آدمی کو دیکھا۔ اس نے گھوڑے کو دیکھا۔ اس نے جل پری کو دیکھا۔ اس نے بھیڑیے کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور چیخا۔

''ان سب کو ڈھانپ دو۔'' وہ پولیس والوں سے مخاطب تھا۔ ان پر کمبل ڈالو۔ میں انسانی گھوڑے اور انسانی مچھلی کو نہیں دیکھ سکتا۔''

ذرا دیر بعد جج نمبو دم کی نظریں مس ٹریسو پر پڑیں اور ان میں اشتیاق پیدا ہو گیا۔

''تم ذرا آگے آؤ۔'' اس بار مس ٹریسو سے کہا۔ ''اور میرے سوالوں کے جواب دو۔''

مس ٹریسو تھوڑا سا بڑھ گئی۔

''تمہارا نام؟''

''مس ٹریسو۔''

''پیشہ؟''

''اوہ۔۔۔'' مس ٹریسو نے کہا۔ ''میں ایک وچ ہوں۔'' اس جواب پر جج نمبو دم بھڑک اٹھا۔

''کیا۔۔۔؟''

''میں ایک وچ ہوں یور آنر!'' ٹریسو نے کہا

''میں جھاڑو پر اڑتی ہوں۔''

''اچھا۔۔۔اور۔۔۔؟''

''یور آنر! یہ سارا چکر تب سے شروع ہوا جب یہ لوگ مجسموں میں بدل گئے تھے۔''

''مجسموں میں۔۔۔؟''

''جی سر! یہ پتھر کے بن گئے تھے۔''

''میں سمجھا نہیں''

''یور آنر۔۔۔! یہ شخص میرے بیان کی تصدیق کرسکتا ہے۔'' ٹریسو نے مجھے آگے بڑھایا۔

''جی سر۔۔۔! یہ درست کہہ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

یہ سارے افراد کبھی مجسمے کی شکل میں تھے۔ میں ان کا نگراں تھا۔ مگر پھر یہ مجسموں سے نکل آئے۔

''کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔'' تب مارگریٹ نے، جو گھوڑے کے جسم میں تھا۔ آگے بڑھا اور بولا۔ ''سر میں وضاحت کرتا ہوں۔ یہ سارے لوگ میری ملکیت تھے اور میں خیرے کا حصہ تھے۔ مگر یہ ان کے مجسمے بننے سے پہلے کی بات ہے۔''

''جج نمبو دم نے کمبل سے ڈھکے ہوئے گھوڑے کے جسم کو دیکھا اور کراہت کے ساتھ مارگریٹ سے مخاطب ہوا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں ایک بولتا ہوا گھوڑا ہوں۔''

سرجنٹ نے مداخلت کی۔ ''سر یہ کوئی گھوڑا نہیں ہے۔''

''شٹ اپ۔۔۔'' جج نے اسے چپ کرادیا۔

''اور تم کیا کہتی ہو نوجوان خاتون!'' جج نے اس قالب کو مخاطب کیا جو جل پری کا تھا مگر جس کے اندر جرمیکس گھسا ہوا تھا جو کبھی گھوڑا تھا۔

''دیکھئے سر! میں کوئی عورت نہیں ہوں۔ آپ کا طرز تخاطب درست نہیں۔'' جرمیکس نے احتجاج کیا۔

جج نمبو دم گھبرا گیا۔

''کیا تم سب کے سب بہکے ہوئے ہو۔''

''جناب! میری سنیں۔'' جوری نے کہا جو مسٹر ٹن کے جسم میں تھا۔ ''بات آسان سی ہے کبھی میں اس بدن میں تھا۔'' اس نے بھیڑیے کی طرف اشارہ کیا۔

''یعنی تم اس بھیڑیئے کے جسم میں تھے۔'' جج نے پوچھا۔

''جی سر۔'' اس نے کہا تو جج نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔'' معا بھیڑیے نے کہا۔

''اچھا۔۔۔ تو تم بول بھی سکتے ہو۔'' یہ جج کے لیے دوسری حیرانی تھی۔ وہ ادھ موا ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے اگر اس سے آپ کی طبیعت مکدر ہوتی ہے تو میں دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہوں۔'' بھڑیئے نے کہا۔ پھر وہ فرش پر پھیل گیا اور قالب بدلنے لگا۔ یہ بڑا بدنما منظر تھا مگر بالآخر وہ آدمی بن گیا۔

''دیکھا آپ نے۔'' اس نے جج سے کہا۔

''میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا۔'' جج نمبو دم نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر تو آپ اُدھر دیکھیں۔'' اس نے ترانا کی طرف اشارہ کیا۔ جوڈی کے قالب میں تھی اور اس کا ایک جھٹکے سے لڑھک کر فرش پر چلا گیا تھا۔

''کیا کروں۔'' ترانا نے کہا۔ ''بھیڑیئے کو آدمی بننے کا منظر دیکھ کر میرے حواس قابو میں نہیں رہے ہیں۔'' اس نے بڑھ کر اپنا گرا ہوا سر اتھام لیا۔

جج نمبو دم اسے گھورے جارہا تھا۔

''یہ سارا کھیل افسوں گری سے عبارت ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔۔۔ ''یہ ایکشن کا زمانہ ہے۔ میں اس میں ان سب کو افسوں گری کے جرم میں نہیں پھانس سکتا۔''

''دیکھو۔'' بالآخر میں نے بات شروع کی اور جج سے کہا۔

''سر آپ اپنا دماغ مت دکھائیں، مجھے طریقہ معلوم ہے میں ان سب کو ان کے لیے اپنے اپنے جسموں میں واپس پہنچاؤں گا۔ اس کے بعد آپ اس سارے معاملے کو بھول جائیے گا اور کھیل ختم ہوجائے گا۔''

''وہ کیسے؟'' جج نے پوچھا۔

میں نے اسے اختصار سے بتایا۔ ''مس ٹریسو کے کچھ واجبات ہیں جو شیاطین کے سروں پر ہیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو بلا کر ان سے یہ کام کرا سکتی ہے۔''

''حیرت کی بات ہے۔''

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے اتنے مظاہرے دیکھے ہیں اب حیرت کیسی۔''

''پھر وہ خود ہی یہ کام کیوں نہیں کر دیتی۔'' جج نے پوچھا۔

''ضدی عورت ہے بس۔''

''میں اسے حکم دیتا ہوں۔'' جج کا پارہ چڑھ گیا۔

''ہیچر مچر کی تو سڑا دوں گا جیل میں۔''

میں نے جلدی سے مس ٹریسو سے پوچھا۔ ''بولو اب کیا ارادے ہیں؟''

مس ٹریسو نے لمبی سانس لی۔ مجھے غصے سے دیکھا اور بولی۔

''دیکھتی ہوں۔'' اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اس عرصے میں اس کا میک اپ ختم ہو چلا تھا۔ اس کی لمبی ناک اور جھڑتے بال ظاہر ہونے لگے تھے۔

جج نے شرابی کو، پولیس مین کو اور اولگا کو چیمبر سے باہر کر دیا۔

پھر اس کے حکم پر ایک ملازم وہ سامان لے آیا جس کی مس ٹریسو کو ضرورت تھی۔ ذرا دیر بعد عمل کا آغاز ہوا۔

دیکھتے دیکھتے ایک شیطان ظاہر ہوا۔ یہ وہی پرانا کم بخت تھا۔

''اوہ میرے خدا۔'' جج نمبو دم کراہا۔

شیطان نے اپنی ربر جیسی گردن نکالی اور میری طرف دیکھتے ہوئے پھنکارا۔

''ارے۔۔۔ یہ تُو ہے۔۔۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں اس نے بلایا ہے۔'' میں نے مس ٹریسو کی طرف اشارہ کیا۔

مس ٹریسو نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ایک کاغذ لہرایا۔ یہ واجبات کا بل تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' شیطان نے لمبی سانس لی۔

''دیکھو پہلے میں ان سب کو مجسموں میں ڈھالوں گا اس کے بعد دوسرا عمل ہوگا۔''

''ڈرنا نہیں۔'' میں نے ترانا کو حوصلہ دیا۔

''بس چند لمحوں کی بات ہے۔''

اب کمرے میں روحوں کا اجتماع ہو چکا تھا۔''

میری آنکھیں اب نئی تبدیلیاں ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ یہ بڑا دہشت ناک سماں تھا۔ آدمی، جل پڑی، گھوڑا سب کے سب ایک دم سے مجسمے بن گئے تھے۔ وہ اب روشنی میں پتھر بن کر چمک رہے تھے۔

''چلو یہ کام تو ہو گیا۔'' ہانپتے ہوئے کہا شیطان نے کہا۔ ''اب دوسرا کام۔'' وہ بولا۔

''لیکن پہلے تم یہ بل مجھے دے دو۔'' اس نے مس ٹریسو سے کہا مگر وہ وچ نہ جانے کہاں تھی بالآخر مجھے وہ وہیں ایک اندھیرے گوشے میں نظر گئی۔ وہ کھلی کھڑکی کے سامنے بھی بالکل تیار۔ جھاڑو سنبھالے ہوئے۔

''یہ بے ایمانی پر آمادہ لگتی ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''پکڑو اسے۔''

میرا اندازہ درست تھا۔

شیطان سمجھ گیا۔

''اے، واپس آجاؤ۔'' اس نے وچ کو للکارا۔

پھر وہ کسی گیند کی طرح اچھلا اس کی چھلانگ اس قدر تیز تھی کہ وہ اپنے زور میں کھڑکی سے باہر اڑتا نکل گیا تھا۔

میں کھڑکی کی طرف لپکا۔ میں نے باہر دیکھا دور خلا میں ایک کشمکش ہو رہی تھی۔

شیطان اور وچ گتھم گتھا تھے۔ وچ کوشاں تھی کہ ہاتھ میں دیا کاغذ جانے نہ دے شیطان اسے چھین رہا تھا۔

اس کشمکش میں جھاڑو بری طرح ڈول رہی تھی۔ پھر ایک دور کی کڑک سے فضا گونج اٹھی۔

خلا میں ایک شعلہ سا لہرایا۔ جیسے کوئی آتش بازی ہوئی ہو۔ روشنی ہوئی اندھیرا ہو گیا۔ گہرا اندھیرا۔ اب کہ نہ ہمیں وہ شیطانی مخلوق دکھائی دے رہی تھی نہ ہی وچ ٹریسو۔ البتہ ایک خالی جھاڑو کسی کٹی پتنگ کی طرح نیچے زمین پر گرتی جا رہی تھی۔

میں نے ایک لمبی سانس بھری اور اپنے اردگرد کھڑے مجسموں کی طرف دیکھا۔

کبھی یہ زندہ تھے اور میرے دوست تھے۔ اب یہ دوبارہ پھر سے پتھروں میں مقید ہو گئے تھے۔ ہمیشہ کے لیے۔

''ترانا۔۔'' میں نے زیرلب کہا۔

جواب میں زمین پر پڑی موئی ڈمی کی شیشہ آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ اس کے بازو کا لمس گرمی سے خالی تھا۔

جج نمبودم نے لائٹ جلا دی۔

پھر اس نے اپنی آنکھوں کو کئی بار ملا۔

''عدالت حکم دیتی ہے۔۔۔'' اس نے کہا۔ ''کہ ان مجسموں کو بحق سرکار ضبط کر لیا جائے اور انہیں فوری طور پر یہاں سے ہٹا دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ یہاں کی تمام کارروائی کو خفیہ رکھا جائے کسی کو ایک لفظ بھی نہ بتایا جائے۔'' رک کر اس نے مجھے گھورا۔ ''تم سمجھ رہے ہو نا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جولیس مارگریٹ کا مکان عدالت کے حکم سے نیلامی پر چڑھا دیا جائے گا۔'' اس نے ایک حکم اور جاری کیا۔

''اور اس ڈمی کے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے جج سے پوچھا۔

''اس کے اصل مالک کا انتظار کیا جائے۔''

اس نے مجھ سے کہا۔ ''اور تم، تم جا سکتے ہو۔''

بس چل دیا۔

اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اور اس طرح یہ سارا معاملہ تمام ہو گیا۔ میں نے مارگریٹ کی کوٹھی چھوڑ دی۔ ان دوستوں کو بھی چھوڑ دیا۔۔۔ اور اب میں انہیں یادداشت سے کھرچنے میں لگا ہوں۔ بھلا دینا چاہتا ہوں۔ ان سب کو۔

البتہ میں اس ڈمی کے درشن روز کرتا ہوں۔ بس اب وہی میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہی ایک ثبوت بچا ہے میرے پاس جس کی بنیاد پر میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میری یہ داستان کوئی من گھڑت افسانہ نہیں ہے۔ اسی لیے میں اس ڈمی گڑیا کو روز دیکھتا ہوں

آپ چاہیں تو آپ بھی اسے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے وسیع و عریض ڈیپارٹمنٹ اسٹور کی بڑی والی ونڈو کے بائیں گوشے میں لگی ہوئی ہے۔ قطار میں اس کا نمبر تیسرا ہے۔

مسکراہٹیں

کوریئر سروس کا ایک ہرکارہ دوڑتا ہوا اپنے دفتر سے نکلا اور دروازے سے اس نے فٹ پاتھ پر ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ دھپ سے وہ پشت کے بل فٹ پاتھ پر گرا اور چند لمحے کے لیے گویا چکرا سا گیا۔ ایک راہ گیر نے اسے اُٹھایا۔ اس کے کپڑے جھاڑے، اس کا ڈاک کا تھیلا اُٹھا کر اسے دیتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟''

''چوٹ کو چھوڑیے۔'' ہرکارہ پیٹھ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ نے دیکھا ہو تو یہ بتا دیجیے کہ وہاں سے میری موٹر سائیکل کس نے ہٹائی ہے جہاں میں نے چھلانگ لگائی تھی؟''

☆☆☆

ٹیچر: ''پیار اور عشق میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

اسٹوڈنٹ: ''سر! پیار وہ ہے جو آپ اپنی بیٹی سے کرتے ہیں اور عشق وہ ہے جو میں آپ کی بیٹی سے کرتا ہوں۔''

تیرہویں قسط

لاوارث

غزالہ جلیل راؤ

انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو' کسی بھی ملک میں رہتا ہو' جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں' وہیں اس سے نفرت کرنے والوں کا وجود بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کو زمانے کے گرم و سرد سے بچانے والے' اس کو سایہ فراہم کرنے والے اس کے لیے جان نچھاور کرنے والے ہر جگہ' ہر علاقے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے خلاف سازشیں کرنے والے' اس کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے' اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے دوستوں کے روپ میں اس کے وجود کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ' اس کے باپ کا پتا نہیں تھا..... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا..... اس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی..... لیکن اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی موجود تھے۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک سلسلہ وار انوکھی داستان

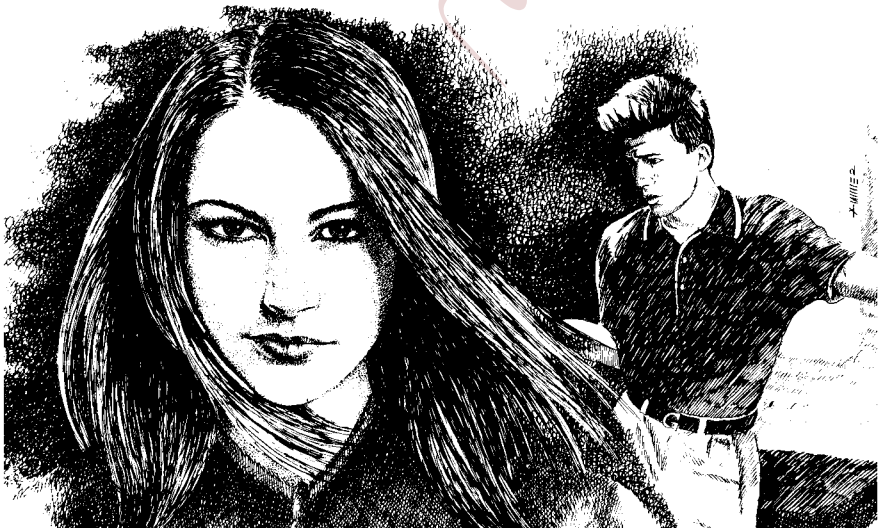

عاقل بولا۔ ''خدا کے لیے شیری بھائی! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔''

''شرم آ رہی ہے؟''

''نہیں۔ میں یہ خواب نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''معاف کرنا برخوردار قصور ہمارا نہیں ہے۔ بس اس وقت تمہارے پاس آ رہے تھے کہ پھولوں کے کنج کے قریب دو قمریاں چہکتی نظر آئیں اور ہمارے قدم رک گئے۔''

''خدا کی قسم! خدا کی قسم میرا قصور نہیں تھا۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔''

''معلوم ہے۔ اور کچھ؟''

''کبھی اس کی کوشش نہ کریں شیری بھائی!''

''کیوں؟''

''میں اس قابل نہیں ہوں۔''

''بنایا جائے گا۔ بنایا جائے گا۔ تم لوگ میری ذمہ داریوں میں کوئی نہ کوئی اضافہ کرتے ہی رہتے ہو۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے شیری بھائی! میں تو۔۔۔ میں تو اس گھر کا بھکاری ہوں۔ مجھے تو۔۔۔ مجھے تو جو کچھ ملا ہے آپ کے طفیل یہیں سے ملا ہے۔''

''اس گھر کی دامادی بھی تمہیں ہمارے ہی طفیل ملے گی۔ حوصلہ رکھو۔ بزدلی مجھے ناپسند ہے۔''

عاقل گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''آپ کو۔۔۔ آپ کو ساری حقیقت معلوم ہے نا شیری بھائی! خدا کی قسم میں نے کبھی خواب میں بھی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔''

''بابر علی کے سامنے بھی یہی کہہ دینا۔ مروا دینا شیری کو۔'' شیری نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''نہیں شیری بھائی! آپ کے لیے تو سو بار مر جاؤں گا۔ آپ ایک دفعہ کہہ کر تو دیکھیں۔''

''چلو چھوڑو ان باتوں کو بے فکر رہو۔ جب تک شیری زندہ ہے تمہارے لیے عمل کرتا رہے گا۔ مجھے یہ جوڑی اُس رات پسند آ گئی تھی۔ غالباً اس حادثے کی پہلی رات تھی۔ ایک بار پھر اپنی پوزیشن صاف کر دوں۔ میں تم سے ملنے جا رہا تھا کہ میں نے تم دونوں کو دیکھا۔ تمہاری گفتگو سنی اور دل میں سوچا کہ شیری صاحب یہ جوڑی تو ملنی ہی ہے۔ لیکن ابھی کچھ دیر لگے گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے شیری بھائی! آخر یہ کیسے ممکن ہے؟''

''اپنا گھر'' بھی ناممکن تھا۔ ابھی دونوں جاسوسوں کو نکال بھگانا بھی ناممکن ہی تھا کیونکہ وہ بابر علی کی کمزوری تھے۔ آپ سے معاملات ناممکن تھے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ سب کچھ ممکن ہوتا جا رہا ہے۔ جاؤ عیش کرو عاقل، شیری موجود ہے تمہارے سروں پر۔''

''خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔'' عاقل نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور شیری اس کا گال تھپتھپانے لگا۔

''ایک سوال کرنا چاہتا ہوں شیری بھائی!''

''کرو۔''

''آپ کون ہیں؟ آپ کو ہماری یہ مدد کر کے کیا حاصل ہو رہا ہے۔''

''میں مریض ہوں عاقل! اپنے علاج کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میری کامیابی کی دعا کرو۔''

''عاقل کو اپنا ہم راز نہیں بنائیں گے۔''

''وقت آنے دو۔ بس اب بھاگ جاؤ۔ مجھے ابھی زبردست کام انجام دینے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔ اللہ حافظ۔'' عاقل نے کہا اور آنسو خشک کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شیری کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اس نے اخبارات اٹھائے اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بیگم صاحبہ کے کمرے میں تھا۔

''آپ نے اخبارات دیکھے امی جی!''

''ہاں۔ ہاں! ان اخبارات نے تو ہمیں بڑی

اہمیت دی ہے۔ یہ سب تمہارا کارنامہ ہے۔''

''میں نے ان اخبارات میں ایک چیز دیکھی ہے امی جس نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا ہے۔''

''خیریت۔۔۔''

''آپ اس صفحے کو دیکھیے۔ کوئی خاص بات نظر آئی آپ کو؟''

''ہاں۔۔۔ میں نے اس اخبار کا یہ صفحہ دیکھا ہے۔ پڑھا ہے اسے۔ ویسے تو ساری چیزیں ہی خاص ہیں۔ تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟''

''نہیں امی! ایک بار پھر غور سے دیکھیے۔'' شیری نے کہا اور بے چاری بیگم صاحبہ بغور اخبار کے صفحے کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔

''دیکھ لیا میں نے۔''

''کوئی خاص بات نہیں نظر آئی؟''

''بھئی میں تو نہیں سمجھ سکی۔''

''ان تصویروں کو ذرا غور سے دیکھیے امی!'' شیری نے کہا اور بیگم صاحبہ عاقل نفیسہ کی تصویریں دیکھنے لگیں۔

''بڑے پیارے لگ رہے ہیں دونوں۔''

''لگ رہے ہیں نا۔ بس یہی دکھانا چاہتا تھا میں آپ کو۔ انہیں دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا ہوں۔''

''کیوں اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟''

''امی یہ جوڑی دیکھیے۔ خدا کی قسم یوں لگ رہا ہے جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ امی کیوں نا ہم اس تصویر کو دائمی رنگ بخش دیں۔'' شیری نے کہا۔ بیگم صاحبہ پہلے تو کچھ نہ سمجھیں۔ پھر سمجھیں تو دنگ رہ گئیں۔ ان کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ شیری مسکراتی نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ حیرت کا شکار رہیں۔ پھر دوبارہ اخبار اٹھایا اور اس تصویر کو بغور دیکھنے لگیں جس میں نفیسہ اور عاقل ساتھ ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دیر تک وہ اس تصویر پر نگاہ جمائے رہیں۔ پھر ان کی آنکھوں میں پیار جاگ اٹھا۔ چشم تصور میں شاید انہوں نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھا تھا۔ پھر دفعتاً ان کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔

شیری ان کے چہرے کے ایک ایک تاثر کو نوٹ کر رہا تھا۔ بیگم صاحبہ سیدھی سادی خاتون تھیں۔ ہر طرح کے فریب اور ریا سے پاک۔ اس لیے ہر احساس کی لکیر ان کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ چنانچہ شیری بولا۔

''ہاں مجھے بھی اس الجھن کا احساس ہے۔''

''اس سلسلے میں شاید ہم کسی طرح انہیں مجبور نہیں کر سکیں گے۔'' بیگم صاحبہ متفکر انداز میں بولیں۔ پھر چونک کر کہنے لگیں۔

''تم کس الجھن کی بات کر رہے ہو؟''

''جو آپ کے ذہن میں پیدا ہوئی ہے۔''

''بھلا کیا الجھن پیدا ہوئی ہے میرے ذہن میں؟''

''محترم بابر علی صاحب۔'' شیری مسکرا کر بولا۔

''جادو گرم ہو تم بھی۔ خود سوچو، وہ برداشت کر لیں گے۔''

''قطعی نہیں برداشت کریں گے۔''

''پھر یہ سب کیسے ہوگا؟''

''میں صرف آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں امی جان!''

''یہ دونوں تو بڑے ہی خوب صورت لگ رہے ہیں۔ میں نے اس نگوڑے کو پہلے اس طرح دیکھا ہی نہیں تھا۔'' بیگم صاحبہ کے لہجے سے ممتا برس رہی تھی۔

''میں نے بھی نہیں دیکھا تھا امی جان! لیکن یہ تصویر دیکھ کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بڑی خوب صورت جوڑی لگ رہی ہے۔''

''ایسی ویسی۔ یوں لگ رہا ہے جیسے آسمانوں میں ترتیب دی گئی ہے۔''

''لیکن بابر علی کا کیا ہوگا؟''

''قدرت خود اس کے اسباب پیدا کرے گی۔

میرے ذہن میں ایک تاثر پیدا ہوا اور میں آپ کے پاس دوڑا آیا۔ آپ میرے اس جذبے کو سمجھتی ہیں امی جان!''

''کون سا جذبہ۔۔۔''

''دراصل آپ جانتی ہیں کہ اس دنیا میں میرا خاندان آپ لوگ ہیں۔ میں نوکر کی مانند یہاں آیا تھا لیکن آپ کو امی جان کہتا ہوں۔ آپ لوگوں نے مجھے وہ مقام دیا جس سے محروم تھا اور شاید ساری زندگی محروم رہتا۔ لیکن اس گھر میں مجھے سب کچھ مل گیا۔ ماں، باپ، دادا ابو، بھائی، بہن، امی جان۔ میں خاندان کے ایک ہی فرد کی مانند آپ سب لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔''

''یہ بات کون نہیں جانتا بیٹے!'' بیگم صاحبہ بڑی محبت سے بولیں۔

''میری نگاہ میں اس خاندان کے ایک ایک فرد کی بہتری رہتی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا ہے لے دوڑتا ہوں۔ اب دیکھیے نا یہ تصویر دیکھ کر میں بے قابو ہو گیا۔ آپ اس کی وجہ جاننا چاہتی ہیں۔''

''ضرور۔۔۔''

''امی! دولت مند لوگوں کا ایک مخصوص انداز فکر ہوتا ہے۔ ایک مخصوص تربیت ہوتی ہے۔ بابر علی صاحب اپنی بیٹیوں کے لیے اس معیار کے رشتے تلاش کریں گے جس معیار کے وہ خود ہیں۔ بلاشک و شبہ انہیں ایسے رشتے ملیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو دولت میں کھیلتے ہوں گے اور معاف کیجیے گا دولت کے رنگ عجیب ہوتے ہیں۔ ان سے دنیا کی ہر شے خریدی جاسکتی ہے۔ عزت و وقار کے لاکھوں معیار اس دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دولت ہو تو عزت خرید لیجیے، وقار خرید لیجیے۔ خاندانی شرافت و نجابت اس جہاں میں مفقود نہیں ہے لیکن دولت کے اثرات چاروں طرف نمایاں ہیں۔ نئی نسل جدت کے نام پر اخلاقی حدود سے گزر چکی ہے اور اب اخلاقیات اس کے لیے ایک بھولی بسری کہانی ہے۔ ہاں وہ نوجوان شریف بھی اور اہلِ اخلاق بھی ہیں جو دولت کی چمک کے شکار نہیں ہوئے۔ اس کے ذرائع محدود ہیں۔ اس لیے وہ پستیوں میں نہیں گر سکے۔''

شیری کہہ رہا تھا اور بیگم صاحبہ سن رہی تھیں۔ چند لمحات رک رک اس نے ان کی شکل دیکھی۔ پھر بولا۔

''آپ میری باتیں سمجھ رہی ہیں نا۔''

''ہاں بیٹا! کچھ سمجھ بھی رہی ہوں اور کچھ سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہیں۔''

''میں صرف اتنا کہنا چاہتا تھا امی جان کہ ہم اپنی ان پھول سی بہنوں کے لیے دولت مندوں کے رشتے تیار کریں گے تو بے شک وہ ان کے معیار کے ضرور ہوں گے۔ لیکن انہیں اپنے معیار میں تبدیلیاں پیدا کرنی پڑیں گی۔ چونکہ وہ خود ان کی سطح کے ہوں گی۔ اس لیے وہ لوگ نفیسہ اور انیسہ کی برتری قبول نہیں کرسکیں گے۔ آپ نے اپنی بچیوں کے مان کو کبھی نہیں توڑا۔ جس طرح والدین اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ میں کافی عرصے سے اس کوٹھی میں ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ نفیسہ اور انیسہ کس طرح پروان چڑھ رہی ہیں۔ کوئی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی اور ان کی پسند کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیے گئے لیکن اس وقت جب وہ کسی کی محکوم کی حیثیت سے اس کے زیر اثر ہوں گی اور کسی بات کی خواہش کریں گی تو اس خواہش کے جواب میں وہ جذبہ نہیں ہوگا جو آپ لوگوں کے سینے میں ہے۔ وہاں انہیں برابر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ انہیں ٹال دیا جائے گا۔ ان کی وہ تمام خواہشات قابل احترام نہیں سمجھی جائیں گی جو ان کے ذہن میں پیدا ہوں گی۔ ہاں کوئی معمولی خواہش ہوئی تو ٹھیک ہے پوری کردی۔ تو امی جان جس طرح آپ نے ان کی شخصیت بنائی ہے۔ وہ دوسری جگہ جا کر قائم نہ رہ سکے گی اور انسان جب ٹوٹتا ہے تو بے انتہا محرومیوں کا شکار ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یوں ہوگا کہ وہ محرومیاں اپنانے لگیں گی۔ ان کی وہ شخصیت ہی نہ رہے گی جو ہے۔ گویا آپ نے اپنی بچیاں جہنم میں جھونک

ہیں۔ آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ چاہیں تو عمر کی آخیر تک ان کی خواہشات اسی طرح پوری کرسکتی ہیں۔ جس طرح آپ نے ان کی پیدائش کے بعد سے اب تک کی ہیں۔ جب یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں امی جان تو پھر کیوں اپنی بچیوں کو امارت کے غارت میں دھکیل رہی ہیں۔ کیوں ایسے لوگوں کو تلاش کررہی ہیں جو آپ کی سطح کے ہوں اور آپ کو کچھ نہ سمجھیں۔ مجھے بتائیے کوئی دولت مند شخص آپ کا داماد ہوگا۔ وہ اپنی دنیا کا انسان ہوگا۔ آپ کو کس طرح وہ خاطر میں لائے گا۔ گویا آپ نے اسے اپنی بچی بھی دی اور آپ کی کوئی حیثیت بھی نہ رہی۔ کیا آپ کی یہ پھول سی بچیاں دکھوں کا شکار نہ ہوجائیں گی۔''

بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ وہ ایک سسکی سی لے کر بولیں۔

''ہاں! کیوں نہیں، کیوں نہیں۔''

''تو پھر امی اس کے ذرائع ہیں ہمارے پاس ابھی سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے اپنی بچیوں کو فروخت نہیں کیا۔ ہم نے کسی بااثر اور دولت مند شخص کے ہاتھوں اپنا وقار نہیں بیچ دیا۔ ہم کیوں ایک ایسے شخص کو تلاش کریں جو ہمیں مستقبل میں کچھ نہ سمجھے جو صرف ہمیں ایک ضرورت مند خیال کرے۔ آپ بتائیے، اس کے برعکس ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ دو انتہائی شریف الطبع نوجوانوں کو جو ہماری اپنی مٹھی میں ہوں، انہیں وہ حیثیت دے دیں کہ وہ دوسروں کی نظر میں صاحب حیثیت ہوجائیں۔

تصویر دیکھیے کیا یوں نہیں لگتا کہ عاقل اور نفیسہ ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ بہت سے ایسے جوڑ ملتے ہیں لڑکا بے پناہ دولت مند ہے۔ اعلا قسم کا سوٹ پہنے ہوئے ہے لیکن لنگور ہی لگ رہا ہے۔ امی کیا آپ لنگور کو انسان بنا سکتی ہیں؟''

''نہیں، بالکل نہیں بنا سکتی۔'' بیگم صاحبہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے نا، اب آپ ذرا بتائیے کہ اگر عاقل، نفیسہ سے منسوب ہوجاتا ہے، اگر آپ اس کی تھوڑی سی مدد کرکے اسے الگ کاروبار کرادیتی ہیں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ یہ ذمہ داری میرے اوپر چھوڑ دیں، میں عاقل کو اس کوٹھی سے ہٹا کر اس کا کوئی چھوٹا موٹا سا کاروبار کرادوں گا۔ ہم دیکھتے ہیں اس کی صلاحیتوں کو کہ وہ اس کاروبار کو کہاں تک بڑھا کر دکھا سکتا ہے۔ عاقل کو ہم نے ایک کاروبار کرادیا۔ اس میں اس نے ترقی کی، اپنے طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔

اس کے بعد ہم نے عزت سے اس کا رشتہ آپ تک پہنچایا اور آپ نے اس کی شادی نفیسہ کے ساتھ کردی تو عاقل یہ بات کبھی نہیں بھول سکے گا کہ اس کی تعمیر میں آپ کا ہاتھ ہے اور امی یہ چھوٹا موٹا سا کام تو آپ خود اپنے اکاؤنٹ سے کرسکتی ہیں اور نہ کریں میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ میں اس کا انتظام کرلوں گا۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہر قسم کی مخالفت برداشت کرکے نفیسہ کی شادی عاقل ہی سے کرنی ہے، یہ بات آپ صرف اپنے ذہن تک ہی محدود رکھیں۔ باقی ذمہ داری آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بات یہ ہے امی کہ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ کوئی بھائی نہیں تھا لیکن اب جب آپ نے مجھے ایک خاندان دے دیا ہے تو خدا کے لیے مجھے اس خاندان کی بہتری کا سوچنے کا بھی اختیار دیں۔ میں آپ سے پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ عاقل سے اچھا داماد آپ کو کبھی نہیں ملے گا۔ نیک، سعادت مند اور زندگی بھر آپ سے محبت کرنے والا۔ آپ کی کسی خواہش سے انحراف نہ کرنے والا۔ یہ بات میں نے بڑے غور وخوض کے بعد آپ سے کہی ہے۔ امی جان! یوں نہ سمجھیں کہ سطحی الفاظ میں، میں نے آپ سے کچھ کہہ دیا۔ آپ نے ایک کان سے سنا، دوسرے سے اڑادیا۔ اس بات کو اپنے ذہن میں بٹھا لیجیے۔ میری تو یہی رائے ہے۔ ویسے اگر آپ کہیں تو میں اپنے اختیارات کو محدود بھی کرسکتا ہوں۔ اگر آپ کو یہ رشتہ پسند نہیں ہوگا تو یقین کیجیے کبھی دوبارہ آپ سے اس سلسلے میں

ئی تذکرہ نہیں کروں گا۔"

"نہیں نہیں شیری! نفیسہ تمہاری تو بہن ہے بیٹے! اب جبکہ تم اس خاندان کے ہر فرد کو اپنے ہی خاندان کا فرد سمجھتے ہو تو پھر یہ الفاظ کیوں کہہ رہے ہو مجھ سے، تم اس کے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتے ہو۔ بلکہ سب سے بڑے بھائی تو تم ہو۔ بابر علی صاحب اپنے کاروباری امور میں اس طرح الجھے رہتے ہیں کہ انہیں گھریلو معاملات کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کسی رشتے دار کے بارے میں سوچیں گے، سطحی انداز میں اس کا جائزہ لیں گے اور ہاں کہہ دیں گے۔ اب بھلا بتاؤ ساری زندگی کے لیے اپنی نازوں کی پلی بیٹی اس طرح کسی شخص کے حوالے تو نہیں کی جاسکتی۔"

"بالکل نہیں کی جاسکتی۔ بالکل نہیں کی جاسکتی، تو پھر امی یہ مسئلہ طے۔"

"لیکن یہ میں کیسے کہہ دوں؟"

"نہیں، نہیں، یہ میں آپ سے نہیں کہہ رہا کہ آپ ہاں کر دیجیے اور ہم عاقل تک یہ بات پہنچا دیں یا اس کی امی سے کہہ دیں لیکن عاقل کو اب آپ اسی نگاہ سے دیکھیے۔ باقی معاملات میں خود طے کروں گا۔"

"اور وہ شہاب وتاب۔۔۔"

"ان کو میں ایسا نچواؤں گا کہ آپ دیکھتی رہیے، زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ پھر کسی کی طلب نہ کریں گے اور نہ کوئی شے انہیں مطلوب ہوگی۔" بیگم صاحبہ ہنس پڑیں۔

"میں جانتی ہوں کہ تم یہ سب کچھ کرلو گے۔"

"تو پھر مجھے جواب دے دیجیے۔"

"نہیں، نہیں میں جواب نہیں دوں گی۔ جب میرے شیری نے کسی مسئلے کو بہتر سمجھا ہے تو پھر میں بھی اسے اسی انداز میں سوچوں گی۔"

"ویری گڈ! یہ ہوئی نا بات امی جان! گویا ہمارے آپ کے درمیان یہ مسئلہ طے ہے کہ نفیسہ کی شادی ہم عاقل سے ہی کریں گے۔ اب باقی عاقل کے لیے جو کچھ کرنا ہوگا وہ میں کرتا رہوں گا۔ جب کسی مسئلے میں آپ کی ضرورت پیش آئی تو آپ کو تکلیف دوں گا۔ لیکن یہ سوچ لیجیے کہ اس سلسلے میں میری دست راست آپ ہوں گی۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تم جس طرح کہو گے میں اسی طرح عمل کروں گی۔"

"تو پھر آج سے آپ عاقل کو اسی نگاہ سے دیکھیے اور اگر مناسب سمجھیں تو یہ میری درخواست ہے آپ سے کہ عاقل کی والدہ سے بھی ملاقات کرتی رہیے تاکہ وہ خاتون آپنے آپ کو اتنا کمزور نہ سمجھیں کہ کبھی اس انداز میں سوچ ہی نہ سکیں۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں بالکل اور پھر تمہاری ہدایت ہے تو میں اس پر سو فیصدی عمل کروں گی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"بس۔ میری امی جان زندہ باد۔" شیری نے اپنی گردن جھکا کر کہا اور بیگم صاحبہ نے شیری کو سینے سے لگالیا۔

"ہاں! تیری امی جان۔ ۔ تیری امی جان شیری!"

شیری دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ اس نے داغ بیل ڈال دی تھی۔ کم از کم بیگم صاحبہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی یہ بات اور اب وہ اسی انداز میں سوچیں گی۔

سیدھی سچی انسان تھیں، جو کچھ کہتی تھیں وہی کرتی بھی تھیں اور شیری کو اطمینان تھا کہ جو بیج اس نے بویا ہے اس کا پھل ضرور نکلے گا۔ اب اس سلسلے میں باقی کارروائیاں کرنی تھیں جن کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ کے کمرے سے نکل کر چند ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ عقب سے کوئی اس کے اوپر آپڑا۔

دو نرم و نازک ہاتھ اس کی آنکھوں پر آجمے تھے، اس نے ان دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو پکڑلیا۔ نرم و نازک سی کلائیاں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سوچ نہ سکا کہ نفیسہ ہوسکتی ہے کیونکہ اس نے کبھی اتنی

بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

''پھر۔۔۔ پھر یہ کون ہے۔'' اس نے آہستہ سے جھٹکا دے کر اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑا لیا اور انیسہ کی نقرئی ہنسی اس کے کانوں میں گونج اٹھی، لیکن شیری ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا تھا۔ انیسہ نوجوان لڑکی تھی۔ نفیسہ اور اس میں صرف ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ جسمانی طور پر وہ نفیسہ سے بڑی نظر آتی تھی۔ خوب صورت سراپا کی مالک لیکن یہ معصوم سی لڑکی کبھی شیری سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ محبت ضرور کرتی تھی وہ اور اس کا اظہار دوسرے لوگوں کی طرح اس کے انداز سے بھی ہوتا تھا لیکن بس اپنے میں گم رہنے والی تھی۔ کبھی کسی مسئلے میں آگے بڑھ کر اس نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت اس کی بے تکلفی پر ایک لمحے کے لیے شیری جھجکا لیکن پھر فوراً سنبھل گیا۔

''ہم نے تو پہچان بھی لیا تھا بھئی۔ ہم نے سوچا کہ بس تمہیں بھی چکر دیا جائے۔''

''چکر تو آپ امی کو دے رہے تھے۔ میں نے آپ کی ایک ایک بات سنی ہے۔ ایک ایک بات ہائے اللہ۔۔۔! یہ تو بڑے مزے کی بات کہی شیری بھائی آپ نے، عاقل بھیا تو مجھے بھی پسند ہیں۔ آپ یقین کریں کہ میں کبھی ان سے بے تکلف نہیں ہوئی، لیکن دور دور سے انہیں دیکھتی تھی تو بڑے پیارے لگتے تھے وہ مجھے بالکل ہی اپنے بھائیوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔''

''اوہو۔ ہو۔ ہو! تم تو بڑی خطرناک لڑکی ہو بھئی۔ ہمارے اتنے اہم راز سے واقف ہوگئیں، آؤ ذرا اپنے کمرے میں آؤ۔'' شیری نے کہا۔ وہ واقعی بوکھلا گیا تھا۔ انیسہ معصوم صفت تھی۔ پتا نہیں کس کس سے کیا کہتی پھرے گی اور یہ بات وقت سے پہلے بابر علی صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔

بابر علی صاحب اس بات کو اچانک تو بالکل ہضم نہیں کرسکیں گے اس کے لیے طویل و عریض گراؤنڈ بنانا پڑے گا۔ اس میں بابر علی صاحب کو دوڑایا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ ہانپ جائیں گے تو پھر انہیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر وقت سے پہلے یہ بات کسی کے کانوں تک پہنچ گئی اور اس کے ذریعہ بابر علی صاحب تک تو پھر معاملہ بڑا خراب ہوسکتا ہے چنانچہ انیسہ کو سنبھالنا بے حد ضروری تھا۔

انیسہ ہنستی ہوئی اس کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔

''بیٹھیے انیسہ بیگم صاحبہ! یہ بتایئے آپ کو یہ عادت کب سے پڑ گئی ہے۔''

''کون سی عادت۔'' انیسہ ہنستے ہوئے بولی۔

''یہی۔۔۔ لوگوں کی باتیں چھپ چھپ کر سننے کی۔''

''اللہ قسم! شیری بھائی! زندگی میں پہلی بار کسی کے الفاظ میرے کانوں تک پہنچے ہیں اور وہ بھی میں نے خود کوشش نہیں کی۔ آپ اور امی بڑے پیار سے باتیں کررہے تھے میں اندر آرہی تھی۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا باتیں کررہے ہوں گے۔ انتظار کرنے لگی کہ آپ کی بات ختم ہوجائے۔ پھر کچھ ایسے الفاظ کانوں میں پڑے کہ میں مجبور ہوگئی۔ بھئی دیکھیے نا آخر میری بہن ہے نفیسہ، میری باجی ہے وہ اور ان کی شادی کے لیے میرے دل میں بہت سی باتیں ہیں۔ اگر ان کی شادی کی بات ہورہی تھی تو میں کیوں نہ دلچسپی لیتی۔''

''انیسہ بیگم آپ یہ بتایئے کہ عاقل آپ کو نفیسہ کے شوہر کی حیثیت سے پسند ہوگا؟''

''بہت پسند، بہت پسند، میں تو صبح کو ان دونوں کی تصویریں دیکھ کر یہی سوچ رہی تھی کہ کتنے پیارے لگ رہے ہیں یہ دونوں۔ آپ یقین کریں ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ تصور آیا تھا کہ اگر ان دونوں کے چہرے پر سہرے کے پھول پڑے ہوتے تو کیسے لگتے۔ اخبارات میں تصویریں چھپتی ہیں نا کہ فلاں کی شادی فلاں کے ساتھ ہوئی اور فلاں کی شادی فلاں کے ساتھ ہوئی۔ میں ان تصویروں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوں اور یہ اندازہ لگاتی ہوں کہ

یہ دولہا دلہن کے ساتھ کیسا لگتا ہے۔ کہیں آپ یقین کریں دلہن بندریا ہوتی ہے اور دولہا خوب صورت، اور کہیں دولہے میاں۔ ویسے عام طور سے دولہا میاں ہی بندر نظر آتے ہیں۔ لڑکوں کی اچھی شکلیں جانے کہاں مٹ گئی ہیں۔ کم بخت دولہا بن کر تو اچھے نہیں لگتے۔'' انیسہ نے ناک چڑھا کر کہا اور شیری بے اختیار ہنس پڑا۔

''ہاں! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ عام طور سے لڑکے دولہا بنے ہوئے بہت کم اچھے لگتے ہیں لیکن انیسہ بیگم! عاقل دولہا بنا ہوا بہت اچھا لگے گا۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں عاقل بھائی کے علاوہ کسی اور سے تو نفیسہ باجی کی شادی ہونی ہی نہیں چاہیے۔'' انیسہ نے حسب عادت بڑی معصومیت سے کہا۔

''خیال تو میرا بھی یہی ہے، لیکن آپ کے ڈیڈی کہاں مانیں گے۔''

''اجی، کیسے نہیں مانیں گے ڈیڈی! انہیں ماننا پڑے گا۔ آخر ہم بھی تو کوئی حیثیت رکھتے ہیں اس گھر میں، ہم بھی تو کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔ یہ کیا بات کہ ہر مسئلے میں ڈیڈی ہی کے فیصلے مسلط ہوں۔''

''ہاں! اگر یہ ہمت اور جرات اس گھر کے ہر فرد میں پیدا ہو جائے تو پھر یہ گھر ایک جنت ارضی بن سکتا ہے۔ اب دیکھیے نا! بابر علی صاحب اپنے گھر کے لیے کبھی برے انداز میں نہیں سوچ سکتے لیکن وہ بھی انسان ہیں۔ ان کے فیصلے بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ وہ نفیسہ کے لیے، تمہارے لیے ایسے بندروں کا انتخاب کر سکتے ہیں، جن کی تصویر اگر اخبار میں چھپے تو لوگ اسی طرح ہنس پڑیں، جس طرح تم اس قسم کے بندروں کو دیکھ کر ہنس پڑتی ہو۔ یہ بندر دولت مند ہوں گے۔ بڑا مال ہوگا ان کے پاس، اعلا سے اعلا لباس پہنیں گے، اعلا سے اعلا گاڑیوں میں گھومیں گے لیکن کہلائیں گے تو بندر ہی۔ بابر علی صاحب تو صرف یہ دیکھیں گے کہ وہ کتنے دولت مند ہیں۔ اس لیے کہ ان کا نکتہ نگاہ ہی یہی ہے۔ وہ یہ تھوڑا ہی سوچیں گے کہ ان کی حسین بیٹیوں کے لیے ویسے ہی حسین شوہر بھی ہونے چاہئیں۔

''سوچنے دیں، انہیں سوچنے دیں۔ ہم تو کسی لنگور سے شادی نہیں کریں گے۔'' انیسہ نے جواب دیا۔

''بالکل نہیں کریں گے تو پھر انیسہ بیگم اتفاق سے یہ بات تمہارے کانوں تک پہنچ گئی کہ ہم عاقل کو نفیسہ سے منسوب کرنا چاہتے ہیں لیکن نفیسہ بیگم ایک بات سے آپ کو آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔''

''جی فرمایئے۔''

''اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کی نفیسہ باجی اور عاقل بھائی یکجا ہو جائیں تو جو کچھ سن چکی ہیں اپنے کانوں میں بند کر لیں، زبان اگر کھل گئی تو یوں سمجھ لو کہ یہ رشتہ کبھی طے نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''بھئی وہی۔۔۔ امیری، غریبی کا فرق، یہ لوگ غریبوں کو انسان نہیں سمجھتے، نہ جانے کیوں، بھئی دولت تو خدا کی دین ہے، کسی کو اللہ نے ضرورت سے زیادہ دے دی ہے اور کسی کو ضرورت کے مطابق بھی نہیں۔ یہ مسئلے تو اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن اس نے یہ تو نہیں کہا کہ تم غریبوں سے نفرت کرنا سیکھ لو۔''

''نہیں، نہیں۔ بالکل نہیں۔ بلکہ علامہ اقبال نے تو ہمیشہ غریبوں سے محبت کرنے کا درس دیا ہے۔ وہ ہے نا۔

''ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا''

تو پھر ہم لوگ غریبوں کی حمایت کیوں نہیں کریں۔ آخر علامہ اقبال اتنے بڑے شاعر تھے۔ اتنے بڑے مفکر تھے، کوئی بات بلاوجہ تو نہ کہہ دی ہوگی انہوں نے۔''

''بالکل نہیں، بالکل نہیں، انہوں نے جو کچھ کہا ہے انسانیت کی فلاح کے لیے کہا ہے۔ انہوں نے برائیوں کی طرف جانے والے کو برائیوں سے روکا ہے۔ اپنی نظموں میں انہوں نے ہمیشہ انسان کو انسانیت کا درس دیا ہے۔ غریب ہمارے معاشرے کا

ایک انسان ہی تو ہے۔ تم خود سوچو، زندگی کے مسائل میں الجھے ہوئے، حالات کے ہاتھوں پریشان لوگ اگر دوسرے لوگوں کی نفرتوں کا شکار بن جائیں تو ان کے لیے جینے کا سہارا کیا رہ جاتا ہے۔''

''بالکل نہیں رہ جاتا۔ میں غریبوں سے محبت کرتی ہوں۔''

''زبانی نہیں انیسہ بیگم! آپ اپنا ایک عزم بنا لیجیے۔ آپ صرف غریبوں کو چاہیں گی۔ دولت مندوں کو ٹھکرائیں گی۔ بتایئے کیا اس مشن کا آغاز کر رہی ہیں آپ؟''

''بالکل کر رہی ہوں۔ ملایئے ہاتھ۔'' انیسہ نے اپنا ہاتھ شیری کی طرف بڑھا دیا اور اس نے بڑے پیار سے اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''انیسہ! میں تو تمہارے لیے بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کسی غریب کو اپنے لیے منتخب کر لو۔''

''آپ بالکل صحیح چاہتے ہیں، آپ فوراً کسی غریب کو میرے لیے منتخب کر لیں۔'' انیسہ نے جواب دیا۔

''فورا۔۔۔!''

''ہاں۔۔۔ مم۔۔۔ میر۔۔۔ میرا مطلب ہے، میرا مطلب ہے۔'' انیسہ کو اپنے الفاظ کا احساس ہو گیا اور وہ جھینپ سی گئی۔

''تو پھر شیری بھائی! میں آج ہی غریبوں سے محبت شروع کر دوں گی یہ بات طے۔ میں جس غریب سے محبت کروں گی اس کے بارے میں آپ کو بتا دوں گی۔'' انیسہ نے بڑی سادگی اور خلوص سے کہا۔

''ٹھیک ہے انیسہ! لیکن کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھنا جو تمہارے لیے پریشان کن بن جائے۔''

''نہیں، نہیں۔ آپ کے مشورے کے بغیر میں کوئی کام نہیں کروں گی۔ بس جس غریب سے بھی محبت کروں گی اسے آپ کے سامنے لے آؤں گی۔'' انیسہ نے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے تمہارے مشن کا آغاز آج سے ہو گیا۔ اس بات کو ذہن میں بٹھا لو کہ اگر بابر علی صاحب کوئی بھی دولت مند رشتہ تمہارے لیے لائیں تو تم فوراً انکار کر دو گی۔ تمہاری شادی کسی غریب سے ہی ہو گی اور میں تمہارے لیے وہ شخص منتخب کروں گا۔''

''وعدہ شیری بھائی! آپ کی ہدایت کے مطابق ہی کام ہو گا۔''

''بہت اچھا، تو اب میں اس بات کا اطمینان رکھوں کہ تم یہ الفاظ کسی سے بھی نہیں کہو گی۔ میرا مطلب ہے عاقل اور نفیسہ کے بارے میں۔''

''وعدہ! آپ سے جو وعدہ کروں گی۔ اسے ہمیشہ نبھاؤں گی۔ اس بات کو اپنے ذہن میں رکھے گا۔''

''بہت، بہت شکریہ! میری چھوٹی سی بہن، پیاری سی بہن نے مجھے بہت بڑا درجہ دیا ہے۔ میں اس کے لیے اس کا شکر گزار بھی ہوں۔'' شیری نے کہا۔

''ارے نہیں، شیری بھائی! آپ تو ہمارے سارے بھائیوں سے اچھے ہیں۔ آپ یقین کریں آپ کو بہت زیادہ چاہتی ہوں۔ کبھی کہا ہی نہیں آپ سے کوئی موقع ہی نہیں ملا۔'' انیسہ نے کہا۔

''کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے انیسہ! تمہاری آنکھوں سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' انیسہ شرارت سے بولی اور اپنی آنکھیں جھپکانے لگی۔ شیری ہنستا ہوا اس کے کمرے سے نکل آیا تھا۔

ایک خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس کے لیے چونکہ انیسہ بچوں کی سی فطرت رکھتی تھی۔ کسی کے سامنے بھی وہ اپنی زبان سے یہ الفاظ نکال سکتی تھی لیکن اب شیری کو اطمینان تھا کہ وہ کسی سے یہ سب کچھ نہیں کہے گی۔

چودہ تاریخ کو بابر علی صاحب واپس آ گئے۔ بجھے بجھے سے تھے، تھوڑے سے جھینپے ہوئے بھی۔ اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بس ہمیشہ کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے تھے۔ انہیں کوئی اور پروگرام بھی ترتیب دینا تھا۔

غالباً باہر جانے کا پروگرام تھا۔ اس بار انہیں خاصے دنوں کے لیے باہر جانا تھا۔ اس کا تذکرہ انہوں نے صرف اپنی بیگم سے کیا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی اس مسئلے کو گول کر گئی تھیں۔ حالات ان کے کانوں تک پہنچ گئے تھے اور وہ جانتی تھیں کہ یہ بابر علی صاحب کی ایک دکھتی رگ ہے۔ ایک کمزور پہلو، جسے وہ دوبارہ سننا پسند نہیں کریں گے۔

بابر علی صاحب خاص طور سے دادا ابو کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔ ہر صورت دادا ابو نے بھی ان سے اس مسئلے پر کوئی باز پرس نہیں کی اور تقریباً ندیم اور وسیم کا سلسلہ ختم ہی ہو گیا۔ لیکن نمائش کے سلسلے میں بابر علی صاحب ذرا کچھ الجھے ہوئے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ کسی سے کوئی بات کریں، لیکن جانتے تھے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس نمائش کا روح رواں بھی شیری ہی تھا۔ ندیم اور وسیم نے جو حرکت کی تھی وہ بڑی مذموم تھی۔ خاص طور سے ان کی گفتگو کا کیسٹ سننے کے بعد تو بابر علی صاحب کو ان کے وجود سے نفرت ہو گئی تھی۔ انہیں بخوبی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دونوں نوجوان اس قسم کے لوگوں میں سے تھے جو کسی کے گھر میں گھس کر ہمیشہ برائیوں کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن جو رپورٹ انہوں نے شیری کے بارے میں دی تھی اس رپورٹ سے بابر علی صاحب پوری طرح متفق تھے۔ انہیں یقین تھا کہ شیری پوری طرح اس کوٹھی پر اپنا جال پھیلائے ہوئے ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شیری اس جال سے فائدہ کیا اٹھا رہا ہے۔ اپنے طور پر انہوں نے بھرپور کوشش کی تھی کہ شیری کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اس سے گھلنے ملنے کی کوششیں بھی کی تھیں انہوں نے لیکن بابر علی صاحب، شیری کو فطرتاً ایڈجسٹ نہیں کر پائے تھے اور پھر مصروف انسان تھے کسی ایک مسئلے پر اتنی توجہ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ شیری دادا ابو کو بے وقوف بنا کر دولت اکٹھی کر رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی ذریعہ اس نے ایسا نکال لیا ہوگا جس سے اس کا بینک بیلنس بڑھتا جا رہا ہوگا لیکن انہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پچاس، ساٹھ لاکھ اگر لے بھی گیا تو کون سی مصیبت آ جائے گی۔ افسوس تو انہیں صرف اس بات کا تھا کہ گھر کے سارے افراد اس پر بے پناہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ نفیسہ اور انیسہ کا معاملہ بھی ان کے ذہن میں آیا تھا۔ کہیں شیری بھی اسی قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے جو پہلے ندیم اور وسیم نے کی تھی۔

لیکن ابھی تک کوئی ایسی شکل انہیں نظر نہیں آئی تھی بلکہ بیگم صاحبہ نے تو ایک بار ان کی اس بات پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور کہا تھا کہ وہ جانتی ہیں کہ شیری، نفیسہ اور انیسہ کو اپنی بہنوں کی مانند سمجھتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر شدید نفرت کا اظہار کیا تھا کہ شیری پر اس قسم کا کوئی شک کیا جائے۔

چنانچہ بابر علی صاحب کو کوئی ایسا موقع نہیں مل رہا تھا کہ وہ شیری کو چت کر دیتے۔ کاروباری طور پر انہوں نے بڑے بڑے حریفوں کو چت کیا تھا۔ بلکہ اپنی فیلڈ میں کنگ کہلاتے تھے۔ ایک بہترین دماغ تھا ان کے پاس لیکن ان معاملات میں وہ اپنے آپ کو شیری کے سامنے بے بس پا رہے تھے۔ انہیں شیری سے مسلسل خطرہ رہتا تھا، اگر کبھی وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا تو ان کے لیے واقعی بڑی پریشانی کا باعث بن سکتا ہے حالانکہ ان کے لیے یہ مشکل کام نہیں تھا کہ کسی بھی وقت شیری کی چھٹی کرا دیتے۔ دو چار بدمعاشوں کو پچاس، ساٹھ ہزار روپے دے کر یہ مشکل کام نہیں تھا لیکن اس حد تک وہ نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس وقت تک جب تک کہ شیری ان کے لیے کوئی بڑی مصیبت نہ بن جائے۔

ان دنوں نمائش کا چرچا تھا۔ گھر کا ہر فرد نئے نئے کپڑے بنا رہا تھا۔ سات دن کے لیے، سات سات جوڑے بنائے گئے تھے۔ ہر روز نمائش میں جانے کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔ یہ باتیں بابر علی صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

نفیسہ کے نگار خانے کو دیکھ چکے تھے۔ اوٹ پٹانگ تصویریں، بے تکی، کوئی ایک شکل واضح نہیں تھی۔ بھلا یہ مصوری کی کون سی قسم ہے اور پھر مصوری کا ایسا جنون کس کام کا۔ آخر نفیسہ ایک عظیم مصورہ بن کر کیا کرے گی، لیکن بس شوق۔ اس سے برے حالات صفدر کے تھے۔ جھاڑ جھنکار داڑھی، بکھرے ہوئے بال، سرخ سرخ آنکھیں پتا نہیں کیا حلیہ بناتا جارہا تھا۔

اپنے بیٹے کا یہ حشر ان کے لیے قابل برداشت نہیں تھا۔ لیکن صفدر نے بڑی ہمت اور جرات سے حالات کا مقابلہ کیا تھا۔

بابر علی صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ نئی نسل کسی کے قابو میں نہیں آنے والی ہے ذہنی رو جس طرف بھٹک جائے پھر اسے روکنا ایک مشکل کام ہی ہوگا اور اس کے نتیجے میں بھیانک المیے ظاہر ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ صفدر گھر سے بھاگ جاتا۔ سماج میں کیا عزت رہ جاتی ان کی، بیٹا گھر سے بھاگ گیا، ہپی بن گیا تو۔۔۔

توبہ توبہ، وہ جب بھی سوچتے ان کا دل لرز جاتا تھا۔ چنانچہ یہی بہتر تھا کہ کان دبائے حالات کے منتظر رہیں۔ ایک وقت تو ایسا آئے گا جب ان سب کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ شیری کے سامنے وہ کسی حد تک بے بس ہوچکے تھے، لیکن اس بے بسی کو قبول کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ منتظر تھے اس وقت کے جب شیری کا کوئی کمزور پہلو ان کے ہاتھ آجائے۔ اس کمزور پہلو کو سامنے رکھ کر وہ شیری کا ستیاناس تو کرسکتے تھے۔

نمائش کے سلسلے میں انہوں نے اخبارات میں تفصیل پڑھی تھی۔ بڑے بڑے لوگ اب اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ خاص طور سے اخبارات نے اس تذکرے کو بہت اچھالا تھا کہ بابر علی صاحب جیسے عظیم شخص کا خاندان مخیر انسانوں کا خاندان ہے۔ اس گھر کا ایک ایک فرد انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ ایسے حسین دلوں کے مالک خاندان کے لیے حکومت کو بھی ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرنی چاہئیں۔ ''اپنا گھر'' کا تذکرہ بھی بار بار ہوتا تھا اور پھر نفیسہ کی تصویروں کی نمائش کے بعد تصاویر کے نیلام کا سلسلہ بھی اخبارات نے بہت اچھالا تھا جس کی تمام تر آمدنی وقف کردی گئی تھی بیواؤں اور یتیموں کے لیے۔

بلاشبہ ان تمام کاموں سے بابر علی صاحب کو انحراف نہیں تھا۔ یہ تو اچھی باتیں تھیں لیکن اس قسم کے معاملات اور اتنے زور وشور سے، آخر کیا معنی رکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے اگر کچھ خیرات کرنا ہے تو مختلف انداز میں کردی جائے، لیکن اس کے لیے ایسے ہنگامے ہورہے ہیں حالانکہ اس طرح ان کے خاندان کی عزت بڑھ رہی تھی۔ بس ایک خلش تھی انہیں اگر نفیسہ اپنے طور پر اس طرف توجہ دیتی تو شاید انہیں اعتراض نہ ہوتا، لیکن یہ سب کچھ شیری کے ذریعے ہورہا تھا۔ یہ بات انہیں پسند نہ تھی۔ تاہم انہوں نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کررکھی تھی۔

ایک رات نفیسہ نے بڑی چاہت سے ان سے کہا۔

''ڈیڈی آپ کو علم ہے کہ اب میری تصویروں کی نمائش میں صرف چند دن رہ گئے ہیں۔ اب یہ بتایئے اس سلسلے میں آپ ہمارے لیے کیا کررہے ہیں؟''

''کیا چاہتی ہو مجھ سے۔'' بابر علی صاحب نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

''بس کچھ نہیں، سارا کام تو شیری بھائی کررہی رہے ہیں۔ آپ صرف ہماری اس نمائش میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے آیئے۔''

''نہیں بھئی، لوگ کیا کہیں گے۔'' بابر علی صاحب نے کہا۔

''کیوں۔ کیا کہیں گے لوگ؟''

''یہی کہ بیٹی کی تصویروں کی نمائش ہے اور ابا جان چیف گیسٹ بن گئے۔''

''اچھا، تو پھر اس کے لیے کسی کا انتخاب

لیجیے۔''

''میں کیا کرسکتا ہوں۔'' بابر علی صاحب نے کہا۔

''ڈیڈی کوئی ایسا نام تو پیش کرسکتے ہیں جو اس سلسلے میں اس نمائش کا افتتاح کرسکے۔''

''اس کا فیصلہ شیری نے کرلیا ہوگا۔'' بابر علی صاحب نے کہا۔

''نہیں، میرا خیال ہے ابھی تک انہوں نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا اور فیصلہ بھی نہیں کیا ہوگا۔''

''تم اس سے بات کرلو اگر کوئی گنجائش نکلی تو پھر مجھ سے جو کہو میں کردوں گا۔''

''ایک بات تو آپ سے ضرور کہی جائے گی ڈیڈی!'' نفیسہ نے کہا۔

''ہاں، ہاں کہو۔''

''آپ ہماری ایک تصویر خریدیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''جب تصویروں کا نیلام ہوگا تو میری ایک تصویر آپ خرید لیں گے اور بہت قیمتی خریدیں گے، بلکہ آپ یوں سمجھیے کہ اس کی ابتدا آپ ہی کریں گے۔''

''وہی بات ہوجائے گی اگر میں تمہاری تصویر خریدنے کی ابتدا کروں گا تو لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ میں دوسروں کو رجھا رہا ہوں۔''

''اچھا، اچھا چلیے، کوئی بات نہ مانیے، شریک تو ہوں گے ہماری نمائش میں؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' بابر علی صاحب نے کہا۔ بچوں کو وہ بے پناہ چاہتے تھے اور آج تک ان کی یہی کوشش رہی تھی کہ ان کے کسی بچے کو ان کی ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ نفیسہ نے بابر علی صاحب کے الفاظ کی روشنی میں شیری سے اس سلسلے میں بات کی۔

☆☆☆

''شیری بھائی! یہ تو بتائیے کہ ہمارا چیف گیسٹ کون ہوگا؟''

''یہ بات صیغہ راز میں ہے۔ سوونیئر چھپ رہا ہے۔ تین دن پہلے اس بات کا انکشاف کیا جائے گا۔''

''مجھے تو بتا دیجیے کم از کم۔''

''ہاں، ہاں۔۔۔ تمہیں بتانے میں کوئی ہرج نہیں ہے، لیکن ابھی کسی اور کو نہیں بتانا۔ میں نے اس سلسلے میں وزیر اطلاعات ونشریات سے رابطہ قائم کیا ہے۔ دادا ابو نے ان سے ملاقات بھی کرلی ہے اور وہ بنفس نفیس ہماری اس نمائش کا افتتاح کرنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ ہاں آج ایک فوٹو گرافر آئے گا، وہ ان تمام تصاویر کی ٹرانسپرنسی بنائے گا سوونیئر میں چھاپنے کے لیے تم حسب خواہش اس سے تصاویر بنوالینا۔''

''نہیں، نہیں۔ اس وقت آپ کا ہونا بہت ضروری ہے شیری بھائی!''

''بھئی میں تو نہیں ہوں گا۔ البتہ میں عاقل کو اس سلسلے میں ہدایت کردوں گا۔'' شیری نے کہا۔

''ٹھیک ہے عاقل صاحب اپنی نگرانی میں یہ تصاویر بنوائیں، کب آئے گا فوٹو گرافر؟''

''میرا خیال ہے ایک دو گھنٹے میں پہنچنے والا ہوگا، تم کسی اور کام میں نہ مصروف ہوجانا۔''

''ٹھیک ہے تو پھر ہماری تصاویر کی نمائش کے افتتاح کے لیے وزیر اطلاعات ونشریات آرہے ہیں۔''

''ہاں، یہ بات تو طے ہوچکی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ میرا خیال ہے اس طرح اس نمائش کو اور بھی شہرت ملے گی۔''

''بس دیکھتی جاؤ نفیسہ! جو وعدہ تم سے کیا ہے اسے پورا کرنا تو میرا فرض ہے۔''

نفیسہ بہت زیادہ مسرور نظر آرہی تھی۔ بالآخر اخبارات میں اس بات کا اعلان کردیا گیا کہ بیس تاریخ کو ہونے والی نمائش میں افتتاح کے لیے وزیر اطلاعات ونشریات تشریف لا رہے ہیں۔ بڑے بڑے نقادوں کو ملک کے طول وعرض سے بلایا گیا تھا

اور ان کے قیام کے لیے اعلا پائے کے ہوٹلوں میں بندوبست کردیا گیا تھا۔ سب کو خوش رکھنا شیری کا فرض تھا۔ پریس کو بھی اس سلسلے میں اس نے بہت نوازا تھا اور تقریباً تمام اخبارات بہترین تعاون کا مظاہرہ کررہے تھے۔

اشتہارات میں خصوصی رعایت دی جارہی تھی۔ پبلسٹی کرنے والی کمپنیاں بھی اس سلسلے میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ جس کے لیے کوئی اشتہار نہیں حاصل کیا گیا تھا بلکہ وہ اپنے ہی سرمائے سے تیار کیا جارہا تھا۔ یہ ایک مثالی سوونیئر تھا۔ بابر علی صاحب کے خاندان کے بارے میں بہت ساری تفصیلات لکھی گئی تھیں۔ اہل خاندان کی مختلف تصاویر تھیں۔ سوائے بابر علی صاحب کے باقی سب کی تصاویر بنوائی گئی تھیں۔

پھر بابر علی صاحب کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ ایک گروپ فوٹو بنوالیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگئے۔ شیری اسی سلسلے میں ہر وہ کام کررہا تھا جو ممکن ہوسکتا تھا۔ یہ سوونیئر جو اس نے چھپوایا تھا انتہائی حسین تھا خوب صورت ترین کاغذ پر بہترین طباعت سے آراستہ سوونیئر تیار ہوگیا۔

بیس تاریخ کو شیری نے آرٹس امپوریم میں چارج سنبھال لیا۔ صبح ہی سے تمام لوگ مصروف تھے۔ تصاویر کی نمائش کا افتتاح شام کو ساڑھے پانچ بجے ہونے والا تھا اور آج شیری کو اپنے وہ کرتب دکھانے تھے جن کے لیے اس نے بہترین تیاریاں کرلی تھیں۔ جوں جوں وقت قریب آتا جارہا تھا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ خاص طور سے نفیسہ اور عاقل سب سے زیادہ نروس تھے، لیکن شیری نے ان میں بھی چابی بھردی اور انہیں کافی حد تک اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ پورے ہوش وحواس اور دل جوئی کے ساتھ نمائش میں حصہ لیں۔ وقت آگیا۔ شیری ایک خوب صورت لباس میں ملبوس مہمان کو ریسیو کررہا تھا۔ نفیسہ اس کے پاس کھڑی تھی۔ تصاویر آویزاں کردی گئی تھیں اور ان پر کوئی چٹ نہیں لگائی گئی تھی بلکہ اس سلسلے میں بھی ذرا سی جدت طرازی کی گئی تھی اور نقادوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ خود ہی ان تصاویر کو دیکھ کر ان کے ناموں کا انتخاب کریں۔

نفیسہ کو اس سلسلے میں جو سبق پڑھائے گئے تھے اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر یاد کیے تھے۔ بہر صورت ٹھیک پانچ بجے وزیر اطلاعات ونشریات کی کار آرٹس امپوریم کے وسیع احاطے میں داخل ہوگئی۔ ان کا بہترین استقبال کیا گیا تھا۔

فوٹو گرافرز، پریس رپورٹرز، وزیر اطلاعات ونشریات کے عقب میں اندر پہنچے تھے اور مسلسل تصاویر بنائے جارہے تھے۔ یہ تصویریں نفیسہ، بابر علی صاحب اور وزیر اطلاعات ونشریات کے ساتھ کھینچی گئی تھیں۔ نقاد حضرات ایک ایک تصویر کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی قدر پریشان سے نظر آتے تھے، لیکن جب وہ اس مجمع کو دیکھتے اور ایک اتنی بڑی شخصیت ان کی نگاہوں کے سامنے آتی تو ان کے چہرے مطمئن ہوجاتے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد نقادوں سے ان تصاویر کے نام تجویز کرنے کی درخواست کی گئی۔ ملک کے ایک بہت بڑے تجریدی آرٹ کے مصور سے ایک تصویر کے نام کے بارے میں پوچھا گیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مدبرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میری ناقص رائے میں اس کا نام ''ہجر'' ہونا چاہیے۔ رنگ اور لکیریں یکجا ہوکر ایک ایسی آرزو کا مدفن بن گئی ہیں جو دل کے نازک شیشے میں پیدا ہوتے ہی مرجھا گئی ہو۔ یہ تصویر اور یہ رنگ اسی احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ایسی حسینہ جس نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں جنم لیا ہو، لیکن جس کے احساسات کائنات پر محیط ہوں۔ جب اپنے وسائل محدود پاکر وہ اپنے مرکز کی تلاش میں ناکام رہی تو یہ مسرت مایوسی کے ان رنگوں میں ڈھل گئی۔ عظیم مصور نے ان رنگوں سے یہی خاکہ پیش کیا ہے۔ میں اسے ''ہجر'' کا نام دیتا ہوں۔

چنانچہ فوراً ہی اس عظیم نقاد کا دیا ہوا یہ نام قبول کرلیا گیا اور تصویر کے نیچے ''ہجر'' لکھ کر لگا دیا گیا۔ دوسرے نقادوں نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے تصاویر دیکھ دیکھ کر خوب صورت تشبیہات اور نئے نئے نام تلاش کیے۔ ایک تصویر کو ''تنہائی'' کہا گیا، دوسری کو ''سویرا'' تیسری کو ''آبرو'' چوتھی کو ''فریب'' پانچویں تصویر میں نقاد حضرات ذرا الجھ گئے تھے۔ شیری نے ان لوگوں کو دیکھا تو ان کے قریب پہنچ گیا۔ ایک بڑے فن کار نے نفیسہ سے سوال کیا۔

''بی بی۔۔۔! کیا آپ بذاتِ خود اس تصویر کی تھوڑی سی تشریح کرسکیں گی۔

''جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔، یہ۔۔۔ میرا مطلب ہے، میں نے ''بھنور'' بنایا ہے۔ جب ہر شخص فکروں سے آزاد رنگوں کی لہروں میں جھومتا پھر رہا ہوگا۔ یہ دنیا مصائب سے پاک ہوچکی ہوگی۔ یہ ایک خوش گوار مستقبل کی آس ہے۔''

''بہت خوب۔۔۔ بہت خوب، دراصل میں تمہارے منہ سے یہ سننا چاہتا تھا۔ سب اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر ان تصاویر کی تشریح کرتے پھر رہے ہیں، لیکن خود مصورہ کے ذہن میں کیا ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہمارے ملک میں ایک ایسے فن کار کا اضافہ ہوا ہے جو دنیا کو صرف الجھنوں میں نہیں دیکھ رہا۔ آرزوئیں سسکتی ہیں اور انسان کی شکل بگڑ جاتی ہے۔ لیکن روشنی کی ایک کرن اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہ کرن بھی فنا ہوجائے تو انسان ساری زندگی تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا۔ میں تمہارے اس بھنور کو سلام کرتا ہوں۔ یہ نئی روشنی ہے، نئی صبح ہے۔ اس تصویر پر میں تمہیں خصوصی مبارک باد پیش کرتا ہوں نفیسہ بابر علی!'' ایک نقاد نے کہا اور نفیسہ نے گردن خم کردی۔

عاقل کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں، اس کا دماغ ہوا میں اڑا جارہا تھا جو کچھ ہو رہا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ تصویریں جو کچھ تھیں عاقل جانتا تھا۔ اتنا جانتا تھا کہ نفیسہ بھی اس سے ناواقف تھی۔ نفیسہ بے چاری نے تو اس کے احکامات کی روشنی میں رنگ اور برش استعمال کیے تھے اپنے طور پر اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ استاد پر مکمل بھروسا تھا۔ اسے استاد جو کچھ کہہ رہا ہے۔ سچ ہی کہہ رہا ہوگا، لیکن استاد نے جو کچھ کہا تھا اس کی سچائی پر وہ خود بھی شرمندہ رہتا تھا۔

اور اب یہ نقادانِ فن کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ بڑے بڑے نام جنہیں وہ اخبارات اور رسائل کی زینت دیکھ چکا تھا جن کے بارے میں بڑے بڑے مضامین لکھے جاتے تھے، ان تصویروں کے سامنے کھڑے ہوکر انہیں نام دے رہے تھے، انہیں تصویریں تسلیم کررہے تھے۔ یہ ایک ایسی حیرت ناک بات تھی جو کسی طور پر عاقل کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ اس دنیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس پر غور کررہا تھا۔ اس نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا۔ فن مصوری کے بڑے بھی ان تصویروں کو دیکھیں گے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں گے۔ پوچھیں گے کہ بھائی یہ کیا ہے اور شاید وہاں شیری کی چرب زبانی بھی کام نہ آئے، اس کے بعد رسوائی، ذلت، شرمندگی

لیکن اس ''ساحر'' نے نہ جانے کیا سحر پھونکا تھا۔ سب اس کی زبان بول رہے تھے کیوں، آخر کیوں، کیا سب بھی ایسے ہی حالات کا شکار تھے۔ ''منتر احاجی بگو، کم تو میرا حاجی بگو'' جس نے جو چاہا کیا۔ دوسرے کا کام سراہنا تھا۔ یہ کون سی زبان بول رہے تھے۔

ایک نقاد نے ڈائس پر آکر کہا۔

''حیرت ہوتی ہے اس بات پر سنا ہے کنول کیچڑ پر کھلتے ہیں۔ گلاب کانٹوں ہی میں بہار دکھاتا ہے۔ یہ کیچڑ میں کنول کہاں سے کھل اٹھا۔ سنگ مرمر کے منقش ایوانوں میں اس حساس دل کی نمود کیسے ہوئی۔ چھوٹی سی عمر اور کائنات پر اتنی گہری نگاہ۔ دل کا یہ گداز قدرت کی دین ہے اور قدرت کہیں کسی کو کچھ بھی دے دے۔''

ایک بڑے نقاد نے کہا۔

''بابر علی صاحب ایک بہت بڑے صنعت کار اور تاجر ہیں۔ عموماً ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے والے فنون لطیفہ کی الجھنوں کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا ان کاروباری امور میں الجھا رہتا ہے، لیکن سنا ہے پورا گھرانا ہی وجدانی کیفیتوں کا شکار ہے۔ کسی نے خود کو ساری زندگی کی کاوشوں کے بعد غریبوں اور ناداروں کے لیے وقف کردیا۔ کسی نے ''تاج محل'' بنانے کے بجائے ''اپنا گھر'' بنا دیا۔ تاج محل دولت کے بل پر محبت کے اظہار کا ایک جذبہ تھا بلاشبہ دنیا آج بھی اس محبت کو یاد کرلیتی ہے جو صرف ایک محبوب کے لیے وقف تھی، لیکن اس دور کے شاہ نے ہر انسان کی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے ''اپنا گھر'' کی بنیاد رکھی۔ یہ انسان کی عظمت کا سب سے بڑا تاج محل ہے۔ ایسے انسان دوست خاندان کو اس دور کا سب سے بڑا عجوبہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی بلندی کا اعتراف دلوں میں ہے۔ بابر علی صاحب کے لیے تعریف کے جو بھی الفاظ کہے جائیں وہ کافی نہیں ہوں گے اور یہ عظیم مصورہ بھی اسی خاندان کا فرد ہے۔ اس کے رنگوں کی سچائی، اس کی لکیریں، اس خاندان کی عظمت کی ایک اور بنیاد کھڑا کرتی ہیں۔

پریس رپورٹرز ان ساری باتوں کو نوٹ کررہے تھے۔ شارٹ ہینڈ بکس پر ان کی پینسلیں تیز رفتاری سے چل رہی تھیں اور دور ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے علی ان تمام باتوں کو سن کر عجیب سی کیفیت کا شکار تھے، سوچ رہے تھے کہ یہ سب کچھ کیا ہوا ہے۔ اتنی شہرت تو انہوں نے ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی حاصل نہ کی تھی۔ کیا واقعی ان تصویروں میں ایسی نرالی بات ہے اور یہ ''اپنا گھر'' خرچ تو بہت ہوا ہے اس میں نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے، لیکن اسے نئے دور کا تاج محل کہا جارہا ہے۔

اور۔۔۔ اور یہ سب کچھ شیری ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ایک ایک کام شیری کے ذریعے ہوا ہے اور شیری۔۔۔ اس کا نام تو کہیں نہیں ہے۔ لیکن پھر علی نے فوراً ہی اپنے اندر پیدا ہونے والی اس لچک کو ختم کردیا۔

''اپنا گھر'' سے شہرت کے علاوہ کیا ملے گا۔ جو گورکھ دھندا اس منحوس شخص نے پھیلایا ہے، اس سے کون سی آمدنی ہوگی سوائے خرچ کے اور جب یہ دولت ختم ہوجائے گی تو ''اپنا گھر'' میں الو بولیں گے۔ مصیبت بن جائے گا یہ سب کے لیے۔ کہاں سے پورے ہوں گے اس کے اخراجات۔ تقریریں جاری رہیں، لوگ اظہار خیال کرتے رہے اور بابر علی صاحب کا ذہن پھنکتا رہا۔ آخر میں وزیر اطلاعات و نشریات نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کیا۔

''فن انسانیت کا ورثہ ہے اور فن کار ملک وملت کا سرمایہ۔ اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو۔ دولت مند ہو یا غریب، اگر وہ فن کار ہے تو مصائب و آلام کی زمین کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور سچ بول دیتا ہے۔ اگر وہ سچ کو چھپانے کی کوشش کرے تو اسے فن کار تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس عظیم خاندان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جس کا ایک ایک فرد ہیرے کی مانند دمکتا ہوا ہے۔ یہ سچے لوگوں کا خاندان ہے۔ جس طرح دولت اس خاندان میں آئی ہے، یہ اسے صحیح انداز میں خرچ بھی کررہا ہے۔ بزرگ حیدر علی جیسی عظیم شخصیت کے زیر سایہ پروان چڑھنے والا یہ خاندان جو کارنامے انجام دے رہا ہے ان پر حیرت نہیں ہوتی۔ فن اور آرٹ کے بارے میں معاف کیجیے گا میری معلومات بہت محدود ہیں۔ کسی دور میں جب تصاویر اپنی شکل وصورت ہم جیسی رکھتی ہیں تو پھر بھی انہیں دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اچھی لگ رہی ہے اور یہ بری، لیکن شعر و شاعری میں بھی جدت ہوئی۔ غزلیں نظمیں آزاد ہوگئیں۔ شاعروں نے ردیف و قافیوں کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے۔ مصوروں نے نقوش پر تیزاب ڈال لیا۔ چار ستون بنائے اور ان میں کیلیں جڑ کر ''فردوس'' تخلیق کردی۔ جس میں گھسنے کا کوئی راستہ ہمیں تو نظر نہ آئے گا، لیکن ہوگا کوئی نہ کوئی راستہ۔ ہماری نظر کی کمزوری ہے۔ مصور سے پوچھے بغیر کیسے اندر جاسکتے ہیں۔ شعر سنیں،

ایک مصرع پورا۔ دوسرے میں سے پون غائب، جو دل چاہو جوڑو، آزادی ہے۔ اس بچی نے جو کچھ کیا ہے اللہ اسے بھی معاف کرے اور ہم نہ سمجھے اللہ ہمیں بھی معاف کرے، لیکن جو سمجھنے والے ہیں انہوں نے خوب سمجھا۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ وہ مانتے ہیں اور ہم انہیں مانتے ہیں۔ چنانچہ جوان کی نیت سو ہماری۔ مبارک باد دینے آئے ہیں دلی مبارک باد اس بچی کو، اس کے والدین کو، اس کے استاد کو اور ان سارے لوگوں کو جو سمجھ دار ہیں۔''

وزیر اطلاعات کی اس حقیقت بیانی نے قہقہوں کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ شیری بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس تقریر کے بعد آج کی اس تقریب کا اختتام ہو گیا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے وہ دھوم مچائی کہ اس سے پہلے کبھی نہ مچی تھی۔ ناقدین کو احترام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ تحفے تحائف سے نوازا گیا اور وہ خود کو ہر خدمت کے لیے حاضر کہہ کر رخصت ہوئے کہ خوش تھے بلکہ خوش کر کے بھیجے گئے تھے۔ اخبار والوں کے لیے تو روزانہ دعوت کا انتظام تھا۔ کیوں کہ انہیں سات دن تک بڑا کام کرنا تھا۔ دوسرا دن شہر کے دوسرے تمام معززین کے لیے تھا اور تیسرے دن ہر کسی کو نمائش گاہ میں آنے کی آزادی تھی۔ پبلسٹی خوب کی تھی۔ اس لیے آرٹس امپوریم میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ نفیسہ اور عاقل کو آٹو گراف دینے سے فرصت نہ ملتی۔

چوتھے دن ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک حسین و جمیل صاحب زادی نے عاقل سے ملاقات کی۔

''میرا نام آمنہ جاوید ہے۔''

''جی خادم کو عاقل کہتے ہیں۔''

''آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''حکم۔۔۔؟''

''ایک التجا ہے، فرصت ملے تو سن لیجیے گا۔''

''ابھی فرمائیے۔''

''یہ کارڈ ہے میرا۔ میں کسی بھی شام آپ خوش آمدید کہنا چاہتی ہوں۔''

''ان دنوں کی مصروفیات تو آپ دیکھ رہ ہیں۔''

''اس کے بعد سہی۔''

''حاضر ہوں گا بھی۔''

''کبھی نہیں، کوئی وعدہ؟''

''فون نمبر ہے آپ کا۔''

''جی ہاں، کارڈ پر درج ہے۔''

''میں آپ کو فون کر لوں گا۔''

''کب۔۔۔؟''

''نمائش کے بعد۔''

''آہ۔۔۔! انتظار طویل ہے۔ میں آپ سے نمائش گاہ میں ملتی رہوں گی۔'' محترمہ نے فرمایا اور عاقل نے گردن ہلا دی۔

عاقل اسے ٹالنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن وہ رات گئے تک اس سے چپکی پھرتی رہی تھی۔ حالانکہ بعض مواقع پر عاقل نے اس کے ساتھ بے اعتنائی کا سلوک بھی کیا تھا۔

فطرتاً وہ کسی کا دل توڑنے کا قائل نہیں تھا لیکن یہ لڑکی اسے پریشان کر رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتی تھی۔ بہر طور رات کو وہ واپس چلی گئی۔

شیری اور دوسرے تمام ہی لوگ کافی بری طرح مصروف رہتے تھے ان دنوں، اس لیے ایک دوسرے سے ملاقات بھی بہت کم ہوتی تھی۔ بالآخر آخری دن آ گیا۔ اس دن تصاویر کا نیلام ہونا تھا۔ جس کی اطلاع اخبار میں چھپ چکی تھی۔ آج بھی اچھا خاصا ہجوم تھا، لیکن بڑے بڑے امراء اور روسا کو خاص طور سے آج کے دن کے لیے دعوت نامے جاری کیے گئے تھے۔ یہی لوگ ان تصاویر کی صحیح قیمت لگا سکتے تھے۔ تصاویر کی نیلامی کے لیے شیری نے خود ہی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا ایک ایک تصویر کے سامنے سینکڑوں افراد کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں بے شمار سیٹھ تھے۔

بابر علی صاحب بھی یہاں موجود تھے۔ کیونکہ ان کے ہم عمروں کی تعداد آج نمائش گاہ میں سب سے زیادہ تھی۔ ان کا ہجوم بابر علی صاحب کے گرد تھا۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر شیری اس جگہ پہنچ گیا جہاں پہلی تصویر کی نیلامی ہونے والی تھی۔ اس نے بڑے شائستہ انداز میں اس تصویر کا تعارف کرایا تھا۔

"یہ ہجر ہے، نقادانِ فن نے اس تصویر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ رنگوں اور برش کا یہ کمال غیر انسانی ہاتھوں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے اور یہ تصویر جس گھر میں لگے گی ہمیشہ ایک عجوبہ بنی رہے گی۔ ان فن پاروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن ان کے لیے طے کیا گیا ہے کہ ان کو فروخت کر کے ان غریبوں و نادار انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا بہتر بندوبست کیا جائے گا۔ جو اپنے طور پر رزق کمانے کے لائق نہیں ہیں۔ ہم سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں فقیروں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر نہ جانے کیا کچھ رکھ دیتے ہیں، لیکن وہ جو ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی اپنی پناہ گاہوں میں سسکیوں اور آہوں کے درمیان غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس بات کے مستحق ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ ان کی اعانت کریں۔ یہ تصویریں جو دن رات کی ان تھک محنت کے بعد تیار کی گئی ہیں۔ ان کے نام ہیں اور ان کو خریدنے والے نہ صرف زخمی انسانیت کے مددگار ثابت ہوں گے بلکہ فن کی دنیا سے اپنے لگاؤں کا اظہار بھی کریں گے تو ہجر کی قیمت لگائی جائے۔"

"پانچ ہزار روپے۔" ایک سیٹھ نے کہا تو شیری نے تمسخرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"فن کی توہین نہ کریں حضرت! ابتدا وہاں سے کریں جہاں سے ان کی ابتدا ہو سکتی ہے۔"

"چالیس ہزار۔۔۔" دوسری طرف سے آواز ابھری۔

"غنیمت ہے، کم از کم آپ نے تھوڑی سی جرات کا ثبوت تو دیا۔"

"بیالیس ہزار۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ دو، دو، تین، تین ہزار سے بات آگے نہ بڑھائیے دس کے فیگر سے کم بات نہ ہو۔"

"ساٹھ ہزار۔۔۔"

"بہت خوب! بلاشبہ ہمارے ملک میں فن کے قدردان موجود ہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ ملک جذبات سے عاری ہے۔ تجوریوں میں بھرے ہوئے نوٹ کاروباری مقاصد کے لیے تو سامنے آتے ہی ہیں۔ آج انسانیت انہیں آواز دے رہی ہے، جی تو ساٹھ ہزار۔۔۔؟"

"ستر ہزار۔۔۔"

"اسی ہزار۔۔۔"

"ایک لاکھ۔۔۔"

"دو لاکھ۔۔۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب، آگے بڑھیے، آگے بڑھیے۔"

"ڈھائی لاکھ۔۔۔"

"تین لاکھ۔۔۔"

"ساڑھے تین لاکھ۔۔۔"

کاغذ کے ایک رنگین ٹکڑے کے لیے ساڑھے تین لاکھ روپے کی رقم کافی تھی اور "ہجر" ساڑھے تین لاکھ روپے میں بک گئی۔

"تنہائی" جب پانچ لاکھ تک پہنچی تو وہ بھی ایک سیٹھ کی ملکیت بن گئی۔

بابر علی صاحب کے ایک قریبی دوست نے صرف بابر علی صاحب کو خوش کرنے کے لیے چار لاکھ میں ایک تصویر خرید لی تھی۔

آمنہ جاوید نے عاقل کے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے "آبرو" بہت پسند ہے کتنی قیمت لگاؤں اس کی۔" عاقل چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ تو آپ کی پسند پر منحصر ہے۔"

"نہیں اس کی قیمت کا تعین آپ کر دیں۔"

"میں اپنی کسی تصویر کا تعین نہیں کر سکتا۔ آپ

آزاد ہیں۔''

بہرطور ''آبرو'' آمنہ جاوید نے خرید لی۔ اپنی دانست میں اس نے عاقل کو خرید لیا تھا۔

''فریب'' بھی بک گئی اور ''بھنور'' بھی۔ اس کے بعد دوسری تصویروں کا نمبر آیا اور عاقل کو چکر آنے لگے جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ دولت مند یہ بھونڈی، بھونڈی شکلوں والے موٹے، بڑی بڑی توندیں باہر نکالے ہوئے صرف اپنی امارت کا رعب جھاڑنے کے لیے، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ان رنگین کاغذوں کو خرید رہے تھے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ ہنگامہ کیا جا رہا تھا۔ بابر علی کو خوش کرنے کا جذبہ بھی دلوں میں کارفرما تھا۔ کیونکہ ان سے بہت سارے کاروبار مقاصد اٹکے ہوئے تھے۔

اور پھر سب یہ بھی جانتے تھے کہ ان تصاویر کی خرید کی پبلسٹی بھی ہوگی اور یہ پبلسٹی ان کے لیے بڑی کشش کا باعث تھی۔

نصیر الدین نے ایک تصویر چار لاکھ روپے کی خرید لی تھی۔

بہرطور تصاویر کا نیلام اتنا عظیم الشان رہا جس کی ان لوگوں کو خود توقع نہیں تھی، لیکن شاید ان میں شیری شامل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا اس نے جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کا نتیجہ یہی ہوگا ان دولت والوں کی دنیا کو وہ بہت قریب سے دیکھ چکا تھا۔ وہ ان کا بہت بڑا انباض تھا۔ بالآخر آخری تصویر بھی فروخت ہوگئی اور خریدنے والے فخریہ انداز میں ان کے فریم ہاتھوں میں لیے انہیں نمایاں کیے اپنی اپنی کاروں میں جا بیٹھے۔ یہاں تک کہ نمائش کا آخری مہمان بھی نکل گیا اور اب صرف آرٹس امپوریم کے منتظمین یا بابر علی صاحب کے گھرانے کے لوگ موجود تھے۔ خود بابر علی صاحب بھی یہاں سے جا چکے تھے۔

سات دن کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد یہ پہلی رات تھی جب وہ لوگ سکون کی نیند سوئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے۔ اس رات کسی نے کسی سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر بڑی گہما گہمی تھی۔ بابر علی صاحب معمول سنجیدہ تھے۔ باقی سارے کے سارے چہک رہے تھے۔ نفیسہ نے براہ راست ان سے سوال کر ڈالا۔

''ڈیڈی! آپ نے اس نمائش کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔''

''میری رائے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔'' بابر علی جلے بھنے لہجے میں بولے۔

''کیوں نہیں۔ آپ ہی تو سب کچھ ہیں آپ کی رائے تو بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔''

''لیکن بدقسمتی ہے میری کہ اس کوٹھی میں میرے الفاظ اب کسی کو پسند نہیں آتے۔''

''کیوں نہیں ڈیڈی! آپ کہیے تو سہی۔''

''ان سارے ہنگاموں میں جو روپیہ خرچ کیا گیا ہے، ان کا کوئی حساب کتاب رکھا ہے۔'' بابر علی صاحب نے پوچھا۔

''کیوں بھئی، حساب کتاب کے علاوہ تمہیں اور بھی کچھ آتا ہے۔'' حیدر علی صاحب نے پوچھا۔

''ابو! اسی لیے تو میں کسی معاملے میں بولتا نہیں ہوں۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، جو مستقبل میری نگاہوں کے سامنے ہے وہ بہت بھیانک ہے۔ یہ تمام بچے جن راستوں پر جا رہے ہیں وہ شہرت تو دلوا دیتے ہیں، لیکن شہرت بعض اوقات گندی جھونپڑیوں میں دم توڑ دیتی ہے۔ شہرت نہ کھانے کی چیز ہے نہ پینے کی، اصل چیز دولت ہے۔ لاکھوں روپیہ حاصل ہوا ہے ان تصاویر سے کیا آپ اس میں سے وہ خرچ نکالیں گے جو ان تمام ہنگاموں پر صرف کر چکے ہیں۔ اگر نکالیں گے تو آپ کی وہ شان نہ رہے گی جو لوگوں کی نگاہوں میں ہے۔ جتنی رقم اس سلسلے میں آئی ہے اصولی طور پر تو وہ ساری کی ساری آپ کو اسی مد میں خرچ کرنا ہوگی جس کا آپ نے علان کیا ہے۔ اگر اس میں سے آپ کچھ کٹوتی کریں گے تو لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ آپ کا اپنا مفاد

بھی اس میں وابستہ تھا۔
''تو کٹوتی کر کون رہا ہے، جس مقصد کے تحت سب کچھ کیا گیا اسی کی تکمیل کی جائے گی۔''
''ہوں۔۔۔ اور اس سے حاصل، نفیسہ نے جو طویل مغز ماری کی اس کا کیا بدل ہے جو کچھ آپ لوگوں نے اس سلسلے میں خرچ کیا، جھوٹی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ اس کی کوئی اور اہمیت ہے؟''
''تو تمہارا کیا خیال تھا۔ ہم تصویریں بیچ کر اپنا گزارا کرتے؟''
''میں یہ نہیں کہتا ابو! لیکن کم از کم اپنا بھی تو کچھ فائدہ ہونا چاہیے تھا۔ نفیسہ نے اپنا فن دنیا کے سامنے پیش کیا وہ کیا تھا۔ کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں کوئی حجت نہیں کروں گا بلکہ مجھے وزیر اطلاعات ونشریات کی تقریر سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ بہر صورت آپ کو یہ بات چونکہ ناگوار گزرے گی اس لیے میں اسے آگے نہیں بڑھاتا۔ میری تو یہ خواہش تھی ابو کہ جس طرح آپ نے بارہ بنکی سے نکل کر اپنی یہ حیثیت بنائی اور وہ حیثیت مجھ تک منتقل کر دی۔ میں نے جو کچھ بنایا ہے وہ بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں نے آپ کی اس دولت کو ہزار گنا بڑھایا ہے، لیکن کیا میرے یہ بچے ان ہی راستوں پر چل رہے ہیں جن پر آپ نے مجھے چلایا ہے۔ آپ نے اپنی اولاد کو تو التفات بخشا، لیکن مجھے میری اولاد کے ساتھ انصاف برتنے سے روک دیا گیا ہے، میں ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ جھوٹی شہرت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اسے برقرار رکھنے کے لیے بھی دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان بچوں کے ذہن کو تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ نفیسہ بیٹی ہے میری۔ میں اس کی اس تعریف وتوصیف سے ناخوش نہیں ہوں۔ بلاشبہ ہمیں وہ شہرت ملی ہے جس کا تصور بڑے بڑے نہیں کر سکتے، میری آنکھیں دور تک دیکھ رہی ہیں۔ اگر یہ اسی طرح شہرت کے جالے میں پھنسے رہے تو آہستہ آہستہ یہ دولت ختم ہو جائے گی۔ میرا کیا ہے ابھی چل رہا ہوں، چلتا رہوں گا۔ تھوڑے عرصے جو کچھ انہیں دے سکتا ہوں، ضرور دوں گا، لیکن میں تو یہ جانتا تھا کہ آپ کا ایک بیٹا ہو کر میں نے آپ کی دولت کو اتنا بڑھا دیا، میرے تین بیٹے اس دولت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرتے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں یہ صرف گنوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب یوں کیجیے کہ صفدر کا ایک شو بھی کر ڈالیے۔ آخر اسے کیوں شہرت سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ وہ بھی تو بندروں کی طرح اچھل کود کر لیتا ہے، ناچ گا لیتا ہے، بھلا ہمارے خاندان میں ایک ناچنے والے کا اضافہ کیوں نہ ہو، لوگ یہ کیوں نہ جانیں کہ بابر علی صاحب کا ایک بیٹا حلق پھاڑ پھاڑ کر پھدک پھدک کر دھاڑتا بھی ہے۔ یوں کیجیے کہ اس کے رقص وموسیقی کی نمائش کا بھی بندوبست کر ڈالیے اور پھر اس کم بخت کو بھی بیچ ڈالیے اسٹیج پر کھڑا کر کے۔'' بابر علی صاحب نے کہا۔ سب لوگ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ صرف شیری تھا جس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بابر علی صاحب کے دل کی جلن کو صرف وہی محسوس کر رہا تھا۔ پھر بابر علی صاحب بولے۔
''بہر حال آپ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، کرتے رہیے۔ میں اپنے طور پر اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔ مجھ سے کسی سلسلے میں میری رائے نہ پوچھی جائے۔''
ایک ناگوار سی خاموشی فضا پر مسلط ہو گئی تھی۔ حیدر علی صاحب نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ کہا، لیکن کسی نے بابر علی صاحب کی باتوں کو لفٹ نہیں دی تھی اور جب سب ناشتے کی میز سے اٹھے تو آپس میں چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔
''ڈیڈی پر تو ہر وقت کاروبار ہی سوار رہتا ہے، جب ہم عملی زندگی میں آئیں گے تو یہ سب کچھ بھی کر لیں گے۔'' بدر نے کہا۔
''نہیں، نہیں، آپ کلینک کھولتے اور دونوں ہاتھوں سے لوگوں کی جیبیں خالی کرتے، کسی کو اپنے گھر میں نہ گھسنے دیتے تو پھر ڈیڈی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔'' نفیسہ نے جلے بھنے انداز میں بدر سے

کہا۔

''اور ڈیڈی نے میری تو بڑی ہی توہین کردی ہے۔ آہ! کاش وہ فن موسیقی سے کچھ واقفیت رکھتے۔''

''انہیں تو فن مصوری سے بھی کچھ واقفیت نہیں ہے۔ پتا نہیں ڈیڈی نے یہ زندگی کون سے جنگل میں گزاری ہے۔''

''نہیں نہیں بھئی! اس قسم کی باتیں نہ کرو۔ بہرصورت وہ ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ ان کی سوچ بھی ٹھیک ہے، لیکن یہ بے پناہ دولت جو آرہی ہے اسے سنبھال لیا جائیگا، اتنے فکرمند کیوں ہیں وہ۔'' شیری نے ٹکڑا لگایا۔

''شیری بھائی! آپ بالکل محسوس نہ کیا کریں ڈیڈی کی باتوں کو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ یہ سب آپ کی جلن میں کہتے ہیں، لیکن وہ جلتے رہیں ہمیں اس بات کی پروا کب ہے۔'' انیسہ نے کہا۔

''نہیں بھئی، وہ میرے بھی بزرگ ہیں۔ بھلا میں ان کی باتوں کا برا کیوں مانوں گا اور ہم میں سے کسی کو بھی برا نہیں ماننا چاہیے۔ بے چارے کچھ بھی کہتے ہیں ہمارے بھلے کے لیے کہتے ہیں۔ بس ذرا سوچنے میں غلطی ہے اور کچھ نہیں ہے، شہرت انسان کو بہت کچھ دیتی ہیں۔ اب تم مجھے بتاؤ حکومت کا کون سا محکمہ ہے جو تمہارے کسی مسئلے میں رکاوٹ بنے گا۔ بلکہ میں تو ایک بات کہتا ہوں نفیسہ! تم یہ کام بھی کردو ضرورت مندوں کے لیے ہمارے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے کھلے رہنے چاہئیں۔ ''اپنا گھر'' تو ابھی تعمیر ہو ہی رہا ہے، لیکن اس کی ایک برانچ تم اس کوٹھی میں بھی تعمیر کرڈالو۔ تم ہر جگہ، ہر شخص کی سفارش کرسکتی ہو۔ تمہاری بات اب سنی جائے گی۔ چنانچہ جو کوئی کسی الجھن میں پھنسے تم اسے دعوت دو کہ وہ تمہارے پاس آئے اور پھر تمہارا ایک ٹیلیفون ہی اس کے لیے کافی ہوگا۔ تقدیریں بدل جاتی ہیں لوگوں کی سفارشوں کے ذریعے، یہ دور سفارشوں ہی کا تو ہے۔ کیا تم ضرورت مندوں کی مدد کرنے سے انکار کروگی۔''

''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ میں تو خوش ہوں کہ آپ نے مجھے ایک نئی روشنی دکھائی۔''

''میں تو تمہیں روشنیاں دکھانے کے لیے اس کوٹھی میں آیا ہوں۔ دیکھتی رہو ابھی کیا کیا ہوتا ہے۔'' شیری نے پراسرار لہجے میں کہا اور پھر وا سب کے سب منتشر ہوگئے۔ بابر علی صاحب کے الفاظ نے تھوڑا سا تکدر ذہنوں میں ضرور پیدا کردیا تھا، لیکن اس کی پروا کسے ہوتی اب تو وہ ایک بے حیثیت انسان بن کر رہ گئے تھے اس عمارت میں۔

عاقل، شیری سے ملنے کے لیے سب سے زیادہ بے چین تھا۔ چنانچہ جوں ہی اس نے شیری کو تنہا اپنے کمرے میں پایا، غڑاپ سے اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ شیری مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آؤ عاقل! خیریت۔ بڑے پراسرار انداز میں کمرے میں آئے ہو۔''

''شیری بھائی، شیری بھائی میرے لیے بندوبست کردیجیے۔''

''کیسا بندوبست۔۔۔؟''

''پاگل خانے میں داخل کرانے کا۔''

''اوہ تو گویا تم زندگی کو اور قریب سے دیکھنے کے خواہش مند ہو۔'' شیری نے کہا اور عاقل ہنس پڑا۔

''جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، یہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد کچھ دیکھنے کی گنجائش تو نہیں ہے۔ صرف اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔''

''کیوں بھئی ایسی کون سی مشکل پیش آگئی تھیں جس سے تمہیں اپنے دماغ کا علاج کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔''

''یہ آپ کہہ رہے ہیں شیری بھائی! آپ یہ سوال کررہے ہیں مجھ سے۔ بس میں کیا کہوں۔''

''کہو کہو، جو دل چاہے کہو تمہیں روکنے والا کون ہے۔''

''شیری بھائی! یہ سب کیا تھا۔ یہ سب کیا ہے
شیری بھائی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔'' عاقل نے
لہا۔

''جو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بیٹے! پوچھ سکتے ہو،
وں کو پوچھنا چاہیے۔'' شیری نے بزرگانہ انداز میں
لہا اور عاقل پھر گھٹے گھٹے انداز میں ہنس پڑا۔

''میں۔۔۔ میں مصور ہوں شیری بھائی!''

''بھئی، دنیا نے مانا ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''کیوں مانا ہے دنیا نے مجھے بس اس سوال کا
واب چاہیے۔ میں نے کبھی زندگی میں برش اور
رنگ ہاتھ میں بھی نہیں پکڑے تھے۔ ایک پریشان
حال آدمی تھا۔ نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا
کہ آپ ایک مسیحا کی حیثیت سے مل گئے آپ نے
روٹی، کپڑا اور مکان دلا دیا اور مجھے مصور بنا دیا۔ اب
بھلا بتایئے میں، مجھ جیسا آدمی اور مصور اور پھر میں
نے ایک استاد کی حیثیت سے اپنی شاگردہ کو مصوری
سکھائی۔ آپ یقین کریں لمحہ لمحہ اپنے دل میں قتل
ہوا ہوں۔ جو کچھ بکواس اس کے سامنے کر رہا ہوں
اس پر راتوں کو کر گڑگڑا کر خدا سے معافی مانگی ہے کہ
اللہ مجھے معاف رکھ اگر میری روزی ایک آدمی کی
عزت کا سوال نہ ہوتا تو میں یہ جھوٹ کبھی نہ بولتا۔
میں اس معصوم لڑکی کے لیے بڑا افسردہ رہا ہوں جو
خوامخواہ کینوس پر لکیریں کھینچ کھینچ کر اور ان لکیروں پر
رنگ پوت پوت کر خود کو مصورہ سمجھنے لگی۔ کبھی اس نے
تنہائی بنائی، کبھی ہجر اور کبھی آبرو، حالانکہ وہ نہیں جانتی
تھی کہ اگر یہ تصویریں منظر عام پر آئیں تو خود اس کی
آبرو لٹ جائے گی، لیکن ایک ساحر نے سحر پھونکا اور
ساری دنیا پاگل ہوگئی۔ یہ کیسے ممکن ہوا شیری بھائی!
یہ کیسے ممکن ہوا بس مجھے۔۔۔ بس اسی سوال کا جواب
چاہیے۔''

''آہستہ بول یار آہستہ۔۔۔ دیواروں کے بھی
کان ہوتے ہیں۔ کیوں میری بھی عزت کے پیچھے
پڑا ہوا ہے۔ ارے بھائی! نکال دے ذہن سے ان
ساری باتوں کو۔ یہ دنیا ایسے ہی چوں چوں کا مربہ
ہے۔ یہ اہلِ علم و دانش جو نقادانِ فن کہلاتے ہیں۔
سب ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ فن اور
ثقافت کبھی ایک حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ آج کل تو
تھو، بندو اور خیراتی فن کار بن گئے ہیں۔ تھو کے
پاس دولت ہے، وہ بندو کو سراہتا ہے اور بندو کے
پاس دولت ہے وہ خیراتی کو مدبر مانتا ہے۔ یہ سارے
کے سارے دھندے اسی طرح چل رہے ہیں۔
میرے عزیز یہ فن کار، یہ نقاد جو ہماری اس نمائش میں
بطور مہمان آئے تھے احمق نہیں ہیں۔ اگر یہ نمائش کسی
گندے سے محلے میں رہنے والے ایک باعمل فن کار
کی ہوتی، ایک ایسے فن کار کی جو واقعی تصویر کشی کر سکتا
ہو اور اس کے پاس یہ وسائل نہ ہوتے جو اسے یہ
شہرت بخش سکتے تو یقین کرو ان تصاویر کا مذاق اڑایا
جاتا۔ نمائش گاہ میں دس آدمیوں کے علاوہ گیارہواں
آدمی نہ ہوتا اور یہ دس آدمی بھی وہ ہوتے جو تھوڑا
بہت وقت گزارنے کے لیے کہیں اور جانے کے
بجائے آرٹس امپوزیم میں جاتے اور رنگوں کو دیکھ کر
ناک بھوں چڑھاتے اور مصور کو گالیاں دیتے چلے
جاتے۔ ''ہونہہ! تجریدی آرٹ بھی کوئی آرٹ ہے''
لیکن میرے دوست! نفیسہ بابر علی ایک بہت بڑے
باپ کی بیٹی ہے۔ اخبارات نے پبلسٹی کی تھی۔ بڑے
بڑے نقادوں نے دیکھا کہ ان کی زبردست پذیرائی
ہو رہی ہے اور ان کا مستقبل سنورنے کو ہے تو انہوں
نے بھی یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ نفیسہ نے جو
کچھ بنایا وہ جانے اور اس کا اللہ جانے۔ انہیں جو کچھ
کہنا تھا وہ وہی کہہ کر چلے گئے۔ اگر نہ کہتے تو اپنے
لیے خوامخواہ بے شمار دروازے بند کر لیتے۔ یہ وقت کی
کہانیاں ہیں عاقل! ان پر اتنی گہرائی سے نہ سوچو۔
ساری دنیا ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ بس ان
رنگوں کو جان لو تم دنیا کے کامیاب ترین انسان
کہلاؤ گے۔''

''میری عقل یہ سب کچھ تسلیم نہیں کرتی۔''

''آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کیسے جھٹلاؤ
گے۔''

''عام لوگوں کی تو میں بات نہیں کرتا۔ مجھے صرف ان نقادوں پر حیرت ہے۔ آخر انہوں نے انہیں کیسے تسلیم کرلیا۔''

''کرنا ہی تھا انہیں۔''

''ضمیر بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہے، لیکن ان دنوں کم یاب ہے۔ دولت کی چکا چوند نے ان انسانوں سے حواس چھین لیے ہیں۔ وہ نہ کچھ دیکھ پاتا ہے نہ سمجھ پاتا ہے۔ کون جانے ان لوگوں نے خود کو نقاد منوانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے۔''

''بہرحال شیری بھائی! یہ آپ ہی کا کارنامہ ہے کہ آپ نے ایک ناممکن کو ممکن بنادیا۔ مجھے تو امید نہیں تھی۔''

''تم اگر چاہو تو ساری دنیا میں ان تصویروں کی نمائش کرادو۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی ہوگی۔''

''ہاں، آپ کرا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔'' عاقل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہارا مستقبل محفوظ کردیا ہے عاقل! اپنے ضمیر کے بوجھ سے دب کر تم شیری کو ذلیل نہ کرادینا۔''

''نہیں شیری بھائی! کس دل سے ایسا کروں گا لیکن میں الجھن میں ضرور ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ نفیسہ بھی مجھ سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہوگئی ہے۔''

''اس کی بھی فکر مت کرو۔ اس سلسلے میں، میں آج کل بہت غور سے سوچ رہا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''میں نے ایک بات کہی تھی تم سے۔ اس بات کا اعتراف پہلے ہی کرچکا ہوں کہ اس رات میں نے تم دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔ مجھے دلی مسرت ہوگی اگر تم دونوں یکجا ہوجاؤ۔''

''یہ آپ کا خیال ہے شیری بھائی! کیا آپ اس ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں؟''

''اگر زندہ رہا تو۔۔۔''

''خدا آپ کو ہزاروں برس زندہ رکھے۔ لیکن میری والدہ بہت حساس ہیں۔ میری کوئی توہین برداشت نہ کرسکیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا عاقل! بھروسہ رکھو۔ بیگم صاحبہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی ہے۔ ممکن ہے چند ہی روز میں ان کا رویہ بدلا ہوا پاؤ۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟'' عاقل چونک پڑا۔

''ہاں وہ اس سلسلے میں مجھ سے متفق ہیں۔''

''بیگم صاحبہ۔۔۔؟''

''ہاں یار! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے، میں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کردی تھی۔''

''اوہ! شیری بھائی۔۔۔ شیری بھائی! آپ۔۔۔ فرشتہ ہیں آپ خدا کی قسم میرے لیے، شیری بھائی آپ کا خیال درست ہے۔ کل رات ہی بیگم صاحبہ نے مجھے سینے سے لگایا تھا۔''

''اوہو، اکیلے اکیلے میں۔۔۔ ہمیں پتا بھی نہیں۔'' شیری اچھل کر بولا پھر کہنے لگا۔

''مجھے اور کچھ کرنا ہے عاقل! تمہاری ایک حیثیت بنانی ہے مجھے۔'' عاقل نے اس سلسلے میں کوئی اور سوال نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

انیسہ کی نگاہیں ان دنوں کچھ تلاش کررہی تھیں۔ شیری کا پڑھایا ہوا سبق اس کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا لیکن اسے غریبوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پتا ہی نہیں غریب کیسے ہوتے ہیں۔

ایک شام وہ کسی سہیلی کے گھر سے واپس آرہی تھی۔ اپنی کار خود ہی ڈرائیو کررہی تھی۔ ایک ٹریفک سگنل پر کار رکی تو ایک نوجوان اس کے پاس پہنچ گیا۔

''محترمہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' انیسہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولی۔

''کیا بات ہے؟''

''میں فقیر نہیں ہوں بس حالات کا شکار ہوں۔ باہر سے آیا تھا نوکری کی تلاش میں، جو کچھ

علاقہ چوروں کی نذر ہوگیا۔ انتہائی پریشان کن زندگی گزار رہا ہوں۔ میں بے حد غریب آدمی ہوں۔''

سگنل کھلنے والا تھا۔ انیسہ اس کی تمہید کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ کسی قدر بے چین ہو رہی تھی۔ کلچ دبا رکھا تھا کہ سگنل کھلتے ہی گاڑی آگے بڑھا دے لیکن نوجوان کے آخری جملے نے اسے چونکا دیا۔

''تم غریب ہو۔'' اس نے معذرت سے پوچھا۔

''بے حد۔۔۔''

''اچھا اچھا پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ابھی سگنل کھلنے والا ہے، میں آگے چل کر تم سے بات کروں گی۔''

نوجوان ایک لمحے کے لیے تو جھجکا۔ پھر جلدی سے پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ انیسہ نے کار آگے بڑھا دی تھی۔ تھوڑی دور جا کر اس نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔ انجن بند کر کے اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اب اپنی کہانی سناؤ۔''

''میری کہانی تو بہت لمبی ہے۔ مختصراً آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''ہوں، مجھے بہت دکھ ہوا آپ کی کہانی سن کر۔ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''جو کچھ بھی کر سکیں ایک غریب انسان کے لیے۔ اگر آپ کے سینے میں انسانیت کا جذبہ ہے تو میری مشکل حل کر دیں۔''

''محبت کرو گے؟'' انیسہ نے پوچھا۔

''ایں۔۔۔'' نوجوان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''دیکھو میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ ایک بہت دولت مند انسان کی بیٹی ہوں۔ کسی مسئلے میں غلط بھی نہیں ہوں۔ اگر غلط ہوتی تو اس کافر کے بچے کے خط پر مجھے یوں غصہ نہ آتا۔ میں بالکل شریف لڑکی ہوں۔ لیکن ان دنوں مجھے ایک غریب کی تلاش

مسکراہٹیں

خاتونِ خانہ سب گھر والوں کے لیے میز پر کھانا لگا رہی تھی کہ ان کا دس سالہ بچہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے گھر میں داخل ہوا۔

''کہاں تھے بیٹا، اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے؟'' ماں نے پیار سے پوچھا۔

''ممی! میں پوسٹ مین بنا ہوا تھا۔'' بچے نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''لیکن بیٹا! تم پوسٹ مین کیسے بن گئے، تمہارے پاس تو ڈاک نہیں تھی۔'' ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ڈاک کا انتظام ہوا تب ہی تو مجھے پوسٹ مین بننے کا خیال آیا، میں آج صبح آپ کے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں آپ کے پرانے ٹرنک کی تلاشی لے رہا تھا اس میں کپڑوں کے نیچے مجھے گلابی رنگ کا ایک بنڈل ملا جس پر سبز ربن بندھا ہوا تھا، میں وہ سارے خط ایک ایک کر کے محلے کے سب گھروں میں گیٹ سے اندر ڈال آیا ہوں۔'' بچے نے فخر سے بتایا۔

☆☆☆

ایک دیہاتی جوان لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ بڑی منت سماجت کے بعد لڑکی سردار جی سے ملاقات پر راضی ہوئی۔ آدھی رات کو کھیتوں میں ملنے کا ٹائم سیٹ ہوا۔

وقت مقررہ پر وہ لالٹین ہاتھ میں پکڑے کھیتوں میں جانے لگا تو باپ نے روکا اور پوچھنے لگا۔ ''آدھی رات کو کدھر جا رہے ہو؟''

دیہاتی نے ''ایک چپ سو سکھ'' فارمولے پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ابا! آج میری ایک لڑکی کے ساتھ ملاقات ہے اس سے ملنے جا رہا ہوں۔''

بوڑھے باپ نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اوئے لڑکی سے ملنے جا رہے ہو اور لالٹین ساتھ لے کر جا رہے ہو۔ پورے گاؤں کو پتا چل جائے گا۔ میں جب جوانی میں تمہاری ماں سے چھپ کر ملتا تھا تو کبھی لالٹین پاس نہیں رکھی۔''

جوان دیہاتی نے قریب چارپائی پر سوئی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابا! لالٹین نہ لے جانے کا نقصان تو دیکھ، اندھیرے میں تو پھر ایسی ہی چیزیں ملتی ہیں۔''

ہے۔''

''کیا کریں گی اس کا؟''

''پہلے تو محبت کروں گی، باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''محبت کسی بھوکے کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی۔''

''تم بھوکے ہو؟''

''پچھلے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔''

''اوہ! آئی ایم سوری۔ تب آؤ پہلے کسی ریستوران میں چل کر تمہیں کچھ کھلاؤں۔ سچ ہے کھائے پیے بغیر کوئی محبت کیسے کر سکتا ہے۔'' انیسہ نے دوبارہ کار اسٹارٹ کر دی۔ نوجوان کی سٹی گم ہو رہی تھی۔ کہیں یہ لڑکی مصیبت میں نہ پھنسا دے لیکن انیسہ کے دل میں سوتے پھوٹ رہے تھے۔ علامہ اقبال کی نظم اس کے ذہن میں چکرا رہی تھی بالآخر اس نے ایک ریستوران کے سامنے کار روک دی۔

''آؤ۔'' وہ کار سے اترتے ہوئے بولی۔

''اس ہوٹل میں۔'' نوجوان گھگھیائے ہوئے بولا۔

''ہاں آؤ۔''

''میرا لباس اس قابل نہیں ہے۔''

''اب ایسا برا بھی نہیں ہے۔ آجاؤ۔'' انیسہ نے بے نیازی سے کہا۔ لباس واقعی اس شخص کا اچھا نہیں ہے لیکن مجھے لباس سے کیا لینا غریب تو ہے۔ میرا کام تو غریبوں سے محبت کرنا ہے۔

ریستوران میں بہت زیادہ رش نہیں تھا۔ اس لیے یہ جوڑا زیادہ لوگوں کے لیے باعثِ توجہ نہ بن سکا۔ کھانا تو اس وقت نہ مل سکا۔ البتہ دوسری بہت سی چیزیں انیسہ نے منگوالی تھیں۔ جنہیں وہ غریب بڑی تسلی اور اطمینان سے حلق میں اتارتا رہا۔ انیسہ اس کا دل رکھنے کے لیے خود بھی کچھ نہ کچھ کھاتی رہی تھی۔

تمام برتن صاف ہو گئے تو اس نے پوچھا۔

''کیا کچھ اور منگواؤں؟''

''نہیں بس شکریہ! آہ۔۔۔! وقت نے کیا دن دکھا دیا۔''

''کوئی بات نہیں، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''محمد عرفان۔۔۔''

''میرا نام انیسہ ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں؟''

''وہ محبت والی بات آپ نے کیا کہی تھی؟''

''ہاں! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''لیکن آپ نے۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ نے تو مجھے پہلی بار دیکھا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''کیا میں اس قابل ہوں؟''

''میں بنالوں گی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''آپ نے فلم ''محبت کی فتح'' دیکھی ہے؟''

''نہیں کیوں؟''

''میں نے دیکھی تھی۔ اس میں بالکل اسی طرح ایک دولت مند لڑکی کو ایک غریب شخص سے اچانک محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس محبت کے لیے ساری دنیا سے ٹکرا جاتی ہے اور پھر جیت محبت ہی کی ہوتی ہے۔''

''ہماری محبت کی بھی جیت ہوگی۔''

''آپ کے والد صاحب پولیس میں تو نہیں ہیں۔''

''نہیں کیوں؟''

''کوئی اور رشتے دار پولیس میں ہے؟''

''نہیں، لیکن یہ پولیس کہاں سے گھس آئی؟''

''کیا کرتے ہیں آپ کے والد؟''

''بزنس مین ہیں، کروڑوں کا کاروبار کرتے ہیں۔''

''کروڑوں کا۔۔۔'' نوجوان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

(جاری ہے)

روح کا قرب

ایک پراسرار کہانی جو ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے اُس تصویر کی تکمیل میں صرف رنگ ہی نہیں خون بھی شامل رہا۔

زبیر احمد

پُراسرار کہانیوں کے شوقین قارئین کے لیے انمول تحفہ

قاہرہ میوزیم کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ قدیم مصری شاہکار اور نوادرات سیاحوں کے لیے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سیاح اپنی آنکھوں میں حیرت اور تجسس سمیٹے گائیڈز کی رہنمائی میں میوزیم کے مختلف حصوں میں گھوم رہے تھے۔ گائیڈز روانی سے ہر چیز کی تفصیل بیان کررہے تھے۔ ایک گائیڈ ایک شوکیس کے پاس جا کر رک گیا۔ اس میں ایک لڑکی کی تصویر تھی جس کا آدھا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ چہرہ اس حد تک جل گیا تھا کہ رخساروں کی چربی تک بہہ گئی تھی لیکن تصویر کا آدھا چہرہ بہت حسین اور دلنواز تھا۔ گائیڈ نے تصویر کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

''خواتین وحضرات۔ یہ اس دوشیزہ کی تصویر ہے جسے فرعون بہت پسند کرتا تھا۔ یہ اس کی خاص کنیز تھی۔ اس کنیز نے فرعون کے ساتھ بے وفائی کی۔ فرعون نے خود ایک مشعل سے اس کا آدھا چہرہ جلا دیا۔ کنیز مر گئی۔ فرعون نے اس کی تصویر بنا کر محل میں رکھ دی

تا کہ دوسرے عبرت حاصل کریں۔ اس کنیز کا نام ہر مینہ تھا۔ وہ فرعون کے دور کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔

سیاحوں کے ہجوم میں شامل ایک نوعمر لڑکی اچانک لڑکھڑا گئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ ایک پراسرار چمک۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے اسے سہارا دیا پھر مشفقانہ لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے بیٹی غزالہ!''

''آں۔۔۔'' غزالہ نے ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھا جو اس کا باپ تھا لیکن اس وقت لڑکی کی آنکھوں میں اس کے لیے قطعی شناسائی نہیں تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی یہ کیفیت ختم ہوگئی۔ ''کچھ نہیں پاپا! ذرا سر چکرا گیا تھا۔''

''چلو تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دیتا ہوں۔ اس طرح سر راہ چکر آنا اچھی علامت نہیں ہے۔''

''نہیں پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' غزالہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اب گھر چلیں میں تھکان سی محسوس کر رہی ہوں۔'' وہ شخص غزالہ کو سہارا دیتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

اس کا نام عبداللہ تھا۔ قاہرہ میں اس کی خودکار کھلونے بنانے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ قومیت کے اعتبار سے وہ بمبئی کا رہنے والا تھا۔ قاہرہ میں وہ کاروباری سلسلے میں آیا تھا لیکن ایک مصری لڑکی فائزہ سے شادی کرنے کے بعد وہ ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ غزالہ کی پیدائش کے آٹھویں سال فائزہ کا انتقال ہوگیا۔ تاہم عبداللہ نے دوسری شادی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے غزالہ کی پرورش پر بھرپور توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ اسے فائزہ کی اس پہلی اور آخری نشانی سے بہت پیار تھا۔ غزالہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اسے مطالعے کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی تھی۔ وہ ایک بار اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان بھی گئی تھی لیکن اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور اب وہ کئی ماہ سے ہندوستان جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ اگر مناسب ہوا تو غزالہ کا رشتہ بھی طے کر آئے گا۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹی کے بے حد اصرار پر وہ ہندوستان چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ پہلے دہلی جانا چاہتا تھا کیوں کہ وہاں اس کے کئی پرانے ساتھی موجود تھے۔

☆☆☆

کار ابھی گیٹ سے نکلی ہی تھی کہ اچانک فضا میں خطرے کے سائرن کی آواز گونجی۔ یہ آواز میوزیم کے اندر سے آ رہی تھی۔ عبداللہ نے اپنی کار روک لی۔ اس نے دیکھا کہ سیکورٹی کا عملہ میوزیم کے گیٹ بند کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ پر لگے ہوئے اسپیکر سے انتظامیہ کے افسر کی آواز گونجی۔

''خواتین و حضرات! میوزیم کے ایک شوکیس سے ایک نایاب و نادر تصویر چوری ہوگئی ہے۔ براہ مہربانی باہر جانے کے لیے گیٹ نمبر ون استعمال کریں۔ باقی گیٹ بند کر دیے گئے ہیں۔'' یہ اعلان بار بار ہونے لگا۔

عبداللہ نے اندازہ لگا لیا کہ سیکورٹی کے عملے نے گیٹ نمبر ون پر کوئی ایسا انتظام کر لیا ہے جس کی مدد سے چور با آسانی گرفت میں آ جائے گا۔ اس نے غزالہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''بیٹی اتنے آدمیوں کی موجودگی میں کوئی چیز چرانا کیسے ممکن ہے۔ حیرت انگیز بات ہے۔''

غزالہ میوزیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر عبداللہ کی طرف دیکھا پھر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''بعض چور پراسرار ہوتے ہیں۔ ہر کام کر لیتے ہیں۔''

''پراسراریت سے تمہاری کیا مراد ہے۔'' عبداللہ غزالہ کو گھورتا ہوا بولا۔

''میری مراد ہندوستان کے کالے علم سے ہے۔ اس علم کے ماہر ہر کام با آسانی کر گزرتے ہیں۔''

''ہر وقت ہندوستان تمہارے ذہن پر سوار رہتا ہے۔'' عبداللہ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور کار آگے

بڑھا دی لیکن اس نے غزالہ کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی اگر وہ یہ مسکراہٹ دیکھ لیتا تو اسے غزالہ کی شخصیت میں ایک نیا روپ نظر آجاتا۔ بنگلے پر پہنچ کر اس نے ڈاکٹر جوزف کو فون کر دیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ غزالہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر جوزف آیا۔ اس نے غزالہ کا چیک اپ کیا۔ اس کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی پھر وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''مسٹر عبداللہ! آپ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتے ہیں۔ بے بی غزالہ پوری طرح صحت مند ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایک صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان ہے۔ میں نے اسے دوا دے دی ہے۔''

ڈاکٹر جوزف چلا گیا۔ عبداللہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ فون پر فیکٹری کا منیجر تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ فون کا ریسیور رکھ کر پلٹا تو اس نے غزالہ کو اپنے روبرو کھڑے پایا۔

''غزالہ۔۔۔ تم!'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کمرے کی محدود فضا میں سانپ کی پھنکار گونجی۔ یہ آواز غزالہ کے لبوں سے نکلی تھی۔

عبداللہ حیران تھا کہ اچانک غزالہ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ ہمیشہ اجازت لینے کے بعد اس کے کمرے میں آتی تھی مگر آج۔۔۔ وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ کمرے کی فضا میں آواز پھر گونجی۔

غزالہ کے لبوں سے نکلنے والی آواز اتنی ہی بھیانک تھی کہ عبداللہ کا وجود لرز کر رہ گیا۔ اس نے ایک بار ہمت کر کے غزالہ کی طرف دیکھا۔ نظریں ملتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود بے وزن ہو گیا ہو۔ اس نے خود کو کسی گہری کھائی میں گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے غزالہ کی آنکھوں میں اتنی چمک دیکھی تھی جیسے سورج پتلیوں پر اتر آیا ہے۔ اسے اپنا ذہن اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا محسوس ہوا۔

''مسٹر عبداللہ!'' غزالہ کے لبوں سے نکلنے والی آواز غیر انسانی سی تھی۔ اس میں ایسی کھنک تھی جیسے ویران مندر میں اچانک گھنٹیاں بجا دی جائیں۔ آواز کمرے میں گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہاں۔۔۔'' عبداللہ خوابیدہ لہجے میں بولا۔

''یہ تم مجھے کس طرح مخاطب کر رہی ہو، تم ٹھیک تو ہو؟''

''تم نے ڈاکٹر کو کیوں بلایا تھا؟'' غزالہ سخت لہجے میں اس کے سوال کو نظر انداز کر کے بولی۔

''تمہاری طبیعت خراب تھی بیٹی!''

''میں نے کہا تھا میں ٹھیک ہوں پھر ڈاکٹر کو کیوں بلایا؟'' غزالہ کے لبوں سے نکلنے والی نامانوس آواز عبداللہ کی سماعت پر برف کی طرح جمتی جا رہی تھی۔ لفظ لفظ نقش ہوتا جا رہا تھا۔

''آج کے بعد تم میرے ذاتی معاملات میں قطعی مداخلت نہیں کرو گے سمجھے۔'' غزالہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''اچھا۔'' عبداللہ آہستہ سے بولا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی گویا سحر زدہ اور اس کے حکم کے تابع ہو۔

''ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں لیکن میری باتیں اپنے شعور میں محفوظ کر لو۔ تم یہ بھول جاؤ گے کہ غزالہ تمہارے کمرے میں آئی تھی۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

اچانک عبداللہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہے۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ ریسیور رکھ کر پلٹا تھا پھر کیا ہوا تھا، کیا غزالہ آئی تھی۔ لاشعور کے کسی تاریک گوشے سے ہلکی سی کرن پھوٹی پھر تاریکی چھا گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے چند لمحے اس کی زندگی سے گم ہو گئے ہیں لیکن وہ کہاں گئے، اسے

یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دور کچن میں میوزک کی آواز ابھری۔ چند لمحوں کے بعد ایک خادمہ اس کے کمرے میں آ گئی۔

''غزالہ کو بلاؤ۔'' عبداللہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور سگریٹ جلانے میں مصروف ہو گیا۔

چند لمحوں بعد غزالہ آ گئی۔ ''جی پاپا!'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

عبداللہ نے غزالہ پر گہری نگاہ ڈالی لیکن اسے غزالہ میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نظر نہیں آئی۔

''ابھی کچھ دیر قبل تم میرے کمرے میں آئی تھیں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں۔۔۔ میں تو اپنے کمرے میں رسالہ پڑھ رہی تھی۔''

عبداللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ غزالہ جھوٹ نہیں بولتی۔

''ٹھیک ہے بیٹی تم جاؤ۔'' وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے پاپا! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

''کچھ نہیں بیٹی! تم جاؤ کچھ دیر آرام کر لو۔ ہمیں شاپنگ بھی کرنی ہے، کل ہم ہندوستان کے لیے فلائی کر رہے ہیں۔''

غزالہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ مسہری پر لیٹ گئی پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس طرح اٹھی تھی جیسے اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا پھر واپس مسہری پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور پرس کے اندر سے فولڈ کیا ہوا ریشمی کپڑا نکالا۔

کپڑا بہت پرانا اور کسی حد تک دبیز تھا۔ غزالہ کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اس نے کپڑے کی تہ کھول دی۔ ریشمی کپڑے پر فرعون کی کنیز ہرمینہ کی تصویر تھی۔ تصویر کا آدھا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جو میوزیم کے شوکیس سے غائب ہو چکی تھی۔

تصویر غزالہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے لب بند تھے۔ چہرہ تمام تر جذبات سے عاری تھا۔ اچانک کمرے میں سسکیوں کی آواز ابھری۔ یہ آواز چاروں طرف گردش کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کمرے کا سارا ماحول سسک رہا ہو۔ صرف غزالہ مسہری پر خاموش بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد غزالہ کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے تصویر کو فولڈ کر کے پرس میں رکھ دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ پرس الماری میں رکھ دیا اور آہستہ سے لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کمرے میں سسکیوں کی آواز لحہ لحہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

جہاز کے پہیے زمین کو چھو کر اب رن وے پر دوڑ رہے تھے۔ اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا عملہ تیزی سے حرکت میں آ چکا تھا۔ مسافر جہاز سے اترنا شروع ہو گئے تھے۔ غزالہ جہاز سے اترنے کے بعد ایک جگہ ٹھہر گئی۔ اس نے اپنا منہ اوپر اٹھایا اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے آبائی وطن کی خوشبو اپنی سانسوں میں بسا لینا چاہتی ہے۔ طمانیت سے اس کے رخسار دمکنے لگے تھے۔ چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بچکانہ چمک در آئی تھی۔

عبداللہ نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''پاپا۔۔۔! کتنا حسین ایئرپورٹ ہے۔ ہندوستان نے واقعی بہت ترقی کر لی ہے۔'' غزالہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ کسٹم وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ عبداللہ نے ایئرپورٹ کے پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھا۔ اسے وہاں اشوکا ہوٹل کی کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔

دہلی میں عبداللہ کے کئی دوست موجود تھے لیکن

اس نے اپنی آمد کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی۔ وہ اچانک سامنے جا کر انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اشوکا ہوٹل کی پرشکوہ عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ اشوکا ہوٹل کا شمار ان چند ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ جہاں عام آدمی ایک دن ٹھہرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غزالہ اور عبداللہ اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے تھے۔ رات کا کھانا انہوں نے جہاز میں کھالیا تھا۔

دوسری صبح عبداللہ حسب دستور جلد بے دار ہو گیا۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹیرس میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ تاہم دور افق پر سنہری کرنیں ابھر رہی تھیں۔ اچانک کال بیل کی آواز ابھری۔ عبداللہ بری طرح چونک پڑا۔ ''اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' وہ بڑبڑایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف غزالہ کھڑی تھی۔

''غزالہ تم۔۔۔! تم اتنی جلدی کیسے بے دار ہو گئیں۔'' عبداللہ نے حیرت کا اظہار کیا اور ایک طرف ہٹ گیا

''جلدی۔'' غزالہ نے عبداللہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''اندر آ جاؤ۔'' عبداللہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''لیکن بیٹی یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔''

غزالہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔ سامنے نہر و پارک کا سبزہ زار تھا۔ ایک بڑے قطعہ اراضی پر یہ پارک بہت سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ''کتنا خوب صورت پارک ہے۔'' غزالہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں۔۔۔ لیکن اس کی خوب صورتی میں اس علاقے کی انفرادیت کا بڑا حصہ ہے۔ یہ صرف متمول طبقے کا علاقہ ہے۔ یہاں غیر ملکی زیادہ رہتے ہیں۔ پارک کے اختتام پر پاکستانی سفارت خانہ ہے۔ اس کے برابر میں آسٹریلیا کا سفارت خانہ ہے۔ یہ سارا علاقہ مختلف سفارت خانوں سے بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ناشتا کر لینا چاہیے۔'' عبداللہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

ناشتا انہوں نے اپنے کمرے میں کیا تھا۔ ناشتے کے بعد غزالہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ عبداللہ بھی لباس تبدیل کرنے لگا۔ اس کا پروگرام دہلی کی سیر کا تھا۔ اس کی فرمائش پر ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک گائیڈ فراہم کر دیا تھا۔ جو ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

دہلی کا لال قلعہ دیکھ کر غزالہ حیران رہ گئی۔ اسے مغلیہ دور کی فن تعمیر کے اس شاہکار نے بہت متاثر کیا تھا۔ قلعے کے ایک حصے میں قدیم نوادرات بھی رکھے تھے۔ غزالہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک ریستوران میں کھایا پھر دوسرے مقامات کی سیر میں مصروف ہو گئے۔

عجائب گھر سے واپسی پر دروازے کے قریب انہوں نے ایک قدیم دیوار کا شکستہ حصہ دیکھا جس پر ایک دربار کا منظر دکھایا گیا تھا۔ دربار میں ایک تخت تھا۔ تخت پر فرعون بیٹھا تھا۔ باقی درباری کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے تھے۔

دیوار کے شکستہ حصے پر گزشتہ ادوار کے اثرات موجود تھے۔ تاہم سنگ تراش کا فن ابھری ہوئی اشکال کی صورت میں زندہ تھا۔ یہ ایک شہنشاہ کے دربار کی مکمل تصویر تھی۔ عبداللہ نے اس پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے دیوار کے قریب رک کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن غزالہ اس جگہ پر یوں رک گئی جیسے فرش سے اس کے قدم چپک کر رہ گئے ہوں۔

غزالہ کی نگاہیں شکستہ دیوار کے اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں فرعون کا تخت تھا۔ عبداللہ نے پلٹ کر دیکھا غزالہ کسی بت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

''غزالہ۔۔۔'' عبداللہ نے اسے آواز دی۔

''کیا ہے۔۔۔؟'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کی طرف پلٹی۔ اس کی دونوں آنکھیں قدرے سرخ تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے عبداللہ کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے اعتدال پر آ گئی۔ اس کی پہلی والی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔

''پلیز پاپا! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قدیم مجسمے اور تصاویر میری کمزوری ہیں۔ میں فن کار کی فن کاری میں ڈوب گئی تھی۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔

عبداللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کار کی طرف بڑھنے لگا۔ غزالہ بوجھل قدموں سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

شام تک انہوں نے مختلف مقامات کی سیر کی پھر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں غزالہ نے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ عبداللہ خود بھی زیادہ تر خاموش رہا تھا۔ ہوٹل میں پہنچ کر غزالہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عبداللہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

شام کے سائے تیزی سے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کمرے میں خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تاہم عبداللہ نے بلب روشن نہیں کیا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ذہن مختلف خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ اس کی سوچ کا مرکز غزالہ ہی تھی۔ بیٹی سے اسے بہت پیار تھا۔ اس کی پرورش پر اس نے خاص توجہ دی تھی۔ اسے مشرقی آداب سکھائے تھے۔ وہ بے حد مطمئن تھا کہ اس نے اپنی مرضی کے مطابق غزالہ کی تربیت مکمل کر لی تھی لیکن کبھی کبھی اس کی رنگ بدلتی کیفیت نے اسے متفکر کر دیا تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے غزالہ کو کچھ ہو گیا ہے مگر کیا، اسے کیا ہو گیا ہے۔ یہ ایک معمہ تھا جسے دماغ حل نہیں کر سکا تھا۔

عبداللہ کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس سلسلے میں کسی سے مشورہ بھی نہیں لے سکتا تھا اگر مشورہ لیتا تو کیا بتاتا۔ لوگ اس پر ہنستے۔

اچانک کال بیل کی آواز ابھری۔ عبداللہ نے ایک طویل سانس لی اور اپنی نشست سے اٹھ گیا۔

''دروازہ لاک نہیں ہے۔ اندر آ جاؤ۔'' وہ یہ کہتا ہوا باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ غزالہ رات کے کھانے کے لیے آئی ہو گی۔

چند لمحوں کے بعد وہ اشوکا ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے۔

عبداللہ نے غزالہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ وہ سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ اس نے مشفقانہ نگاہ سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور سر جھکائے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

دوسری صبح ویٹر نے ناشتے کے ساتھ ہی ایک کارڈ بھی پیش کیا تھا۔ کارڈ میں ہوٹل کے پروگراموں کی تفصیل درج تھی۔ عبداللہ نے کارڈ پڑھ کر غزالہ کی طرف بڑھا دیا۔ کارڈ میں اس کی دلچسپی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

''پاپا! یہاں تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔ کیا آپ شرکت کرنا پسند کریں گے۔ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔'' غزالہ نے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہیں آرٹ سے کتنا لگاؤ ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

☆☆☆

اشوکا ہوٹل کی آرٹ گیلری میں ہوٹل کے مکینوں کے علاوہ شہر کے شرفا کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں اکثریت خواتین کی تھی۔ عبداللہ کچھ دیر تک غزالہ کے ساتھ رہا پھر اسے آرٹ گیلری میں چھوڑ کر خود نہرو پارک چلا گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ غزالہ یہاں سے جلدی نہیں جائے گی۔ وہ اس کے بے پناہ ذوق سے پوری طرح واقف تھا۔

غزالہ نے کئی تصویریں دیکھیں۔ اسے ایک

تصویر بہت پسند آئی۔ اس نے ہوٹل کی انتظامیہ سے مصور کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ اتنا تو وہ پہلے ہی معلوم کر چکی تھی کہ مصور مقامی ہے۔ وہ رات گئے تک تصویروں میں گم رہی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد عبداللہ نے اپنے دوستوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ غزالہ نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر آہستہ سے بولی۔ ''پاپا آپ تنہا اپنے دوستوں سے مل آئیں۔ میں دہلی کی سیر کروں گی۔ کچھ تھوڑی سی شاپنگ بھی کروں گی۔''

''لیکن بیٹی! تمہارے لیے یہ شہر اجنبی ہے یہاں کے حالات پل پل تبدیل ہوتے رہتے ہیں تم تنہا کیسے گھوم سکتی ہو۔''

''پاپا! میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔ دوپہر تک ہوٹل واپس آجاؤں گی۔ پھر لنچ کرنے کے بعد سو جاؤں گی۔''

''او کے بیٹی! ذرا خیال رکھنا۔'' عبداللہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

دس بجے غزالہ ہوٹل سے نکلی۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتا کر عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیکسی شاہ تارا اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ غزالہ کو مصور کا مکان تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اسے ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک معروف شاعر کا حوالہ بھی دیا تھا۔ مصور کا مکان اس کے برابر میں تھا۔

غزالہ نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دور کہیں گھنٹی کی آواز ابھری، پھر چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ مصور اجیت پال حسین شاہ کاروں کا خالق ہونے کے علاوہ شائستہ مزاج بھی تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے غزالہ کو خوش آمدید کہا اور اپنے اسٹوڈیو میں لے گیا۔ اس نے غزالہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اس بات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گھر پر اس کے مداح آتے رہتے ہیں۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔

غزالہ کی بات سن کر اجیت پال سنجیدہ ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''مس غزالہ! میں معذرت چاہتا ہوں۔ فرمائشی تصاویر نہیں بناتا اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی رادہ ہے۔ دراصل مصوری میرا ذریعہ معاش ہی نہیں میرا شوق بھی ہے۔ میں فن مصوری کے پس پردہ ایک خاص مشن پر کام کر رہا ہوں۔ آپ نے یقیناً میری اس تصویر کو پسند کیا ہوگا جس میں ایک دوشیزہ ندی سے پانی بھر رہی ہے۔ تصویر کے پس منظر میں چند کچے مکانات بھی ہیں۔ تصویر کے رنگوں میں ڈوب کر دیکھا جائے تو ناقد کو باآسانی اندازہ ہو جائے گا کہ اس جدید دور میں بھی ایک طبقہ کتنی کٹھن زندگی بسر کر رہا ہے۔ دولت کے پجاری اور سیاست کے ٹھیکے دار صرف قوم کی خوش حالی پر تقریریں کرتے ہیں۔ ان پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو میرے وطن میں محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی آواز ایوانوں تک کبھی نہیں پہنچتی لیکن میری تصاویر دکھی انسانیت کی فریاد کی صورت میں ان بڑے لوگوں کے ڈرائنگ روم تک پہنچ جاتی ہے۔''

غزالہ خاموشی سے اجیت پال کی باتیں سنتی رہی۔ اچانک اس کے چہرے پر سختی ابھر آئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''مسٹر اجیت پال! میرا بھی ایک مشن ہے۔ میں ہندوستان میں آپ کی مہمان ہوں۔ میں جو تصویر آپ سے بنوانا چاہتی ہوں وہ فن مصوری کے لیے ایک چیلنج ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ یہ چیلنج قبول کر لیں گے۔''

چیلنج کا نام سن کر اجیت پال کے چہرے پر غبار سا چھا گیا۔ وہ چند لمحوں کے بعد بولا۔ ''کیا آپ اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہیں؟''

''نہیں۔'' غزالہ نے پرس کھولتے ہوئے کہا۔ پھر پرس میں سے فولڈ کیا ہوا ریشمی کپڑا نکال کر اجیت پال کو دے دیا۔ اجیت پال نے کپڑے کا رومال کھولا اور دل چسپی سے تصویر دیکھنے لگا۔

''مسٹر اجیت پال۔۔۔!'' غزالہ نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ اس تصویر کے

جلے ہوئے حصے کو نظر انداز کر کے دوسرے حصے کی مدد سے تصویر کا چہرہ مکمل کر دیں۔ اس کام کے سلسلے میں آپ جو رقم طلب کریں گے میں پیش کر دوں گی لیکن تصویر کے تحفظ حصے پر جو حسن اور رعنائی ہے وہی سب کچھ دوسرے حصے پر ہونی چاہیے۔''

''رقم کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اجیت پال نے غزالہ کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تصویر بہت پرانی اور نایاب نظر آتی ہے۔ جس مصور نے اسے بنایا ہے وہ رنگوں کی جادوگری سے بخوبی واقف ہے۔ فن کی یہ بلندیاں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ میں اتنا اچھا مصور نہیں ہوں۔ تاہم تصویر کا چہرہ مکمل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''پھر میں کب آ جاؤں؟'' غزالہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔

''آپ چار دن کے بعد مجھے فون کر لیں۔'' اجیت پال ایک چھوٹا سا کارڈ اسے دیتا ہوا بولا۔

غزالہ اپنی نشست سے اٹھ گئی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی پھر ٹھہر گئی۔ ''مسٹر اجیت پال! میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گئی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''برائے مہربانی آپ یہ تصویر کسی اور کو نہ دکھائیں اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔ میرے کام میں رازداری شرط اول ہے۔''

''اس سلسلے میں آپ فکر نہ کریں۔ اس اسٹوڈیو میں میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں آتا۔''

غزالہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموشی سے پلٹی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

☆☆☆

پانچویں دن رات کو آٹھ بجے غزالہ، اجیت پال کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے دن میں اجیت پال کو فون کیا تھا۔ اجیت پال نے اسے شام چھ بجے تک آنے کو کہا تھا لیکن اس نے خود ہی رات آٹھ بجے کا وقت مقرر کر لیا تھا۔ اجیت پال غزالہ کا منتظر تھا۔

''تشریف رکھیں مس غزالہ۔۔۔!'' اجیت پال ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اور یہ رہی آپ کی امانت۔'' اجیت پال نے ادھ جلے چہرے والی تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

غزالہ چند لمحوں تک تصویر کو دیکھتی رہی پھر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''نہیں۔۔۔ یہ وہ چہرہ نہیں ہے۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے چہرے کی تمام تر رعنائی رخصت ہو گئی۔ رخساروں پر تناؤ سا پیدا ہو گیا، آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں اس کی آواز اتنی خوف ناک تھی کہ اجیت پال لرز گیا۔

''مصور تم ناکام ہو گئے ہو۔ مجھے افسوس ہے۔'' غزالہ کے لبوں سے غراہٹ سی ابھری۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔'' اجیت پال نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''خاموش۔ تم بالکل خاموش کھڑے رہو۔ اپنے لب سختی سے بند کر لو۔'' غزالہ پھر غرائی۔

اچانک ایزل پر موجود تصویر میں آگ لگ گئی۔ آگ اجیت پال کے لباس میں بھی لگ گئی تھی۔ وہ خود کسی مشعل کی طرح جل رہا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ دوسری جانب غزالہ کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل اجیت پال کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ایزل راکھ کا ڈھیر ہو گیا اور اجیت پال کا توانا جسم کوئلے کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا۔ غزالہ نے ایک طائرانہ نگاہ پورے اسٹوڈیو پر ڈالی پھر ایک جھٹکے سے پلٹی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

☆☆☆

عبداللہ اور غزالہ شام چھ بجے تک آگرہ پہنچ گئے۔ عبداللہ نے ٹیکسی ڈرائیور کے مشورے سے ایک مناسب ہوٹل میں دو کمرے حاصل کر لیے تھے۔ یہ ہوٹل دریائے جمنا سے قدرے نزدیک تھا۔

غزالہ، عبداللہ کے کمرے میں تھی۔ وہ اس وقت چائے پی رہے تھے۔ غزالہ کسی حد تک نارمل نظر آ رہی تھی۔ عبداللہ نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ دیا پھر سگریٹ سلگانے کے بعد بولا۔ ''بیٹی یہ بھی حسن

اتفاق ہے کہ آج چاند کی چودہ تاریخ ہے۔ ہم مکمل چاندنی میں تاج محل کا نظارہ کریں گے۔ رات کے وقت تاج محل کے اندرونی حصے بند ہوتے ہیں۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد دریائے جمنا کے کنارے چلیں گے۔ کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد تاج محل کا نظارہ کریں گے۔''

چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فضا میں چمکیلی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ زمین کی ہر شے چاندنی میں نہائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایسے عالم میں تاج محل کا حسن قابل دید تھا۔ عبداللہ اور غزالہ حیرت سے چاندنی میں ڈوبے ہوئے تاج محل کو دیکھ رہے تھے۔

''پاپا! یہ۔۔۔ یہ تاج محل ہے۔'' غزالہ سحر زدہ کیفیت میں بولی۔ اس کی نگاہیں مسلسل تاج محل کا طواف کر رہی تھیں۔ ''کیا یہ کسی انسان کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ کیا انسان اتنا حسین شاہ کار بنا سکتا ہے؟''

''ہاں! ایسا ممکن ہے اگر انسان کا ذہن مثبت سوچ اختیار کر لے اور وہ تعمیری مقاصد پر بھرپور توجہ دے تو وہ ایسے ہی شاہ کار تخلیق کرتا ہے لیکن اگر اس کی سوچ منفی ہے وہ انسانوں کی تباہی کے مشن پر کام کرتا ہے تو جنت ارضی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے۔''

اس وقت کافی رات گزر گئی تھی۔ غزالہ کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ عبداللہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ چنانچہ وہ ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

عبداللہ صبح کو بے دار ہو کر غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غزالہ ابھی سو رہی ہوگی۔ آگرہ میں اسے صرف دو دن قیام کرنا تھا۔ یہ بات اس نے رات ہی غزالہ کو بتا دی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اخبار پڑھنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ غزالہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ غزالہ دروازے کا پٹ تھامے کھڑی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اسے شدید سردی لگ رہی ہو۔ اس کا چہرہ بہت زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے بیٹی۔۔۔!'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ ''ارے۔۔۔! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ٹھہرو میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ تم لیٹ جاؤ میں کمبل اوڑھا دیتا ہوں۔''

''ہاں پاپا! ڈاکٹر کو لے آئیں۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد عبداللہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ غزالہ کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غزالہ کو انجکشن لگایا۔ چند کیپسول اور گولیاں دیں پھر ایک پرچے پر اسٹور کی دوا لکھ دی۔ عبداللہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوا لے آیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے دوا میز پر رکھ دی پھر مسہری کی طرف بڑھا۔ غزالہ گہری نیند سو رہی تھی وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ دیوار گیر گھڑی میں دن کے دو بج رہے تھے۔ دفعتاً غزالہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر کھڑی ہو گئی۔ الماری کھول کر اس نے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک کارڈ نکال کر پڑھنے لگی۔

یہ کارڈ آگرہ کے ایک مصور رام لال کا تھا جو اس نے اشوکا ہوٹل کی انتظامیہ سے حاصل کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے الماری بند کر دی۔ کارڈ پرس میں رکھ لیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

چند گھنٹے قبل غزالہ کی جو حالت تھی وہ یکسر مفقود ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ پوری طرح تر و تازہ اور صحت مند نظر آ رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر دروازہ لاک کر دیا پھر عبداللہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں برق سی چمکی تھی پھر اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ

تیزی سے پلٹی اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن غزالہ کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ عبداللہ نے فوراً روانگی کا پروگرام بنالیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ عبداللہ نے دہلی کے لیے دو ٹکٹ خریدے پھر وہ ایک بنچ پر بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین آ گئی۔ وہ ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ دونوں کی نشستیں کھڑکی کے پاس تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔ غزالہ نے ایک رسالہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

عبداللہ نے اسٹیشن پر نگاہ دوڑائی۔ اس کی نگاہیں ایک بک اسٹال کا طواف کرنے لگیں۔ بک اسٹال کھڑکی کے سامنے تھا۔ اخبار و رسائل قرینے سے سجے تھے۔ اخبار کی ایک سرخی پر اس کی نگاہ چپک کر رہ گئی۔ لکھا تھا۔ ''پندرہ منٹ کے اندر مصور رام لال کا جسم کوئلے کے جسمے میں تبدیل ہو گیا۔ پندرہ منٹ قبل اسے زندہ دیکھا گیا تھا۔ اس نوعیت کا یہ دوسرا حادثہ ہے۔''

عبداللہ اس سے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے چل پڑی تھی۔

شام تک وہ دہلی پہنچ گئے۔ عبداللہ کو تمام رات ٹرین میں سفر کرنے کے بعد کل دن میں بس سے بھی سفر کرنا تھا۔ اس کا پروگرام ریشم نگر جانے کا تھا۔ ریشم نگر تک کوئی ٹرین نہیں جاتی تھی۔ اسے پرتاب گڑھ کے اسٹیشن پر اتر کر بس کے ذریعے سفر کرنا تھا۔ جو زیادہ طویل نہیں تھا۔

☆☆☆

اس وقت غزالہ اور عبداللہ بس میں سفر کر رہے تھے۔ عبداللہ نے دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجے تھے۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔

''پاپا ہم ریشم نگر کب تک پہنچ جائیں گے؟'' غزالہ نے گزرتے ہوئے مناظر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''بارہ بجے تک۔۔۔ ہم تقریباً نصف سے زیادہ سفر کر چکے ہیں۔''

''ہم وہاں کتنے دن قیام کریں گے؟''

''کتنے دن قیام سے تمہاری کیا مراد ہے؟ بیٹی تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ریشم نگر تو تمہارا گھر ہے۔ ایک نہ ایک دن تمہیں وہیں منتقل ہونا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ آفتاب تمہارا منگیتر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ یہ فیصلہ وہیں چل کر کرنا پڑے گا اگر اسرار احمد یا عبیدہ زندہ ہوتی تو یہ سب کچھ بہت آسان ہوتا۔ خیر اللہ مالک ہے۔

غزالہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر بولی۔ ''پاپا! جب ہم پہلی بار ریشم نگر آئے تھے۔ تو وہاں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ انکل کا ہوٹل بھی خالی خالی سا رہتا تھا۔ ہوٹل میں گاہک کم اور عملہ زیادہ نظر آتا تھا۔''

''ہاں۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ علاقہ کیسا ہوگا۔ اسرار احمد مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ چند سالوں میں یہ علاقہ بہت ترقی کر لے گا لیکن ہوٹل کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد عبیدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایک سال بعد اسرار احمد بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسرار احمد کی تدفین میں، میں ریشم نگر آیا تھا۔ چند دن قیام کے بعد آفتاب کو ہوٹل کے منیجر جگدیش کی نگرانی میں چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔'' عبداللہ خاموش ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ماضی کے دریچے کھلنے لگے تھے۔

☆☆☆

دوپہر تک وہ ریشم نگر پہنچ گئے۔ آفتاب ''انکل'' کہہ کر عبداللہ سے لپٹ گیا۔ عبداللہ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''انکل یہ غزالہ ہے نا۔ یہ تو بہت بڑی ہو گئی ہے۔'' آفتاب نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ غزالہ نے حجابانہ انداز میں اپنا نازک سا ہاتھ اوپر اٹھا دیا اور ساتھ ہی سر کو ہلکا سا خم دے کر سلام کیا۔

''ہاں یہ غزالہ ہے لیکن بیٹے چند سالوں میں تم نے بھی خوب قد نکالا ہے۔'' عبداللہ کو آفتاب کا بے تکلف انداز پسند آیا۔

''بڑی سندر جوڑی ہے۔ بھگوان سلامت رکھے۔ آداب عرض کرتا ہوں بڑے صاحب!''

عبداللہ چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''ارے جگدیش! تم بھی یہاں موجود ہو۔'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

جگدیش، آفتاب کے ہوٹل کا منیجر تھا۔ وہ اسرار احمد کے زمانے سے کام کر رہا تھا۔ جگدیش کو اسرار احمد مرحوم اور عبداللہ کے تعلقات کا علم تھا۔ وہ عبداللہ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سب آفتاب کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ جگدیش ان سے اجازت لے کر ہوٹل چلا گیا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا جگدیش نے ہوٹل سے بھجوایا تھا۔

''بیٹے! تم اس بنگلے میں تنہا رہتے ہو۔'' عبداللہ نے کھانے کے دوران پوچھا۔

''نہیں میرے ساتھ بابا معین بھی رہتے ہیں۔ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ بابا کو ڈیڈی نے ملازم رکھا تھا لیکن میں انہیں ملازم نہیں سمجھتا۔'' آفتاب چند لمحوں تک خاموش رہا پھر بولا۔ ''جہاں تک ذاتی تنہائی کا تعلق ہے تو چند سال قبل سے یہ احساس شدید ہو گیا ہے۔ تاہم میں نے خود کو مصروف رکھنے کے بہانے ڈھونڈ لیے ہیں میں ہوٹل سے فارغ ہونے کے بعد تفریح کرنے نکل جاتا ہوں اور فطری مناظر کا مشاہدہ کرتا ہوں پھر ان کی تصویریں بناتا ہوں۔''

''آپ مصور بھی ہیں؟'' غزالہ نے چہکتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ اس نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

''جی نہیں! بس الٹی سیدھی تصویریں بنا لیتا ہوں۔ ایک کمرے میں میرا اسٹوڈیو بھی ہے۔ میں تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔''

''تو پھر ابھی چلتے ہیں۔'' غزالہ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''آیئے! مجھے کیا اعتراض ہے۔'' آفتاب اٹھ کھڑا ہوا۔

آفتاب غزالہ کو لے کر بنگلے کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اسٹوڈیو میں پہنچ گئے۔ غزالہ اسٹوڈیو میں موجود تصاویر دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''آپ بہت اچھی تصویریں بناتے ہیں۔'' غزالہ بولی۔

''نہیں غزالہ! میں رنگوں کے علم سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ اس کے لیے مدت درکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فن کار کو اپنے فن سے بے پناہ لگاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک کامیاب فن کار وہی ہے جو اپنے فن میں ڈوب جائے۔ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اس فن کو مشغلے کے طور پر اپنایا ہے۔'' آفتاب نے وضاحت کی۔

''آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ ایک بڑی تصویر کے نزدیک جا کر ٹھہر گئی۔

یہ ایک مصری خاتون کی تصویر تھی۔ تصویر بہت حسین تھی، رنگوں کا استعمال اتنی مہارت سے کیا گیا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے تصویر کسی بھی لمحے متحرک ہو کر اپنے فریم سے باہر نکل آئے گی۔ تصویر کی آنکھیں، لب و رخسار کسی بھی لمحے متحرک ہو جائیں گے۔ تصویر کے لب اس زاویے سے بنائے گئے تھے کہ ہلکی سی مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ آنکھوں میں ممتا کا نور جھلک رہا تھا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مجموعی طور پر تصویر کے چہرے پر اتنا وقار تھا کہ ملاکاؤں کے حسن کا گمان ہوتا تھا۔

غزالہ محویت سے تصویر دیکھتی رہی۔ ''یہ تصویر آپ نے بنائی ہے؟'' وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔

''ہاں، پسند آئی۔ یہ تصویر میری مرحوم ماں کی ہے۔'' آفتاب بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ایک مصور کی حیثیت سے میں نے جو کچھ سیکھا ہے، اس مہارت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اس میں بھر دیا ہے۔ اس تصویر میں میری فنی صلاحیتوں کے علاوہ میرے جذبات و احساسات کا بھی عمل دخل ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے اس کی تکمیل کی ہے۔''

''بہت خوب! اگر میں بھی آپ سے کوئی فرمائش کروں تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟'' غزالہ نے کہا۔

''بھئی فرمائش کیسی؟ کیا تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' آفتاب نے ہنستے ہوئے کہا۔

غزالہ اسے چند لمحے تک ٹھہرنے کا کہہ کر اسٹوڈیو سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس نے ہاتھ میں پکڑے پرس میں سے ریشمی کپڑے کا رومال نکال کر آفتاب کو دے دیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

آفتاب نے رومال کھول لیا۔ ریشمی کپڑے پر ادھ جلے چہرے کی تصویر تھی۔ وہ چند لمحوں تک تصویر کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گئی۔ یہ تو بہت نایاب تصویر معلوم ہوتی ہے۔ تصویر میں استعمال ہونے والا رنگ اور کپڑا موجودہ دور کا نہیں ہے۔ شاید کئی سو سال پرانا ہے۔''

''یہ میری ایک سہیلی کی ہے۔ وہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کیا آپ اس کی فرمائش پوری کریں گے؟''

''اب بتا بھی چکو کیا فرمائش ہے۔'' آفتاب نے بے تکلفی سے کہا۔

''وہ چاہتی ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ جلے ہوئے حصے کو ختم کر کے سالم حصے کی مدد سے تصویر کا چہرہ مکمل کر دیں۔''

آفتاب نے ایک بار پھر تصویر کا جائزہ لینا شروع کر دیا پھر چند ثانیے کے بعد وہ بولا۔ ''میں تصویر کا چہرہ مکمل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ تاہم یہ کہنا دشوار ہے کہ مجھے کس حد تک کامیابی ہوگی۔ مجھے اس امر کا باخوبی اندازہ ہے کہ میں اس تصویر کے مصور کی مہارت تک نہیں پہنچ سکتا۔'' آفتاب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ اسے کب تک بنا دیں گے۔'' غزالہ نے بے تابی سے دریافت کیا۔

''اب اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ کیا تم یہاں صرف تصویر بنوانے آئی ہو۔'' آفتاب نے غزالہ کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

غزالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ تمام تر جذبات سے عاری تھا۔ وہ سر اٹھائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ان دیکھی شے کو تلاش کر رہی ہے۔

''کیا اب یہیں قیام کا ارادہ ہے۔'' اس نے غزالہ کو مخاطب کیا۔

''ایں۔۔۔ نہیں۔'' غزالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ''آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ پکا وعدہ۔''

''میں وعدہ ہمیشہ پکا ہی کرتا ہوں اور وہ وعدہ جو تم سے کروں گا یقیناً پائیدار ہوگا۔'' آفتاب شوخ لہجے میں بولا۔

''نہیں، میں سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔ آپ اس تصویر کا ذکر کسی سے بھی نہیں کریں گے۔ پاپا سے بھی نہیں، پلیز اس بات کا وعدہ کریں۔'' غزالہ سرتاپا التجا بن گئی۔

آفتاب کو اس پر ترس آنے لگا۔ ''ٹھیک ہے غزالہ میں وعدہ کرتا ہوں لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ جب تک میں تصویر مکمل نہ کر لوں۔ تم میرے اسٹوڈیو میں نہیں آؤ گی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' غزالہ نے جلدی سے کہا اور اسٹوڈیو سے باہر آ گئی۔ آفتاب نے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

کئی دن کے بعد عبداللہ نے ریشم پوائنٹ جانے کا پروگرام بنایا۔ اس کے ساتھ صرف جگدیش تھا۔ سفر کے لیے اس نے جیپ کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے ساتھ وافر مقدار میں کھانے پینے کی اشیا تھیں اسے دوسرے دن شام تک واپس آنا تھا۔

عبداللہ کے جانے کے بعد غزالہ، آفتاب کے ساتھ ہوٹل آ گئی۔ اس نے دوپہر کا کھانا آفتاب کے ساتھ اس کے آفس میں کھایا تھا۔

چند لمحوں کے بعد چائے آ گئی۔ غزالہ چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آفتاب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔

''چائے پی لو پھر تمہیں ایک خوش خبری سناؤں گا۔''

''کیا۔۔۔ کیا تصویر مکمل ہو گئی؟'' غزالہ نے بے تابی سے سوال کیا۔

''ابھی نہیں۔ پہلے چائے پی لو مگر جلدی میں منہ نہ جلا لینا۔ آرام سے پینا۔''

''ہاں۔۔۔ اب بتاؤ۔'' غزالہ نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' آفتاب اپنی نشست سے اٹھتا ہوا بولا۔ اس کا رخ بنگلے کے عقبی حصے کی طرف تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اسٹوڈیو میں داخل ہو رہے تھے۔ غزالہ نے بے تابی سے ایزل کی طرف دیکھا۔ ایزل باریک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا لیکن تصویر کے دلکش نقوش باریک کپڑے سے جھلک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی دوشیزہ نے چہرے پر نقاب لگا رکھا ہے۔

''یہ رہی تمہاری ادھ جلی تصویر۔'' آفتاب نے ریشمی کپڑے کا رول غزالہ کی طرف بڑھایا۔

غزالہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ایزل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آفتاب نے بڑھ کر ایزل سے باریک کپڑا ہٹا دیا۔

ایزل پر فرعون کے دور کی حسین و جمیل دوشیزہ ہرمینہ کی مکمل تصویر موجود تھی۔ تصویر کے رخساروں پر آفتاب نے بہت عمدہ ورک کیا تھا۔ وہ اس طرح دمک رہے تھے جیسے گلاب شبنم سے دھل کر تر و تازہ ہوتا ہے۔ اس نے چہرے کے جلے ہوئے حصے کو اتنی مہارت سے مکمل کیا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تصویر آدھی تصویر کی مدد سے مکمل کی گئی ہے۔ تصویر کی آنکھوں میں زندگی کی رمق تھی۔ یوں لگتا تھا پلکیں کسی بھی لمحے حرکت میں آ جائیں گی۔ لبوں پر ہلکی سی آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

''آہ۔۔۔!'' اچانک غزالہ کے لبوں سے عجیب سی آواز نکلی۔ ''مصور۔۔۔! تم نے میری تصویر مکمل کر دی۔ آہ۔۔۔! تم نے میرے صدیوں کے کرب کو ختم کر دیا۔ میری تصویر مکمل کر کے مجھے رسوا ہونے سے بچا لیا۔'' غزالہ غیر انسانی اور پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

آفتاب حیرت سے غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نامکمل تصویر ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

''مصور میں جا رہی ہوں۔ جانے سے قبل غزالہ کی صورت میں تمہیں ایک تحفہ پیش کر رہی ہوں۔ میں غزالہ کا جسم چھوڑ رہی ہوں۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی غزالہ کی آنکھوں سے برق سی چمکی۔ آفتاب کے ہاتھ میں موجود تصویر میں آگ لگ گئی۔ آفتاب نے تصویر کا رول چھوڑ دیا ریشمی کپڑے کا رول فرش پر گرنے سے قبل جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

اچانک غزالہ لہرا کر فرش پر گر پڑی۔ ''کیا ہوا غزالہ۔۔۔!'' آفتاب گھبرا کر بولا، پھر اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ غزالہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ آفتاب نے ایزل کی طرف دیکھا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تصویر ایزل سے غائب تھی۔

دریں اثنا غزالہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے متوحش نظروں سے آفتاب کی طرف دیکھا پھر لرزتی ہوئی آواز میں

بولی۔ ''میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟ پاپا کہاں ہیں؟''
اس نے ایک ساتھ کئی سوال کیے تھے۔ وہ آفتاب سے قدرے خوف زدہ نظر آرہی تھی۔
''بیٹے آفتاب۔۔۔ آفتاب۔۔۔!'' دور سے عبداللہ کی آواز آئی۔ آفتاب جلدی سے اسٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔
چند لمحوں کے بعد وہ عبداللہ کے ساتھ اسٹوڈیو میں داخل ہو رہا تھا۔ غزالہ ابھی تک فرش پر بیٹھی تھی۔
''کیا بات ہے بیٹے! یہ غزالہ کو کیا ہو گیا۔'' عبداللہ گھبرا کر بولا۔
''پاپا۔۔۔! میں کہاں ہوں؟ میں تو قاہرہ میوزیم میں تھی۔'' غزالہ نے قدرے سہمے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔
''کیا۔۔۔؟'' عبداللہ تقریباً چیخ پڑا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم اس وقت ہندوستان کے قصبے ریشم نگر میں ہو۔''
''نہیں۔'' غزالہ غیر یقینی انداز میں چیخی۔ ''میں قاہرہ میوزیم میں ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ جس کا آدھا چہرہ جلا ہوا تھا۔''
''تم یہاں سے اٹھو۔ باہر نکلو۔ تمہیں خود یقین آجائے گا تم کہاں ہو۔'' عبداللہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔
وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ غزالہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اسے خبر کیوں نہیں ہوئی۔
آفتاب نے عبداللہ کو ساری تفصیل بتادی تھی۔ اس بات کو غزالہ نے حیرت سے سنا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں میں نے کوئی تصویر نہیں بنوائی ہے۔ میرا کسی تصویر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''
عبداللہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اس کے ذہن میں دہلی اور آگرہ کے مصوروں کی جلی ہوئی لاشیں ابھر آئیں لیکن وہ اس کے لیے غزالہ کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ اسے تو خود اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پر تو کوئی اور قابض تھا۔
اس امر کا یقین ہونے کے بعد کہ وہ واقعی ریشم نگر میں ہے غزالہ کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے دن آفتاب اور غزالہ کی شادی ہو گئی اور غزالہ ریشم نگر کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔
ایک ماہ بعد آفتاب، غزالہ اور عبداللہ قاہرہ روانہ ہو گئے۔ عبداللہ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ فیکٹری اور مکان فروخت کر کے مستقل طور پر ریشم نگر میں آجائے گا۔ غزالہ کے بعد قاہرہ میں اس کا کوئی نہیں تھا۔
قاہرہ کے اخبارات میں ایک خبر بڑی گرم تھی۔ تقریباً ایک ماہ سے اس خبر کا چرچا ہو رہا تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ چند ماہ قبل قاہرہ میوزیم سے جو آدھ جلی تصویر پُراسرار انداز میں غائب ہوئی تھی، وہ خود ہی اپنے شوکیس میں واپس آ گئی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر تصویر کا چہرہ مکمل ہے۔ یہ بات ظاہر نہیں ہوئی کہ تصویر کس نے بنائی اور کس طرح شوکیس میں رکھ دی۔
آفتاب، غزالہ اور عبداللہ قاہرہ میوزیم میں تصویر دیکھنے گئے تھے۔ تصویر کے شوکیس کے پاس بہت زیادہ ہجوم تھا۔ تماشائی قطار کی صورت میں تصویر دیکھ رہے تھے۔ تصویر دیکھتے ہی آفتاب نے پہچان لیا۔ یہ اسی کی بنائی ہوئی تصویر تھی۔ غزالہ نے تصویر کی طرف دیکھا پھر آفتاب کا ہاتھ تھام لیا اس کی گرفت بہت زیادہ سخت تھی۔ ''چلیں یہاں سے چلیں۔'' غزالہ نے خوف زدہ آواز میں کہا۔
''ہاں چلو۔'' آفتاب آگے بڑھتا ہوا بولا۔
اچانک ایک گائیڈ کی آواز ابھری۔ ''خواتین و حضرات یہ فرعون کے دور کی حسین ترین دوشیزہ ہرمینہ کی تصویر ہے۔''
آفتاب نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے یوں لگا تصویر کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ہے۔

ترقی

محمد بدر منیر

ہر انسان میں کوئی ایسا جوہر ضرور پوشیدہ ہوتا ہے جس کا ادراک خود اس کی ذات کو بھی نہیں ہوتا لیکن زندگی کے کسی بھی مرحلے پر کوئی نہ کوئی تحریک اس جوہر کو اجاگر کر دیتی ہے۔ وہ بھی ایک معمولی اخباری رپورٹر تھا مگر جب ایک قتل کی رپورٹنگ کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تو اس کی خفیہ صلاحیت پوری طرح ابھر آئی ...

ایک صحافی کی کہانی جو جاسوسوں والی تمام خصوصیات کا بھی حامل تھا

وہ نوجوان تھا۔ اس کا دل ترقی کی بلند سے بلند چوٹی سر کرنے کے لیے بے چین تھا، لیکن وہ جس ادارے سے وابستہ تھا اس میں ایک سے ایک فن کار بیٹھا تھا اور وہ کسی کے آگے آنے کے روادار نہیں تھے بلکہ جس میں بھی آگے بڑھنے کے جراثیم دیکھتے اس کا پتا اس صفائی سے کاٹتے کہ اسے اس وقت علم ہوتا جب وہ فٹ پاتھ پر بے یارومددگار کھڑا ہوتا۔

اس کا نام اکبر تھا۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ۔

وہ ایک مقامی روزنامہ میں رپورٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اور ترقی کا حق دار ہونے کے باوجود اسے مسلسل نظر انداز کیا جا رہا تھا اس کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سٹی پیج کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے بعد نیوز ایڈیٹر اور سب سے آخر میں اخبار کا مالک، جس نے شب و روز کی محنت کے بعد اخبار کو اس مقام تک پہنچایا تھا کہ اس کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا تھا اور اخبار کی ساکھ

اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی خاصی مضبوط تھی۔ اس اخبار کا وہ صفحہ جس میں شہر میں ہونے والے جرائم کی تازہ ترین خبریں مرتب کی جاتی تھیں کافی دلچسپ ہوتا۔ اسے سیاست دان، پولیس اور جرائم پیشہ افراد دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے، یہ صفحہ دراصل وزیر داخلہ کے بقول شہر میں امن عامہ اور شہریوں کے تحفظ کے بارے میں ایک طرح سے بیرومیٹر کا کام دیتا تھا اور اسے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی ذمہ داری اکبر کے سپرد تھی جسے اس کے عملے کے افراد ہی نہیں بلکہ شہر میں اس کے جاننے والے بھی اکبر اعظم کہا کرتے تھے۔ اس کا پورا نام اکبر حسین خان تو سبھی بھول گئی تھے بس اکبر اعظم یاد رہ گیا تھا۔ اکبر ترقی کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتا تھا، وہ اگرچہ تیز اور مضطرب تھا لیکن وہ نہایت احتیاط اور صبر کے ساتھ پیش قدمی کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ جلد بازی میں کوئی غلطی کر کے فٹ پاتھ پر بے یار و مددگار دھکے کھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس وقت بھی سٹی ایڈیٹر نے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ سٹی ایڈیٹر کی عمر چالیس سال سے کچھ اوپر تھی اور وہ ان آدمیوں میں سے ایک تھا جو اس کی خبر کو اپنے نام سے شائع کیا کرتا تھا۔ وہ حسب معمول اپنی میز پر تازہ اخبارات کے ڈھیر لیے بیٹھا تھا۔

''دیکھو برخوردار۔۔۔!'' اس نے خشک لہجے میں اکبر سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ اس ادارے میں تمہاری زیادہ قدر نہیں کی جا رہی ہے، کم از کم تمہارا یہی خیال ہے۔ ہوسکتا ہے تم یہ سوچ رہے ہو کہ اگر تم میری جگہ اس کرسی پر بیٹھے ہوتے تو زیادہ بہتر کام کرتے، لیکن ہمیشہ یاد رکھو کہ زیادہ تیز چلنے والے منہ کے بل گرتے ہیں۔ اخبار میں جوش و خروش سے زیادہ تجربے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ واقعات سن کر خبر کی کہانی بنا لینا بہت آسان ہے لیکن جائے واردات پر موجود رہ کر حقائق معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اکبر نے اس کی تمہید سے تنگ آ کر کہا۔

''تم نے بہت سے جرائم کی خبریں بنائی ہوئی ہوں گی لیکن یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔'' سٹی ایڈیٹر نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

''آخر کیا معاملہ ہے؟''

''تمہیں ڈیفنس سوسائٹی کے مین روڈ پر واقع ماڈرن اسنیک بار جانا ہے، وہاں قتل ہو گیا ہے، یہ خبر ابھی ابھی کسی نے فون پر بتائی ہے، مجھے افسانہ نہیں چاہیے بلکہ حقائق درکار ہیں۔ زیادہ سے زیادہ حقائق، ایسے حقائق جن کا دوسرے اخبارات اور خاص طور پر شام کے اخبارات کو علم نہ ہونے پائے۔ فوٹو گرافر کو بھی ساتھ لے لو اور اگر تمہارے پاس رقم نہ ہو تو کیشیئر سے لے لو۔ میں تمہیں شام کو سات بجے سے پہلے یہاں دیکھنا چاہتا ہوں خبروں اور تصاویر سمیت، او کے۔ گو۔''

☆☆☆

ماڈرن اسنیک بار میں صبح کے ساڑھے گیارہ بجے کوئی گاہک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید قتل کی واردات اور پولیس کی موجودگی کے باعث لوگ بار میں داخل ہونے سے ہچکچا رہے تھے اور دور کھڑے اس واردات کے بارے میں چہ مگوئیاں بھی کر رہے تھے، پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، سپاہی بڑی اکتاہٹ کے ساتھ لوگوں کی ٹولیوں کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے ہی میں ایک ایمبولینس آ کر انہی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے دو افراد ایک اسٹریچر لے کر اترے۔

بار کا شیشوں والا دروازہ بند تھا، دروازے پر ایک سپاہی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اکبر نے اندر جانے کی کوشش کی تو اس نے روک دیا۔ اکبر نے اسے اپنا پریس کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں پریس رپورٹر ہوں۔ یہ بتاؤ اس کیس کا تفتیشی افسر کون ہے؟''

''چوہدری ولایت حسین۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

''اچھا، اچھا! چوہدری صاحب کو یہ کارڈ دکھاؤ۔''

وہ جلد ہی واپس آیا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اکبر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر داخل ہوگیا۔ وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی اور ماحول اسی طرح اداس تھا جیسا کہ اس قسم کی واردات کے بعد ہوا کرتا ہے۔ اندر بھی کچھ آدمی موجود تھے جو ہار کا تفصیل سے جائزہ لے رہے تھے۔ پولیس کے فوٹو گرافر تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف دیوار پر ایک کلاک لٹک رہا تھا جس میں گیارہ بج کر ۴۵ منٹ ہوئے تھے۔

''کافی کے یہ دونوں مگ احتیاط سے اٹھا کر باہر لے جاؤ۔'' ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

اکبر نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ وہاں دو خالی مگ رکھے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دو افراد شانہ بہ شانہ کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے ہو کر کافی نوش کر رہے تھے۔ کاؤنٹر کے دوسری جانب ایک شخص دیوار کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا کسی چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اس چیز کی تصویر اتاری اور پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کاؤنٹر کے دوسری طرف آ کر اس نے مگ کی تصویر اتاری اور ایک طرف چل پڑا۔ دو آدمی اسٹریچر لے کر اندر آئے اور لاش اٹھا کر باہر چلے گئے۔ اکبر وہیں کھڑا رہا۔ ابھی اسے بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ وہ چوہدری ولایت کے پاس پہنچا اور مخصوص انداز میں سلام کیا۔

''کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' چوہدری اس کا مطلب سمجھ کر درشت لہجے میں بولا۔

''اس قتل کی وجہ کیا ہوسکتی ہے جناب!''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ قتل لوٹ مار کے لیے نہیں ہوا۔'' چوہدری ولایت نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ یہ قتل کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، خیال ہے کہ قاتل مرنے والے کی عادتوں سے بخوبی واقف تھا۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں ہے۔''

''پوری رقم کیش بکس میں موجود ہے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے؟''

''کوئی سراغ ملا۔'' اکبر نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے قاتل کا''

''نہیں۔۔۔ کسی نے قاتل یا قاتلوں کو اندر آتے دیکھا اور نہ انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھا، جب ویٹر اندر آیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس نے مقتول کو کاؤنٹر کے پیچھے پڑا ہوا پایا تھا۔ اس کا بدن اس وقت تک گرم تھا اور اس کی گردن کی پشت پر ایک سوراخ تھا اور ارد گرد خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ لاش ایسی جگہ پڑی تھی کہ اسے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔'' چوہدری کا لہجہ ذرا رنم پڑ گیا تھا۔

''مرنے والا کوئی ویٹر ہے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''نہیں۔'' چوہدری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس بار کا مالک مدن لال تھا۔''

چوہدری کی روانگی کے بعد اکبر ویٹر کے پاس آیا جو کاؤنٹر کے قریب ہی دل گرفتہ کھڑا تھا۔ اس نے اپنا وہی پرانا حربہ استعمال کیا اور یہ حربہ ایسا تھا جو ہر شخص کو موم کر دیتا تھا۔ اس نے ویٹر کو بڑے نرم لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک رپورٹر ہوں اور میں تمہارا نام اور تصویر بھی اخبار میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔''

اخبار میں اپنے نام اور تصویر کی اشاعت کا سن کر ویٹر کی ساری افسردگی دور ہوگئی اور اس کی بتیسی دکھائی دینے لگی۔ وہ اکبر کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا مالک کس قسم کا آدمی تھا؟''

ویٹر نے جواب دینے سے پہلے اپنے اردگرد دیکھا جیسے وہاں اس کے مالک کی روح نہ کھڑی ہو، پھر آگے کی طرف جھک کر بڑی رازداری سے کہنے

"اب کیا بتاؤں۔ وہ انتہائی نامعقول آدمی تھا، میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شریف آدمی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت ہی سخت مزاج تھا۔ کبھی کبھی میں چھٹی لینے کے لیے اس کے پاس جاتا تو وہ مجھے اس طرح گھور کر دیکھتا جیسے شیطان نے اس کے جسم پر قبضہ کرلیا ہو۔ اس کے علاوہ اس میں ایک انتہائی مکروہ عادت بھی تھی وہ گاہکوں سے کافی اور کھانے پینے کی اشیاء کی قیمت پہلے ہی وصول کر لیا کرتا تھا اور پھر انہیں اس کے عوض ٹوکن دیا کرتا تھا۔ وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر اس طرح گاہکوں کو گھورتا رہتا جیسے وہ سب معزز گاہک نہیں بلکہ چور اچکے ہوں۔"

"اس قسم کے آدمی تو بہت جلد لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں۔" اکبر نے تبصرہ کیا۔

"جی ہاں جناب! آپ کا اندازہ درست ہے۔" ویٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ چند دن قبل کی بات ہے ہمارا ایک گاہک کافی دنوں سے روزانہ آ رہا تھا۔ ہم لوگ اسے اچھی طرح پہچان گئے تھے۔ ایک رات اس نے کافی اور برگر کے لیے پچاس روپے دیے۔ اس رات بار میں کافی بھیڑ تھی، مالک نوٹ جمع کرنے میں مصروف تھا، اس نے دیکھا بھی نہیں کہ گاہک جس کا نام یونس تھا اس نے پچاس روپے کا نوٹ دیا ہے پھر جب مسٹر یونس نے اس سے کہا کہ اس نے پچاس روپے کا نوٹ دیا ہے تو باس نے اسے جھوٹا کہہ دیا۔ میں نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے باس کو ایک طرف لے جا کر کہا کہ جناب! اس میں اسنیک بار کی نیک نامی کا سوال ہے۔ اگر اس نے پانچ روپے بھی دیے ہیں پھر بھی اس کی پچاس روپے والی بات تسلیم کر لی جائے لیکن باس نے میری ایک نہ سنی۔ گاہک نے جیب سے دوسرا نوٹ نکال کر باس کے منہ پر مارا۔ اس پر باس سخت ناراض ہوا اور اسے دھکے دے کر بار سے باہر نکال دیا۔ گاہک نے چلتے چلتے کہا کہ ابھی تو وہ جا رہا ہے لیکن وہ جلد ہی واپس آئے گا اور اسے اس کی بے ایمانی اور بدتمیزی کا مزا چکھا کر رہے گا۔ اسنیک بار میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے اس کی دھمکی سنی اور سب اس انتظار میں رہے کہ وہ واپس آئے اور بار کے مالک کی ٹھکائی کرے۔ اس رات ہمارا اسنیک بار کافی تاخیر سے بند ہوا۔ دراصل تمام گاہک باس کی بے عزتی کا تماشا دیکھنے کے خواہش مند تھے لیکن وہ نہ آیا جس سے لوگوں کو مایوسی ہوئی۔

ویٹر نے ایک ہی سانس میں پوری کہانی سنا دی اور اکبر خاموشی کے ساتھ اس کی کتھا سنتا رہا وہ تصویر چھپوانے کے شوق میں دوبارہ کہنے لگا۔

"جب وہ آدمی واپس نہ آیا تو باس ہم لوگوں سے مسکراتے ہوئے بولا۔ آدمی جھوٹ بول رہا تھا، بعد میں اسے احساس ہو گیا ہوگا کہ وہ غلطی پر تھا اس لیے وہ نہیں آیا۔۔۔ لیکن جناب! میں ایسا نہیں سمجھتا اور اب آگے بھی سنیں۔" ویٹر نے چہکتے ہوئے کہا۔

"اسی رات جب بار بند کرنے کے بعد حساب چیک کیا تو پچاس روپے زیادہ نکلے لیکن اس کے باوجود باس ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا بلکہ اس نے لاپروائی سے کہا۔ اگر وہ آجائے تو اسے روپے واپس کر دینا لیکن اس رات کے بعد وہ گاہک پھر نہیں آیا۔ وہ پچاس روپے اب بھی کیش بکس میں ایک طرف رکھے ہیں۔"

"کیا تم نے پولیس والوں کو یہ بات بتائی ہے۔" اکبر نے سرگوشی میں پوچھا۔

"بتانا ہی پڑا۔" ویٹر نے بھی آہستہ سے کہا۔

"پولیس والے جب سوال جواب شروع کر دیتے ہیں تو پھر ان سے کوئی بات نہیں چھپائی جا سکتی پھر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری پولیس کتنی مستعد اور فرض شناس ہے کہ چوری سے قبل چور کے قبضے سے مال مسروقہ برآمد کر لیتی ہے۔ میں نے چوہدری صاحب کو اس کا نام بھی بتا دیا ہے کیونکہ وہ یہاں کا پرانا گاہک تھا اس لیے لوگ اس کا نام بھی جانتے تھے۔" اتنا کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا۔ "اب میں کیا کرتا۔ میں نے پولیس والوں کو اس کا حلیہ بھی بتا

دیا۔ اس کا رنگ صاف، قد درمیانہ اور دائیں رخسار پر زخم کا ایک گہرا نشان ہے۔''

☆☆☆

اکبر نے تھوڑی دیر کے بعد نواز نامی شخص کو تھانے میں دیکھا۔ وہ بے چارہ بہت بوکھلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اکبر نے اس کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ اکبر جب چوہدری ولایت کے دفتر میں داخل ہوا تو اس وقت سوال جواب ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے اکبر کو معلوم نہ ہو سکا کہ سوال کس نوعیت کے تھے اور جواب کیسے تھے لیکن نواز کو حد سے زیادہ نروس دیکھ کر وہ کسی حد تک سوال جواب کی نوعیت اور پولیس کے رویے کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ ایک یا دو منٹ کے بعد انسپکٹر کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ویٹر اندر داخل ہوا اسے نواز کی شناخت کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس نے اندر آنے کے بعد اکبر سے کسی شناسائی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ صرف نواز کو شناخت کر کے چلا گیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد اکبر نے چوہدری ولایت سے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم اس شریف آدمی پر شک کر رہے ہو۔''

''نہیں۔'' چوہدری نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس شریف آدمی پر شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ ہم نے حقیقی مجرم کو گرفتار کیا ہے۔ کاؤنٹر پر رکھے ہوئے دو گلاسوں میں ایک گلاس پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ کسی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہیے۔''

''اکبر نے اپنے سفاری سوٹ کی جیب سے ایک نوٹ بک اور بال پین نکالا اور اس پر کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔'' کیا نواز نے جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی پر اصرار کیا ہے۔''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' ولایت مسکرایا۔ ''ہر مجرم یہی کہتا ہے لیکن اس شریف آدمی کا المیہ یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز کو اپنا گواہ بنایا ہے جو کچھ بول نہیں سکتی۔ یعنی اپنے بستر کو۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ تمام رات سوتا رہا ہے۔''

''اس کا دوسرا ساتھی کون تھا؟''

ولایت مسکرایا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے یہ اتنی آسانی سے بتا دے گا کہ اس کا ساتھی کون تھا۔ لیکن تم فکر مت کرو ہم اس کا سراغ لگا لیں گے۔ اس نے ابھی تک اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا ہے لیکن یہ زیادہ دیر تک انکار نہیں کر سکتا، پولیس اس سے سچی بات اگلوا لے گی۔ فی الحال ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں، ہمارے پاس بہت وقت ہے، اگلے ہفتے کے آخر تک ہم عدالت میں اس کا چالان پیش کر دیں گے۔'' اکبر نے اپنی نوٹ بک بند کر دی۔

''اب تم جا سکتے ہو۔'' چوہدری نے اکبر کو اشارہ کیا۔

اکبر کرسی سے اٹھ کر دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر چوہدری خود ہی بول پڑا۔

''دیکھو مسٹر جرنلسٹ! تم شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ دوسرے مگ پر انگلیوں کے نشانات کیوں نہیں جبکہ دوسرا مگ بھی کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے اس مگ کو بھی استعمال کیا تھا۔ اس کے متعدد امکانی جوابات ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہو سکتا ہے دوسرے آدمی نے دستانے پہن رکھے ہوں کیونکہ مگ خود بخود تو کاؤنٹر پر نہیں پہنچا ہو گا۔ انگلیوں کے نشان نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مگ کو دھویا گیا ہے اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے مگ کو کیوں نہیں دھویا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے دوسرا آدمی زیادہ عقل مند تھا اس نے فوراً ہی مگ کو دھو دیا لیکن دوسرے کو یاد نہیں رہا۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے قاتل کون تھا۔ جس نے مگ دھو ڈالا یا وہ جو مگ دھونا بھول گیا۔ اب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں دریافت طلب ہیں۔ اس لیے اب باہر جاؤ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر دو۔''

☆☆☆

''ٹھیک ہے اگر چوہدری صاحب نے تصویریں دیکھنے کی اجازت دے دی ہے تو تم دیکھ لیتے ہو۔'' پولیس فوٹو گرافر نے اکبر سے کہا۔ ''لیکن میں ذرا چوہدری صاحب سے پوچھ لوں۔'' اس نے انٹر کام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں چوہدری کو پریشان مت کرو۔'' اکبر جلدی سے بولا۔ ''اس نے کہا بھی تھا کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے، اسی لیے تو اس نے خود آنے کے بجائے مجھے تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ مجھے لاش کی تصویریں نہیں بلکہ صرف کاؤنٹر اور بیک گراؤنڈ کی تصویریں دیکھنی ہیں۔''

فوٹو گرافر نے ایک بڑی سی البم کو کھولتے ہوئے کہا۔ ''تم آج صبح خود بھی تو جائے واردات پر تھے، تمہارا فوٹو گرافر وہاں کیوں نہیں آیا؟''

''میں وہاں موجود تھا اس لیے تو آیا ہوں، میں نے کوئی چیز دیکھی تھی اب میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ شاید تصویروں کو دیکھ کر کچھ یاد آجائے۔'' اکبر نے فوراً جواب دیا۔

اکبر الٹ پلٹ کر البم دیکھتا رہا اور کچھ دیر بعد واپس کر دیا۔ اس نے باہر آنے کے بعد تھانے کے قریب واقع ایک پبلک بوتھ سے اپنے دفتر فون کیا، دوسری طرف عباس علی تھا۔ اس کا موڈ سخت خراب معلوم ہو رہا تھا۔

''تم نے اتنی دیر لگا دی۔'' عباس نے غرا کر کہا۔ ''تم صبح سے گئے ہوئے ہو اور اب رات ہونے والی ہے۔ میں اتنی دیر میں مملکت روم کے زوال کی پوری تاریخ لکھ سکتا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے ہم لوگ یہاں جھک مار رہے ہیں۔ ایک خبر کے لیے اتنا وقت نہیں دیا جا سکتا۔''

''یہ خبر ایسی ہے کہ اس کے لیے زیادہ وقت دینا ہوگا۔ معاملہ دلچسپ اور کسی حد تک سنسنی خیز صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''یہ صرف چار سطروں کی خبر ہے، اس میں کوئی ڈرامائی بات نہیں۔ لکھ دو کہ اسنیک بار کا مالک قتل کر دیا گیا۔'' عباس علی بولا۔ ''یہ بھی لکھ دو کہ گرفتاری جلد عمل میں آنے والی ہے۔''

''گرفتاری تو ہو بھی چکی ہے۔''

''بہت خوب۔۔۔! کیا قاتل ہی کو گرفتار کیا گیا ہے؟''

''پولیس تو یہی کہہ رہی ہے لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا۔۔۔؟'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''جب پولیس کہہ رہی ہے تو قصہ ختم ہوا۔''

''ہاں بظاہر تو قصہ ختم ہوا لیکن مجھے شک ہے۔'' اکبر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کیوں برخوردار! تمہیں یقین کیوں نہیں ہے۔'' اس کا غیظ و غضب برقرار تھا۔ ''کیا اس لیے کہ ملزم نے خودکشی نہیں کی اگر وہ خودکشی کر لیتا تو تمہارا شبہ ختم ہو جاتا، دیکھو اکبر! ہمارا اخبار روزنامہ ہے، ماہنامہ نہیں۔ اس کے علاوہ تمہیں رپورٹنگ کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر پولیس کا یہ کہنا ہے کہ اس نے ملزم کو گرفتار کر لیا ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو اس پر شبہ کرنے والے، میں تمہیں صرف دس منٹ دے سکتا ہوں، واپس آ کر مکمل رپورٹ دو۔''

''لیکن باس۔۔۔! میری بات تو سنیں۔'' اکبر جلدی سے بولا۔ ''آپ مجھے ساری صورت حال واضح کرنے کے لیے کچھ وقت تو دیں، میرے علم میں ایک ایسی بات آئی ہے جسے پولیس نے نظر انداز کر دیا ہے اور اس لیے میں کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے ایک غلط آدمی کی گردن میں پھندا فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''یاد رکھو میں نے صرف دس منٹ دیے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں واپس آنے کی ضرورت نہیں، اپنا کوئی اور انتظام کر لینا۔'' پھر ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

اکبر نے گہری سانس لے کر ریسیور ہک میں لٹکا دیا۔ وہ اس وقت کسی بھی صورت میں دفتر واپس نہیں جا سکتا تھا، وہ حقائق سے اتنا قریب آ کر اب لوٹ

نہیں سکتا تھا۔''

وہ ایک بار پھر ماڈرن اسنیک بار میں واپس آیا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بار اس وقت کھلا ہوا تھا۔ شاید حساب کتاب نمٹانے اور کاروباری لین دین کے لیے اسے کھلا رکھا گیا تھا لیکن اندر کوئی گاہک نہیں تھا۔ کیونکہ لوگ ایسی جگہ کھانا پینا پسند نہیں کرتے جہاں چند گھنٹے قبل قتل کی واردات ہو چکی ہو۔''

''مجھے ایک مگ کافی اور ایک بیف برگر دو۔'' اس نے ایک میز کے گرد بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ویٹر نے ذرا دیر بعد دونوں چیزیں فراہم کر دیں۔

اکبر نے ہاتھ بڑھا کر کافی کا مگ اٹھالیا اور کچھ دیر تک اسے بغور دیکھنے کے بعد پوچھا۔ ''کیا تم کافی کے ان مگوں کا حساب رکھتے ہو؟''

''ہاں، مجھے ایک ایک مگ یاد ہے، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت ہمارے پاس کتنے مگ ہیں۔'' ویٹر نے کہا۔ ''ہم نے چند دن قبل ہی تین درجن مگ خریدے تھے۔''

''میرا خیال ہے ان میں سے کئی مگ تو ٹوٹ چکے ہوں گے۔''

''ہرگز نہیں۔'' ویٹر جلدی سے بولا۔ ''کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہماری تنخواہ سے پیسے کاٹ لیے جاتے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تمہارے پاس پینتیس مگ ہیں کیونکہ ایک مگ تو پولیس والے لے گئے ہیں۔ کیوں میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''۳۵ مگ نئے اور اٹھارہ پہلے والے مگ، کل ۵۳ مگ ہوئے۔'' ویٹر نے کہا۔

اکبر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو بات بات پر شرط لگاتے ہوں بلکہ میں تو شرط لگانے کا قائل ہی نہیں لیکن آج میں ایک شرط لگاتا ہوں کہ تمہارے اسٹاک میں ۵۳ مگ نہیں ہیں، تم ثابت کرو کہ ۵۳ مگ ہیں اور پچاس کا نوٹ اٹھالو۔''

''واہ، بلکہ بہت خوب! تم نے رقم پیدا کرنے کی یہ آسان ترکیب نکالی ہے۔'' ویٹر خوش ہو کر بولا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے بھی پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھا، پھر اس نے ایک چھوٹی سی چھڑی اٹھالی اور دیوار کے قریب والی الماری کا پٹ کھول کر بولا۔ ''یہ دیکھو، سارے مگ ایک ہی لائن میں ہیں، سوائے اس مگ کے جو تمہارے پاس ہے باقی سارے مگ یہاں موجود ہیں، میں باری باری مگ پر چھڑی سے اشارہ کرتا ہوں تم گنتے رہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''تم شروع کرو۔''

ویٹر ہر مگ پر باری باری چھڑی سے اشارہ کرتا گیا اور اکبر گنتا گیا۔ ''اکیاون، باون، ترپن۔'' چھڑی کچھ دیر کے لیے رکی اور پھر ایک اور مگ کی طرف بڑھی۔ الماری میں چون مگ تھے۔

مسکراہٹیں

ایک آدمی نے ایسی عورت سے شادی کی جو اس سے پہلے چھ شوہر کر چکی تھی اور وہ آدمی اس کا ساتواں شوہر تھا۔

ایک دفعہ وہ بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی، بیوی اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگی۔

بیوی: ''سرتاج..... آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟''

شوہر: ''آٹھویں شوہر کے سہارے۔''

☆☆☆

دو میاں بیوی کار میں سفر کر رہے تھے۔ بیوی نے شوہر سے پوچھا۔ ''کیا آپ ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کر سکتے ہیں؟''

شوہر نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''ہاں! ہاں، کیوں نہیں۔''

بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تو پھر آپ دوسرے ہاتھ سے اپنی ناک صاف کیوں نہیں کر لیتے؟''

ویٹر نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ ''ایک مگ زیادہ ہے، شاید مجھ سے حساب میں کوئی غلطی ہوگئی۔''

''نہیں تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔'' اکبر نے کہا۔ لیکن اس نے اپنے اس جملے کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ ''اپنا نوٹ اٹھالو، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تم سے کسی اور مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں ضرور۔'' ویٹر نے اپنے پچاس روپے بچ جانے پر خوشی کے عالم میں گفتگو پر آمادگی ظاہر کردی۔

اکبر نے اس طرح سوچنا شروع کردیا جیسے وہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کسی موضوع کی تلاش میں ہو پھر وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے اپنے باس کی تمام باتوں سے تم بخوبی واقف ہوگے۔''

''ہاں۔ میں اس کے پاس پندرہ سال سے کام کر رہا ہوں، مجھ سے زیادہ اور کون اس کے حالات سے واقف ہوسکتا ہے۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارے باس سے قتل کی حد تک نفرت کرنے والا کوئی اور بھی ہوسکتا ہے، نواز کے سوا۔''

''اس سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا تھا۔''

''یہ تو صحیح ہے لیکن کوئی ایسا شخص جس نے اسے قتل کرنے کی دھمکی دی ہو۔''

''میں نے نواز چوہدری کا نام تو بتا دیا۔''

''اس کے علاوہ کون ہوسکتا ہے۔'' اکبر نے نوٹ بک اور بال پین سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو دوست! یہ بات بھی ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔ میں اس سوال کو اس طرح کرتا ہوں کہ نواز کے علاوہ کس پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔''

ویٹر نے سوچنے میں کافی دیر لگادی۔ اس دوران وہ اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا، پھر کچھ سوچ کر اس نے تین افراد کے نام لکھوائے۔ نواز، عبداللطیف اور سیٹھ کندن لال۔'' اکبر نے ویٹر سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

اکبر جس وقت اپنے دفتر واپس لوٹا، وہ وقت عباس علی کے گھر جانے کا تھا۔ اکبر نے آتے ہی انٹر کام پر عباس سے رابطہ قائم کیا۔

''سنو باس! میں نے پتا چلا لیا ہے کہ اسنیک بار میں گولی چلائے جانے کے وقت ایک فالتو مگ موجود تھا جو کہ۔۔۔''

عباس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''کون بول رہا ہے؟''

''باس۔۔۔! میں اکبر بول رہا ہوں۔''

''اکبر۔۔۔ کون اکبر؟ میرے اسٹاف میں کوئی اکبر نہیں۔''

''مجھے کم از کم ایک بیان تو لکھ لینے دو۔''

''بیان لکھنے کا حق صرف پولیس کو ہے۔'' اس مرتبہ اس کی آواز نرم تھی۔ ''میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''لیکن میں نے پانچ ایسے شواہد کا پتا چلا لیا ہے جو نواز کو بے گناہ ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے پہلا یہ ہے کہ۔۔۔''

''میرا خیال ہے کہ پولیس مجرم کو گرفتار کرچکی ہے اور اب یہ کہانی ختم ہوگئی ہے۔''

''نہیں جناب! نواز نے اسنیک بار کے مالک کو قتل نہیں کیا۔''

''مجھے افسوس ہے، ہماری یہ کبھی بھی پالیسی نہیں رہی کہ ہم باہر کے لوگوں کے بیان پر یقین کرلیں۔'' عباس علی نے کہا۔

لیکن اکبر اب کسی بھی قیمت پر اپنی تحقیقات ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی وہی مگ تھا جو ماڈرن اسنیک بار میں باہر سے لایا گیا تھا اور جس کا نمبر ۵۴ تھا۔ اس قسم کے مگ زیادہ تر اسنیک بار میں ہی استعمال کیے جاتے تھے۔ دفتر سے باہر نکلنے کے بعد اس نے ڈیفنس کے علاقے میں واقع اسنیک بار کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ وہ متعدد اسنیک بار میں گیا اور اس نے وہاں

کافی پی۔ وہ اپنی پوری زندگی میں نہ اتنا پیدل چلا تھا اور نہ اتنی کافی پی تھی۔ ایسٹ ایونیو سے سنٹرل ایونیو تک کے ہر اسنیک بار میں وہ گیا۔ وہ ہر جگہ بل کی ادائیگی کے بعد یہ سوال کرتا۔

''کیا گزشتہ ایک دو دنوں میں تمہارے یہاں کافی کا کوئی مگ چوری ہوا ہے؟''

ہر جگہ ملازمین اس سوال پر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے اور سرنفی میں ہلا دیتے۔ ایک اسنیک بار کے کسی دل جلے ویٹر نے تو یہ بھی کہہ دیا۔ ''مسٹر! کیا تم ہم سے مذاق کر رہے ہو، کیا مگ بھی چوری کرنے کی چیز ہے۔'' آخر ایک جگہ اسے کامیابی ہوگئی۔ وہ سن سیٹ بلیوارڈ کا ایک معمولی سا اسنیک بار تھا۔ پہلے تو اسے یہاں بھی نفی میں جواب ملا اور وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگا تو ویٹر نے اسے آواز دی۔

''اے مسٹر! ابھی تم نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟''

''میں نے یہ پوچھا تھا کہ گزشتہ ایک دو دنوں میں تمہارے ہاں سے کوئی مگ چوری ہوا ہے؟''

ویٹر نے اقرار میں زور زور سے سر ہلانا شروع کر دیا۔ ''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''اسے چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال میں کون لے گیا ہوگا؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا، میرا مطلب یہ ہے کہ میں اس کا نام پتا نہیں جانتا۔''

''لیکن تم نے اسے دیکھا تو ہوگا۔ اس کا حلیہ کیسا تھا؟''

''درمیانہ قد، گٹھے ہوئے جسم کا آدمی، سیاہ بال اور ماتھے پر زخم کا نشان، ایک آنکھ ذرا سی ٹیڑھی تھی۔'' ویٹر نے جواب دیا۔

اکبر نے یوں محسوس کیا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ یہ حلیہ سو فیصد نواز کا تھا جسے پولیس پہلے ہی گرفتار کر چکی تھی۔

''تم نے اسے مگ لے جاتے تو نہیں دیکھا ہوگا۔''

''ہاں، میں نے اسے دیکھا نہیں تھا لیکن وہ مگ اسی کے پاس تھا اور وہی اسے لے جا سکتا تھا۔ جب وہ کافی پی کر اور اپنا بل ادا کر کے چلا گیا تو میں مگ اٹھانے اور میز کی صفائی کرنے گیا لیکن اس کی میز سے مگ غائب تھا، میں نے نیچے جھک کر دیکھا کہ شاید مگ نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہو لیکن وہاں ٹوٹا ہوا مگ بھی نہ تھا۔ پھر میں نے اس پر اتنا دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں تھی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اکبر نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''اس مگ کی اتنی قیمت تو نہیں لیکن اس وقت اس کی قیمت ایک شخص کی قیمتی زندگی کے برابر ضرور ہے۔''

☆☆☆

چوہدری ولایت نے اس طرح اکبر کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا جیسے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہو۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں نواز چوہدری سے ملاقات کی اجازت نہیں دی سکتا، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے گھر میں بیٹھ کر قانون بنایا ہے۔ نواز قتل کے الزام میں بند ہے اور اس کے وکیل کے سوا کسی اور کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ نواز میرا قریبی عزیز بھی ہے۔ اس کی گرفتاری کا مجھ سے زیادہ کسے دکھ ہو سکتا ہے اور اس کی بے گناہی ثابت ہونے پر مجھ سے زیادہ کسے خوشی ہو سکتی ہے۔''

''میں اس سے مل کر صرف اس کا پس منظر جاننا چاہتا ہوں تاکہ اخبار کے لیے ایک مضمون لکھ سکوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے تم اس عمارت سے باہر نکل جاؤ اور کہیں بھی بیٹھ کر مضمون لکھ لو۔''

''اگر میں چند منٹ اس سے گفتگو کر لوں تو تمہارا کیا نقصان ہے، ہو سکتا ہے میں اسے بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ تمہارے لیے بھی بہتر ہے کہ نواز کی بے گناہی یہیں ثابت ہو جائے ورنہ اگر وہ عدالت میں جا کر بے گناہ ثابت ہوا تو تم اپنے محکمے میں نااہل ٹھہرائے جاؤ گے۔'' اکبر

نرمی سے بولا۔

چوہدری نرم پڑ گیا۔ اس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا۔

''اسے نواز سے ملا دو، یہ اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔''

☆☆☆

''مجھے سخت دشواری کے بعد تم سے ملاقات کی اجازت ملی ہے۔'' اکبر نے حوالات کی سلاخوں کے پاس کھڑے ہو کر نواز سے کہا۔ ''میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، تم اس ہیڈ کانسٹیبل کی پروا مت کرو، میں تم سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھوں گا جو قانون کے خلاف ہو، تم سوچ سمجھ کر میرے سوالات کے جواب دو، میرے خیال میں تمہاری مدد کے لیے یہی بات مناسب ہوگی۔''

''تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''گزشتہ رات تم سے کسی نے ہاتھ ملایا تھا؟''

نواز نے حیرت سے اکبر کو دیکھا اور پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ''کیا تم مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو؟''

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں کیا گزشتہ رات تم سے کسی نے ہاتھ ملایا تھا۔''

''نہیں۔ اس رات میں بالکل اکیلا تھا۔ میں نے کسی سے ملاقات کی اور نہ ہاتھ ملایا۔''

''ٹھہرو۔ تم کل رات سن سیٹ بلیوارڈ کے کس اسنیک بار میں تھے؟''

''ہاں۔۔۔ لیکن میں وہاں اکیلا ہی گیا تھا اور واپس بھی اکیلا ہی آیا تھا، میں وہاں بہ مشکل دس پندرہ منٹ ٹھہرا تھا۔''

''کیا وہاں تم نے کسی آدمی سے ہاتھ نہیں ملایا۔ سوچو، ذرا ذہن پر زور دو۔'' اکبر نے اصرار کیا۔

اچانک جیسے نواز کو کوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے خود کسی آدمی سے ہاتھ نہیں ملایا تھا، لیکن ایک اجنبی نے میرے ہاتھ کو چھوا تھا، تم اس قسم کے آدمیوں سے بخوبی واقف ہو گے جو زبردستی کی جان پہچان پیدا کر کے ہاتھ ملانے لگتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں کہ انہیں کسی اور کا دھوکا ہوا تھا وہ آدمی بھی اسی قسم کا تھا۔''

''تم نے گھر جا کر اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا۔''

''کیا مطلب۔ تمہارے خیال میں میرا ہاتھ تبدیل ہو گیا تھا؟''

''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے گھر جا کر اپنے ہاتھ دھونے سے پہلے دیکھے تھے۔ ہاتھ پر کچھ لگا ہوا تھا؟''

نواز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کیا تم جادوگر ہو، تمہیں کیسے پتا چلا، ہاں میرے ہاتھ پر گریس قسم کی کوئی چیز لگی ہوئی تھی۔''

اکبر نے سکون کا سانس لیا اور سوچا۔ اس کا مطلب ہے میں صحیح راستے پر جا رہا ہوں، پھر اس نے نواز سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس اجنبی کو پہلے بھی دیکھا تھا؟''

''نہیں، میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا، لیکن شاید وہ ڈانگری میں ملبوس تھا۔ جیسی کہ ورکشاپ کے کارکن پہنے ہوتے ہیں۔ اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ بھی تھی جس سے اس کے چہرے کا نصف حصہ چھپا ہوا تھا۔''

''نواز تم ان لوگوں کے نام بتاؤ، جو تمہاری موت کے خواہاں ہوں۔''

''اس حوالات میں آ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا میری موت کی خواہاں ہے۔''

''نہیں نہیں، ایسا مت کہو۔ کم از کم میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مجھے تم ان لوگوں کے نام بتاؤ جو قتل کے جرم میں تمہیں پھنسا سکتے ہیں۔''

اکبر جب حوالات کے قریب سے ہٹا تو اس کی نوٹ بک میں چار نام درج تھے جو نواز نے بتائے تھے۔ تھانے کے سامنے ایک اسنیک بار میں بیٹھ کر اس نے کافی طلب کی اور پھر کافی کی چسکیاں لینے لگا، کافی ختم کر کے اس نے نوٹ بک نکالی اور اپنی دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے ویٹر اور نواز کے بتائے ہوئے ناموں کا موازنہ کیا اور یہ دیکھ

لرحیرت سے اچھل پڑا۔ دونوں کی فہرست میں ایک نام مشترکہ تھا اور وہ نام تھا کندن لال کا۔

☆☆☆

''اس آدمی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔'' چوہدری ولایت نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ ''اخبار والوں کو کوئی بات مل جائے تو وہ اس کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔''

اکبر جھکائی دے کر کانسٹیبل کی گرفت سے با آسانی نکل گیا۔ ''دیکھو چوہدری! میں مانتا ہوں کہ میں کوئی جاسوس نہیں اور نہ میں نے جاسوس بننے کی کوشش کی ہے، میں صرف حقائق معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میں نے پتا چلا لیا ہے کہ مدن لال کا قاتل کون ہے۔'' اکبر نے دوبارہ چوہدری کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو وا سے۔'' چوہدری نے کہا۔ ''میں بھی ذرا اس کی باتیں سن لوں، ہوسکتا ہے اس کی باتوں کا میری صحت پر کچھ اچھا اثر پڑے۔'' اس نے اپنی کرسی کی پشت پر سر ٹکا لیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں تو مسز اکبر اعظم کہاں ہے وہ قاتل؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اور نہ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں، لیکن اتنا ضروری جانتا ہوں کہ اس کا نام کندن لال ہے۔ وہ کئی قسم کے ناجائز کاروبار کرتا ہے۔ گزشتہ ماہ مدن لال نے اس کا ایک بڑا آرڈر منسوخ کر کے دوسرے سے وہ مال خرید لیا تھا۔''

''دلچسپ کہانی ہے۔'' ولایت مسکرایا۔ ''کندن لال کا حلیہ کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا، میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

چوہدری ولایت نے مسکرا کر اپنے ماتحت کی طرف دیکھا۔

''سنا تم نے، یہ نہ اس آدمی کا حلیہ بتا سکتا ہے، نہ اس کا کوئی اور اتا پتا معلوم ہے لیکن اس کو یقین ہے کہ مدن لال کا قاتل وہی ہے یعنی کندن لال۔ اگرچہ کراچی میں ہندوؤں اور عیسائیوں کی تعداد کم ہے لیکن پھر بھی سیکڑوں افراد ایسے ہوں گے جن کے نام کندن لال ہوں۔ میں نے واقعی ایک ماہ میں اس سے اچھا لطیفہ نہیں سنا۔''

''تم نواز کو صرف اس لیے مجرم قرار دے رہے ہو کہ ایک مگ پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ کیوں۔۔۔؟''

''اور تم کندن لال کو قاتل سمجھ رہے ہو جس کا تمہیں صرف نام معلوم ہے، ہمارے پاس نواز کی انگلیوں کے نشانات تو ہیں۔ تمہارے پاس تو اپنے دعوے کے حق میں کوئی ثبوت نہیں۔''

اکبر نے زور زور سے کہنا شروع کیا۔ ''چوہدری! یہ بھی تو دیکھو، یہ ایک انتقامی کارروائی بھی ہوسکتی ہے، مدن لال اس وقت کندن لال نامی شخص کے پاس کام کیا کرتا تھا جب خصوصی قسم کے گریس کی تیاری پر پابندی لگی ہوئی تھی پھر کسی نے کندن لال کے اس غیر قانونی کام کی اطلاع پولیس کو دے دی جس کے نتیجے میں کندن لال پکڑا گیا اور اسے سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ کندن لال یہی سمجھنے لگا کہ اس کی مخبری مدن لال نے کی ہے۔

اس پابندی کو ختم ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں اور یہ واقعہ کل رات کا ہے۔'' ولایت نے کہا۔

''انتقام لینے والے بیس سال بعد بھی انتقام لیتے ہیں۔''

''تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں، محض الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ قیاس آرائیاں ہیں، تمہیں ایسے آدمی نے بہکایا ہے جس پر قتل کا الزام ہے، ظاہر ہے کہ ڈوبنے والا تنکے کا سہارا بھی غنیمت سمجھتا ہے، اس کے علاوہ تم نے ایک ویٹر سے یہ بھی سن لیا ہے کہ اس کا مالک مدن لال انتہائی بے ہودہ شخص تھا اور اس کے بہت سے دشمن تھے اور اس کے دشمنوں میں سے ایک آدمی کندن لال بھی تھا۔ بس یہ دو باتیں تمہارے نزدیک بہت اہم ہیں اور تم لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے ہو، تمہارا خیال ہے کہ تم نے مجرم کا پتا چلا لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس شخص نے فنگر پرنٹس حاصل

کرنے کا نظام بنایا تھا اس نے ساری زندگی جھک ماری ہے۔ دیکھو! میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، فرض کرو میں تمہیں پسند نہیں کرتا، تمہیں اپنے ہاتھوں سے سزا دینا چاہتا ہوں، لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

اکبر نے ایک طویل سانس لی۔ ''اب میں تمہیں کس طرح قائل کروں۔''

''صرف اس طرح کہ تم اس آدمی کو پکڑ لاؤ اور اس سے اقبال جرم کرالو، پھر شاید میں تمہاری بات کی طرف سنجیدگی سے دھیان دے سکتا ہوں۔''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟'' اکبر بے بسی سے بولا۔

''تم پھر جاسکتے ہو۔''

☆☆☆

اکبر نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں گریس کا کاروبار کرنے والوں کی فہرست میں کندن لال نامی شخص کو تلاش کیا اور جب اس کا فون نمبر مل گیا تو اس نے ایک پبلک بوتھ سے کندن لال کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والے نے درشت لہجے میں ''ہیلو'' کہا۔

''میں کندن لال سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اکبر نے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تمہیں اس سے کیا کام ہے۔''

''وہ مجھے نہیں جانتا، لیکن کام نہایت ضروری ہے اور فوری نوعیت کا ہے۔''

''اچھا، ذرا انتظار کرو۔''

کچھ دیر بعد اکبر کو محسوس ہوا کہ کسی دوسرے نے ریسیور اٹھایا ہے تو اس نے پوچھا۔ ''کیا تم وہی کندن لال ہو جو گریس کا کاروبار کرتا ہے۔''

''ہاں، میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''کچھ نہیں، میں نے سوچا کہ میں شاید تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔ تم آج صبح ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ مدن لال کے اسنیک بار میں تھے؟''

''مدن لال کا اسنیک بار۔۔۔ یہ کہاں ہے؟''

''جہاں آج صبح گولی چلی تھی اور جب گولی چلی تو اس وقت تم کہاں تھے؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''پھر میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ میں آج صبح اس اسنیک بار میں جانے والا پہلا گاہک تھا، بس یوں سمجھ لو کہ بار کھلنے کے فوراً بعد میں اندر چلا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد میں واش روم چلا گیا پھر تم اندر داخل ہوئے۔ میں نے تمہیں اندر آتے ہوئے اور اسنیک بار کے مالک مدن لال پر گولی چلاتے دیکھ لیا تھا۔ یہ تمہاری سب سے بڑی غلطی تھی کہ تم نے اُس طرف دھیان نہیں دیا تھا کہ کوئی آدمی تمہیں واش روم کے دروازے سے جھانک رہا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' اس مرتبہ وہ آدمی بھڑک اٹھا تھا۔ ''جاؤ جا کر پولیس کو یہ بات بتادو۔''

''لیکن مصیبت یہ ہے کہ پولیس ایسی معلومات کا کوئی معاوضہ نہیں دیتی۔''

''اوہ۔۔۔ تم بلیک میلر ہو؟''

''میں پیشہ ور نہیں ہوں۔ بس ذرا آج کل بے روزگار ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ اتفاقاً مجھے جو معلومات حاصل ہوگئی ہیں ان سے کچھ فائدہ اٹھالوں۔''

وہ زور سے ہنس پڑا۔ ''تمہارا دل توڑتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیکن کیا کروں، یہی صورت حال اس جانب ہے۔''

''تم نے شاید اس بات پر یقین نہیں کیا ہے کہ میں وہاں موجود تھا۔ میں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔ تم ایک اور آدمی کے ساتھ آئے تھے۔ تم دونوں کاؤنٹر پر دائیں طرف آ کر کھڑے ہوگئے، تمہیں دیکھ کر مدن لال کھڑا ہوگیا تھا، پھر تم نے گولی چلادی۔ گولی چلانے کے بعد ایک گلاس کو دھویا گیا اور دوسرے کو۔۔۔'' اتنا کہہ کر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''کیا یہ کافی نہیں؟''

وہ آدمی خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر لائن پر خاموشی

ں پھر کندن لال کی آواز آئی۔ ''تمہارے ساتھ اور
لون ہے؟''

''کوئی نہیں، میں اکیلا ہوں۔'' اکبر نے جواب
یا۔

''ہوسکتا ہے تم نے دیکھ لیا ہو، لیکن تمہیں کیسے
ملوم ہوا کہ تم نے جس آدمی کو دیکھا تھا وہ میں ہی
ں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ آج میں تمام دن
ک مارتا رہا ہوں؟''

''ٹھیک ہے۔'' کندن لال کی آواز آئی۔ ''تم
نے گریس کا جو فارمولا بتایا ہے وہ مجھے پسند آیا۔ تم
ں فارمولے کا کیا لوگے؟''

''صرف پانچ لاکھ روپے۔''

''پانچ لاکھ تو بہت ہیں۔''

''فارمولا بھی تو زبردست ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کندن لال نے کہا۔ ''باہمی
ت چیت سے مسئلہ حل ہوسکتا ہے، میں صبح سویرے
ٹھ بجے ایمپائر ہیئر ڈریسر کے پاس شیو بنوانے جاتا
اں۔ تم وہاں آسانی سے آسکتے ہو۔ تم میری بات
ٰھ گئے۔''

''ہاں میں سمجھ گیا۔'' اکبر نے کہا۔ ''وہ اس
ت کندن لال پر جرح کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

☆☆☆

اسنیک بار میں داخل ہو کر اس نے ایک کافی کا
ڈر دیا، جب ویٹر کافی لے کر آیا تو اس نے پوچھا۔
''اسنیک بار کتنی دیر تک کھلا رہتا ہے؟''

''ابھی بیس منٹ تک تو کھلا رہے گا۔'' ویٹر نے
اب دیا۔

کافی پینے کے بعد اس نے اپنی گھڑی پر نظر
الی، دس منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے، اس نے سر گھما
روازے کی طرف دیکھا، کوئی نہیں آیا تھا۔ بار کی
تیاں ایک ایک کر کے بجھائی جارہی تھیں۔

ویٹر اس کے قریب آ کر بولا۔ ''جناب! بار بند
نے والا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور پھر پچاس روپے کا ایک نوٹ اسے دیتے ہوئے کچھ ہدایات دیں۔ ویٹر حیرت سے سنتا رہا اور سر ہلا کر اس کی تائید کرتا گیا۔

وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ کچھ دیر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ باہر کی ہوا اب سرد محسوس ہونے لگی تھی۔ اندھیرا ابھی تھا، وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ سڑک سے ذرا فاصلے ہی پر تھا کہ کسی نے اسے مخاطب کیا۔ ''آپ کے پاس ماچس ہوگی؟''

وہ ٹھٹک گیا۔ سامنے ہی ایک کار کھڑی تھی اور اس کی اگلی نشست پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا کار سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ماچس نکال کر اس آدمی کو دے دی۔ ماچس جلا کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لے کر بولا۔

''کیا بات ہے، تم بولتے کیوں نہیں؟''

''میں کیا بولوں، تم میری ماچس واپس دو۔''

اکبر سمجھ گیا کہ کھیل شروع ہو گیا ہے۔

وہ آدمی کار میں بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوا۔ ''کچھ تم ہی بولو۔''

''یہ وہی آدمی ہے۔'' کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ''میں نے اس کی آواز پہچان لی ہے، اسی نے فون کیا تھا۔''

''لو اپنی ماچس۔'' باہر کھڑے ہوئے شخص نے اسے ماچس دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب میرے خالی ہاتھ میں پستول ہے، خاموشی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔''

اکبر کندھے اچکا کر کار میں بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ اسے احساس ہوا کہ کار میں تیسرا شخص بھی ہے، اسے درمیان میں بٹھایا گیا تھا۔

اس کے بائیں طرف والے آدمی نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ایک فون کیا تھا کیا تمہیں اس کا نمبر یاد ہے؟''

''میں نے تو آج کئی ٹیلی فون کیے ہیں، تم کس

فون کی بات کر رہے ہو؟''

''تم خوف زدہ مت ہو، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گریس کے فارمولے کی بہت اچھی قیمت ملے گی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تم وہی شخص ہو جس کے پاس یہ فارمولا ہے؟''

''یہ بات کہاں جا کر معلوم ہوگی۔'' اکبر نے بڑے سکون سے پوچھا۔

''گھبراؤ نہیں، اس وقت ہم گریس کے ایک کارخانے کی طرف جا رہے ہیں، کیا تم نے کبھی گریس کا کوئی کارخانہ دیکھا ہے، بہت اچھی جگہ ہوتی ہے۔۔''

''تم اسے کیوں ڈرا رہے ہو۔'' تیسرے آدمی نے پہلی بار زبان کھولی۔

''نہیں یہ ڈرنے والا آدمی نہیں دکھائی دیتا۔'' اس سے ماچس مانگنے والے نے جواب دیا۔

کار کے اندھیرے میں کوئی سفید سی چمکتی ہوئی چیز اکبر کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اس نے اپنی گردن ایک طرف کو جھکا کر اس سے بچانا چاہا اور اس کے ساتھ ہی برابر والے کی سخت آواز آئی۔

''خاموشی سے بیٹھے رہو ورنہ آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' ساتھ ہی ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی اور پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

''کیا کر رہے ہو، مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا۔'' اکبر نے احتجاج کیا۔

''اسی لیے تو پٹی باندھی گئی ہے تاکہ کچھ نظر نہ آ سکے۔''

پھر کار چلتی رہی اور اکبر کو علم نہ ہو سکا کہ کار اب کس راستے پر جا رہی ہے۔ نصف گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کار ایک جگہ رکی اور اسے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ وہ آدمی اسے بازوؤں سے پکڑ کر کسی کمرے میں لے آئے، ایک آدمی اس کا بازو چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تو ایک آواز آئی۔ ''بیگی! تم باہر کار کے پاس ہی کھڑے رہو۔'' پھر اس کی آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اسی آواز نے حکم دیا۔

''اگر سب لوگ کمرے میں آ گئے ہیں تو روشنی کر دو۔''

اس کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی ہو گئی۔

ایک آدمی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اب ہم چاروں یہاں موجود ہیں، تمہارا کہنا ہے کہ تم نے ہم میں سے دو آدمیوں کو مدن لال کے اسنیک بار میں اسے قتل کرتے دیکھا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ ہم میں سے وہ کون ہیں؟''

اکبر جانتا تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار اس کے جواب پر ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد اپنی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ وقت دو، میری آنکھیں ابھی صاف صاف دیکھنے کے قابل نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ میں صبح سے چل پھر رہا ہوں آرام کیے بغیر، اس لیے تھکاوٹ اور آنکھوں پر پٹی باندھے رہنے کی وجہ سے مجھے صاف نہیں دکھائی دے رہا۔''

''اوہ۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''تم پورا یقین کر لینا چاہتے ہو۔''

اکبر نے یکے بعد دیگرے چاروں کو غور سے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''کیا بات ہے تمہاری یادداشت گم ہو گئی ہے۔'' ایک آدمی نے کہا۔

''نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم میں سے دو کون ہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ صحیح جواب دینا فائدہ مند بھی ہوگا یا نہیں۔''

سامنے کھڑے ہوئے چوتھے آدمی نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی، یہ ایک ایک ہزار کے نوٹوں کی گڈی تھی اور اس میں پچاس نوٹ ضرور ہوں گے۔'' پھر اس آدمی نے وہ گڈی اکبر کی طرف پھینک دی۔

اکبر نے گڈی لے کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ دو آدمی جو آج صبح مدن لال کے اسنیک بار میں گئے تھے اور اسے قتل کیا تھا۔ وہ تم دونوں تھے۔'' اس نے انگلی سے سامنے کھڑے ہوئے دوسرے اور چوتھے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ پھر وہ آدمی جس نے نوٹ نکال کر دیے تھے ایک گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''جواب غلط ہے۔'' پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔ ''یہ درست ہے کہ ہم دونوں ہی تھے اور اسی لیے یہ جواب غلط ہے۔ اگر تم غلط آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے تو ہم یہ سمجھتے کہ تم محض اندازے کی بنا پر یہ بات کر رہے ہو اور اس صورت میں تمہارے بچنے کا امکان تھا لیکن تم نے صحیح نشان دہی کر کے اپنی موت کے بلیک وارنٹ پر خود دستخط کیے ہیں اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے، بہرحال تمہیں جو رقم دی گئی ہے وہ تمہاری ہی رہے گی اور تم دوسری دنیا میں اسے خرچ کر سکو گے۔'' اتنا کہہ کر اس آدمی نے ریوالور نکال لیا اور دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر اکبر کو آگے دھکیلنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

''خبردار۔۔۔!'' دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ ''اسے چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔''

کندن لال نے جو اکبر کا بازو پکڑے ہوئے تھا جلدی سے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور اپنے ریوالور سے اس جانب فائر کر دیا اور پھر دوڑ کر ایک صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔ اکبر نے نووارد کی آواز پہچان لی تھی۔

چوہدری ولایت اندھیرے سے نکل کر کمرے کی روشنی میں آ گیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔ ''اپنے ہتھیار ڈال دو۔۔۔ پولیس۔۔۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ان چاروں نے ہتھیار ڈال دیے اور ہاتھ اٹھا کر سامنے آ گئے۔

''تم ٹھیک ہو۔'' چوہدری نے اکبر سے پوچھا۔

''ہاں، بالکل ٹھیک ہوں۔'' اکبر نے جواب دیا۔ ''کیا تم نے کندن لال کی ساری باتیں سن لی ہیں۔''

''ہاں سن لی ہیں اور اس کی ساری باتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔'' چوہدری نے جواب دیا۔

مسکراہٹیں

سروے کرنے والے ایک صاحب نے ایک سرکاری دفتر کے انچارج سے پوچھا۔

''آپ کے ہاں کتنے آدمی کام کرتے ہیں۔؟''

انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر جواب دیا۔ ''سو میں سے دو تین۔''

☆☆☆

شام کے اخبار کے ایڈیٹر نے نہایت پریشانی کے عالم میں رپورٹر سے کہا۔

''اخبار کے پریس میں جانے کا وقت قریب آ گیا ہے اور ابھی تک شہر میں کوئی ایسا سنسنی خیز جرم نہیں ہوا جس کی مزے دار سی ہیڈ لائن لگائی جا سکے۔'' آپ فکر نہ کریں سر! کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔'' رپورٹر نے انہیں تسلی۔ ''فطرت انسانی پر میرا یقین بہت مضبوط ہے۔''

☆☆☆

کثرت شراب نوشی کے الزام میں گرفتار ہونے والے ایک شخص نے لاس اینجلس کی عدالت میں مؤقف اختیار کیا کہ اسے طبی بنیادوں پر معافی دے جائے۔ اس سے جب اس کی وضاحت چاہی گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اسے بھڑ کے کاٹنے پر وہسکی لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہسکی باہر کے بجائے اندر سے بہتر اثر کرے گی۔ چنانچہ وہ تکلیف دور ہونے کے انتظار میں پیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

عقلمندی کی بات

راز کو راز رکھنا بڑی ذہانت اور عقلمندی کی بات ہے۔ لیکن اُمید رکھنا کہ دوسرے بھی اس راز کو راز میں رکھیں گے۔ سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔

''میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میں انسان ہوں کوئی فلمی ہیرو نہیں، میرے اعصاب جواب دیتے جارہے ہیں۔''

''تم نے بڑا خطرہ مول لیا تھا'' چوہدری نے اعتراف کیا۔

''مجھے یہ خطرہ تو لینا ہی تھا۔ مجھے امید تھی کہ ویٹر نے میری ہدایت پر عمل کیا ہوگا۔ میں تمہیں اس وقت تک فون نہیں کرنا چاہتا تھا، جب تک مجھے مکمل یقین نہیں ہو جاتا کیونکہ اس کے بغیر تم میری بات نہیں مانتے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں ثبوت کے بغیر تمہاری بات نہیں مانتا۔''

''میں جب بار کے دروازے پر آ کر کھڑا ہوا تو مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ بار کے باہر کچھ لوگ میرے منتظر ہیں پھر میں نے فوراً اپنی نوٹ بک کے ایک صفحے پر تمہارے نام ایک پیغام لکھا اور کندن لال کا پتا لکھ کر اسے ویٹر کو دے دیا۔''

''ہاں، تمہارے جانے کے بعد جب ویٹر نے تمہارا پیغام دیا تو میں جلدی سے دروازے پر آیا۔ اس وقت تک کار تمہیں لے کر روانہ ہو چکی تھی لیکن ویٹر نے کار کی عقبی روشنی میں کار کا نمبر دیکھ لیا تھا، پھر اس نے مجھے فوراً اطلاع دی اور میں نے وائرلیس کے ذریعے پولیس کی تمام گشتی کاروں کو پیغامات دیے کہ وہ اس کار کا تعاقب کریں اور مجھے مسلسل اطلاع دیتے رہیں۔ چنانچہ اس طرح میں یہاں بروقت پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔'' پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ واپس چلتے ہیں۔ نواز تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے بے چین ہے۔''

راستے میں اکبر نے چوہدری ولایت سے پوچھا۔ ''کیا ان لوگوں سے تفتیش بھی کی جائے گی۔''

''ہاں تفتیش تو لازماً ہوگی، لیکن اصل مسئلہ تو ان کی مع ثبوت گرفتاری کا تھا۔ میں نے ان چاروں کو اس سے قبل نہیں دیکھا، ان کے پرس میں کوئی ریکارڈ نہیں، دراصل یہ ایک تیر سے دو شکار کا کیس ہے۔ کندن لال بہت دنوں سے نواز سے دشمنی رکھتا تھا اس کے بعد ایسا ہوا کہ مدن لال نے اپنا ایک آرڈر منسوخ کر دیا۔ جس کی وجہ سے کندن کو نقصان اٹھانا پڑا اب وہ مدن کا بھی دشمن ہو گیا پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی ایسا منصوبہ بنایا جائے کہ وہ دونوں سے بیک وقت انتقام لے سکے، اس نے اپنے ایک آدمی کے دستانے پر گریس لگوایا۔ اس کے بعد اس آدمی نے دستانہ پہن کر نواز سے زبردستی ہاتھ ملایا۔ نواز کی انگلیوں کے نشانات دستانے پر آ گئے پھر کندن اس دستانے کو لے کر بار میں آیا اور اس نے دو مگ کافی منگوائے اور ایک مگ کو اس دستانے سے پکڑ لیا جس پر نواز کی انگلیوں کے نشانات تھے اور پھر یہ نشانات بڑی صفائی کے ساتھ کافی کے مگ پر آ گئے پھر اس نے مدن کو قتل کیا، اطمینان سے اپنے گلاس کو صاف کیا اور چلا آیا۔ ہمیں مگ پر نواز کی انگلیوں کے نشانات ملے اس لیے نواز کو گرفتار کر لیا گیا۔

اکبر ہنس پڑا۔ ''میں نے تمہیں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ مدن کے اسنیک بار میں ایک مگ کہیں باہر سے لایا گیا ہے، لیکن تم نے میری ایک نہ سنی۔''

چوہدری نے قہقہہ لگایا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں اخبار کی نوکری چھوڑ کر اب پولیس میں بھرتی ہو جانا چاہیے۔ تم بہترین جاسوس ثابت ہو سکتے ہو۔''

اکبر نے بھی جواب میں قہقہہ لگایا پھر کہا۔ ''مجھے اخبار نویس ہی رہنے دیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، مجھے اپنے اخبار کو خبر بھی دینی ہے۔ میرا ایڈیٹر جلاد قسم کا ہے۔''

اکبر دفتر پہنچا تو سٹی پیج کا ایڈیٹر عباس علی اس کے انتظار میں غصے سے سرخ بیٹھا تھا لیکن جب اکبر نے اپنی کارکردگی بیان کی تو پوری سروس میں وہ پہلی بار اس سے خوش نظر آیا اور نہایت خلوص سے بولا۔ ''گڈ، ویری گڈ۔۔! میں آج ہی تمہاری ترقی کی سفارش کروں گا۔''

واردات

آر کے ثناگر

کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے جس کے بعد محب اپنے محبوب کا دیوانہ ہو کر عقل کا دامن چھوڑ بیٹھتا ہے۔ کوئی نصیحت، کوئی رکاوٹ یا کوئی آزمائش اس کے ارادوں کو کمزور نہیں بنا سکتی مگر کبھی کبھی ایسی محبت کو بھی شک سے دوچار ہونا پڑ جاتا ہے

سچے جذبوں کو جھوٹے سکوں میں تولنے والے ماہر بیوپاریوں کا قصہ

اس سے پہلے کہ علی کی حیرانی کا سلسلہ تھمتا، یہ کن کر تو اس کے ہوش ہی اڑ گئے کہ اس کے گھر میں کام کرنے والی معمولی سی نوکرانی کی بیٹی اے لیول کر رہی ہے۔ اس نے یہ سنا تھا کہ غریبوں کے بچے بھی پڑھ لکھ جاتے ہیں لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ کسی مہنگے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اس کے مالی کا بیٹا بھی پڑھتا تھا لیکن سرکاری اسکول میں۔

یہ نئی نوکرانی اس کے گھر میں دو ماہ پہلے آئی تھی۔ آج تک بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ آج وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ نوکرانی سے بات کرنے بیٹھ گیا اور پھر حیرتیں اس کے سامنے دامن پھیلاتی چلی گئیں۔ یہ نوکرانی جس علاقے میں رہتی تھی وہاں کوئی جھونپڑی تو ہو نہیں سکتی تھی۔ یقیناً وہ پکے مکان میں رہتی ہوگی۔ اس کا شوہر بھی سرکاری افسر تھا۔ فالج کے حملے کے بعد گھر میں پڑا رہتا ہے۔ وہ خود بھی تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی اور جب اس نے

یہ سنا کہ اس کی بیٹی اے لیول کر رہی ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ ایک نوکرانی اپنی بیٹی کو انگریزی اسکول میں پڑھا رہا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم اس کی تعلیم کے اخراجات کیسے برداشت کرتی ہو گی۔''

''اسی کے لیے تو محنت کرتی ہوں۔''

''پھر بھی ڈیڈی تمہیں اتنی تنخواہ نہیں دیتے کہ تم پرائیویٹ اسکول کی فیس وغیرہ ادا کر سکو۔''

''کچھ پیسے بھی ہیں جو بینک میں رکھے ہیں۔ اس کا منافع آتا ہے۔''

''تم اس رقم سے کوئی کاروبار وغیرہ بھی تو کر سکتی تھیں۔''

''کوئی کاروبار کرنا مجھ جاہل کے بس کا تھا۔'' وہ ہنسنے لگی۔ ''اب عارفہ پڑھ لکھ جائے گی تو وہی کچھ کرے گی۔''

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ علی کے ڈیڈی اوپر کی منزل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر نوکرانی اپنے کام میں مشغول ہو گئی

''ہیلو علی!''

''ہیلو ڈیڈی!''

''اب تم نوکروں کے پاس بیٹھ کر بھی اپنا وقت ضائع کرنے لگے۔''

''ڈیڈی! آپ کو معلوم ہے اس کی بیٹی اے لیول کر رہی ہے۔''

''مجھے یہ سب معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ کام کرنے والی عورت پر ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔

ڈرائیور ان کا بریف کیس گاڑی میں رکھ چکا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھے اور چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔

علی نے کار کے اسٹارٹ ہونے اور روانہ ہونے کی آواز سنی اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اسے اپنے باپ کے رویے پر تعجب ہو رہا تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈیڈی اس خبر کو سنتے ہی حیرت میں پڑ جائیں گے۔ نوکرانی کو شاباشی دیں گے اور شاید اس کی تنخواہ بھی بڑھا دیں لیکن انہوں نے تو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ وہ ڈیڈی جو میری اور مسکان کی تعلیم کے لیے ہر وقت فکر مند رہتے ہیں، کسی غریب لڑکی کی تعلیم کا سن کر خوش بھی نہیں ہوئے۔ اسے اس نوکرانی سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھنی تھیں لیکن اس وقت ماحول کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ اسے خاموش ہونا پڑا۔

اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی تھی لیکن اسے یہ تجسس ضرور ہو گیا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور اتنی کم آمدنی میں اپنی بیٹی کو ایسی شان دار تعلیم کیسے دلوا رہی ہے۔ اپنی فطری رحم دلی کی وجہ سے وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی عورت کی تو مدد کرنی چاہیے۔ اس نے سوچا، ڈیڈی سے تو کوئی بات کرنا بے کار ہے۔ ممی سے بات کر کے دیکھوں گا۔ اسے یونیورسٹی جانا تھا اور اس کی ممی دوپہر سے پہلے اٹھنے والی نہیں تھیں۔ ملازم نے ناشتا لا کر علی پر رکھ دیا تھا۔ اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور بائیک اٹھا کر یونیورسٹی کے لیے روانہ ہو گیا۔

وہ یونیورسٹی سے واپس آیا تو صرف مسکان سے ملاقات ہو سکی۔

''ممی کہاں ہیں؟''

''کہیں گئی ہیں۔ شاید بیگم سلمان کی طرف گئی ہوں گی۔''

''اور تم کہاں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہو؟''

''یہ تم نے پولیس والوں کی طرح پوچھ گچھ کرنی کب سے شروع کر دی ہے۔''

''یونہی پوچھ رہا تھا۔ تم اتنی جلدی چڑ کیوں جاتی ہو۔''

''چڑنے کی بات ہے۔ تم کہیں جاتے ہو تو میں تم سے پوچھتی ہوں۔''

''میں لڑکا ہوں، میں کہیں بھی جاؤں۔ میری بات اور ہے۔''

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ اتنا پڑھ لکھ کر بھی لڑکے اور لڑکی میں فرق کرتے ہو۔ ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں کہ تم میں مڈل کلاس کی روح ہے۔'' مسکان نے کہا اور پرس اٹھا کر چل دی۔

وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ممی سے نوکرانی کی تنخواہ بڑھانے کی بات کرے گا۔ ممی نہیں تھیں تو مسکان ہی کو اپنا ہم خیال بنا لیتا لیکن یہاں تو باتیں ہی دوسری چھڑ گئی تھیں۔

وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ملازم اس کے لیے چائے لے کر آ رہا تھا

''حمیدہ کہاں ہے۔'' اس نے نوکرانی کے بارے میں پوچھا۔

''وہ تو بیگم صاحبہ سے چھٹی لے کر دوپہر ہی کو چلی گئی تھی۔

اس نے سوچا تھا موقع اچھا ہے۔ گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ وہ حمیدہ سے کچھ اور باتیں پوچھ سکے گا لیکن اب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ چائے پی کر میں سو جاؤں گا۔ کوئی آئے تو مجھے اٹھانا مت۔''

''جی، اچھا۔''

اس نے چائے پی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کتنی ہی دیر تک اسے حمیدہ کا خیال آتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کی بیٹی کا خیال آیا۔ دیکھوں تو سہی، ایک معمولی نوکرانی کی بیٹی انگریزی بولتی ہوئی کیسی لگتی ہے پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ وہ حمیدہ کی مدد حمیدہ کی وجہ سے کرنا چاہتا ہے یا اس کی بیٹی کی وجہ سے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سو کر اٹھا تو شام گہری ہو گئی تھی۔ اس نے وارڈ روب سے کپڑے نکالے اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔

اس دوران میں نہ جانے وہ کیوں یہ طے کر چکا تھا کہ امی یا ڈیڈی سے کوئی تذکرہ نہیں کرے گا۔ کسی کا مذاق اڑوانے کا کیا فائدہ۔ اسے معلوم تھا، جواب میں وہ سب کیا کہیں گے۔

وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے۔ کھانا چنا جا چکا تھا۔

''علی! تم کچھ زیادہ آرام طلب نہیں ہو گئے ہو۔'' اس کے ڈیڈی نے کہا۔

''بس ڈیڈی، ذرا تھک گیا تھا لہٰذا سو گیا۔''

''کیا غریب نوجوانوں کی طرح گھر میں پڑے رہتے ہو۔ فریش ہونے کے لیے گھر سے باہر بھی نکلا کرو۔''

''یونیورسٹی جاتا تو ہوں۔''

''ارے ہاں، کیسی چل رہی ہے تمہاری پڑھائی۔''

''ٹھیک چل رہی ہے ڈیڈی!''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہاں کچھ نہیں رکھا ہے۔ امریکا، لندن کہیں بھی جا کر تعلیم حاصل کرو۔ کسی قابل بن جاؤ گے مگر تم مانے ہی نہیں۔ میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ فارن سے ڈگری لے کر آؤ۔''

''جب میں وہی تعلیم اپنے ملک میں حاصل کر سکتا ہوں تو کسی دوسرے ملک کیوں جاؤں۔''

''یہاں کوئی بھی چیز قاعدے کی ہے جو تعلیم قاعدے کی ہو گی۔''

''ڈیڈی! یہ تو ہمارا احساس کمتری ہے جو ہم اپنے ملک کے سونے کو مٹی سمجھ لیتے ہیں ورنہ کتنے ہی لوگ ہیں جو باہر جا کر تعلیم حاصل نہیں کرتے لیکن بڑے بڑے کارنامے انجام دے لیتے ہیں۔''

''بھئی یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو باہر جانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میں تو تمہارے اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔''

''جتنی دولت آپ مجھ پر خرچ کریں گے اس سے کتنے غریب بچوں کی تعلیم مکمل ہو سکتی ہے۔''

''میں تمہارے لیے کماتا ہوں۔ پوری دنیا کا ٹھیکا نہیں لیا ہے میں نے۔''

''ممی تو بہت بڑی سوشل ورکر ہیں۔ انہیں تو

اس رخ پر سوچنا چاہیے۔''

''تم اپنی باتوں میں مجھے کیوں گھسیٹتے ہو۔'' اس کی ممی نے کہا۔

''میں تو آپ کی توجہ دلا رہا تھا۔ اب یہی دیکھ لیجیے حمیدہ کی بیٹی ہے۔ نوکرانی کی بیٹی ہوتے ہوئے اے لیول کر رہی ہے۔ اسے اگر مالی سہارا مل جائے تو وہ کتنی ترقی کر سکتی ہے۔ اپنی ماں کو گھروں میں کام کرنے سے نجات دلا سکتی ہے۔''

''یہ صبح سے تمہیں نوکرانی کی فکر کیوں لاحق ہو گئی ہے۔ تم صبح بھی اس کا ذکر لے کر بیٹھ گئے تھے۔'' اس کی ڈیڈی نے کہا۔

وہ یہ ذکر اس وقت کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن جذبات سے مغلوب ہو کر یہ ذکر لے بیٹھا اور اب ممی اور مسکان سمیت سب اسے عجیب عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔

''ایک تو ان غریب لوگوں کو جھوٹ بولنے کی بہت عادت ہوتی ہے۔'' مسکان نے کہا۔

''اگر اے لیول کر بھی رہی ہے تو کون سا تیر مار رہی ہے۔'' اس کی ممی نے کہا۔ ''نوکری ڈھونڈنے تو اسے ہمارے ہی پاس بھیجے گی۔''

''یہ اس کا حق ہوگا۔ ہم اسے نوکری دیں گے تو خیرات نہیں دیں گے۔''

وہ کھانا کھانے بیٹھا تھا مگر موڈ ایسا خراب ہوا کہ بھوکے پیٹ ہی اٹھنا پڑا۔

اس کے اٹھ جانے کے بعد بھی دیر تک اس کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب یہ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ یہ لڑکا ان کی فیملی میں ایڈجسٹ کیسے کرے گا۔ رہتا کوٹھی میں ہے، ذہنیت جھگی والوں کی ہے۔''

''صبح مجھ سے بھی کہہ رہا تھا کہ لڑکے اور لڑکی میں فرق ہوتا ہے اور میں جب جاؤں اسے بتا کر جاؤں۔'' مسکان نے کہا۔

''اچھا، یہ کہہ رہا تھا۔ اب تو حد ہو گئی۔ کیوں ظفر!'' اس کی ممی نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو خود پریشان ہوں۔ سوچتا ہوں، اس کی تعلیم مکمل ہو جائے تو اسے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لوں۔''

''یہ غلطی مت کرنا۔ ساری دولت غریبوں میں بانٹ دے گا۔'' اس کی ممانے کہا اور مسکان ہنسے بغیر نہیں رہ سکی۔

علی عموماً گھر سے نہیں نکلتا تھا اور خصوصاً رات کے وقت لیکن اس وقت وہ ایسا بدمزا ہو گیا تھا کہ گھبرا کر گھر سے نکل گیا۔

وہ رات کو گھر لوٹا تو ممی، ڈیڈی اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ مسکان اپنے کمرے میں کوئی مووی دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

وہ صبح اپنے کمرے سے نکلا تو حمیدہ حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''تم بھی پڑھی لکھی ہو؟''

''پڑھی لکھی ہوتی تو تمہارے گھر میں کام کر رہی ہوتی۔''

''تمہارے میاں سرکاری افسر تھے اور تم۔۔۔''

''خاندان میں ایسی ہی شادیاں ہوتی تھیں۔ ہم گاؤں کے لوگ ہیں۔ میرے میاں نے جب پڑھ لکھ کر شہر میں نوکری کر لی تو انہیں ایک سے ایک لڑکی مل سکتی تھی لیکن مجھ ہی سے شادی کرنی پڑی۔''

''تمہاری یہ ایک ہی بیٹی ہے یا اور بھی بچے ہیں۔''

''یہ ایک ہی ہے۔''

''نام کیا ہے اس کا؟''

''میرا نام حمیدہ تھا تو اس کا نام رشیدہ رکھ دیا۔''

''ویسے تمہاری بہت اہمیت ہے کہ تم اسے پڑھا رہی ہو۔''

''علی بابو! کسی دن ہمارے گھر آؤ نا۔ تمہیں دیکھ کر ذرا اس کا حوصلہ بڑھے گا۔''

''میں تو تم سے خود یہی کہنے والا تھا کہ لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں تو خود اسے شاباش دینا

چاہتا ہوں۔''

''اس میں ہمت کی کون سی بات ہے۔ آپ تو مالک ہیں اس کے۔ جب چاہیں آسکتے ہیں۔''

''ایک شرط پر۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔''

''دراصل ڈیڈی کو غریبوں سے بات کرنا پسند نہیں۔''

''مجھے معلوم ہے اسی لیے تو میں آپ سے اتنی بات بھی کر لیتی ہوں۔''

''ہم رشیدہ کے کام آئیں گے۔ ضرورت ہوا کرے تو مانگ بھی لیا کرنا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''اب ڈیڈی کے آفس جانے کا وقت ہو گیا ہے لہٰذا میں چلتا ہوں۔''

اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور حمیدہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

علی کو یونیورسٹی جانا تھا۔ وہ تیار ہو کر باہر نکلا۔ اکیلے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ مسکان آج بھی کالج جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے سو رہی تھی۔

''میں آج شام کو تمہارے گھر آؤں گا۔'' اس نے حمیدہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

یونیورسٹی سے آنے کے بعد اس نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر حمیدہ کے گھر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ اس وقت تک حمیدہ بھی اپنے گھر جا چکی تھی۔

''علی! آج کسی خاص مہم پر جا رہے ہو۔'' مسکان نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''جتنے پرفیومز گھر میں تھے، سب اپنے اوپر انڈیل لیے ہیں۔''

''تم چپ رہو۔ میں تمہیں بھی جا رہا ہوں، تم سے مطلب۔''

''ایک نہ ایک دن تو ہمیں پتا چل ہی جائے گا۔''

''ایک دوست کی سالگرہ ہے، وہاں جا رہا ہوں۔''

''یہ دوست لڑکی ہے یا لڑکا۔''

''میں لڑکیوں سے دوستی نہیں رکھتا۔''

''عجیب لڑکے ہو۔'' مسکان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

علی نے اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے اپنی تیاری ادھوری چھوڑی اور کمرے سے نکل گیا۔ ٹی وی لاؤنج میں اس کی مما بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ دراصل وہ کہیں آتا جاتا نہیں تھا اس لیے سب ہی کو حیرت ہو رہی تھی۔

پہلے اس نے سوچا، شام کا وقت ہے کار لے جانا چاہیے لیکن پھر اس نے سوچا، کار پر جانا اپنی امارت کا ظاہر کرنا ہوگا۔ اس نے بائیک سنبھالی اور روانہ ہو گیا۔

پتا اس کی جیب میں تھا اور وہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا جہاں وہ اس وقت جا رہا تھا۔

اس علاقے میں پہنچنے کے بعد حمیدہ کا گھر تلاش کرنے میں اسے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اوسط درجے کے اس علاقے کے کئی خوب صورت مکانوں کے درمیان یہ ایک سادہ سا مکان تھا۔

حمیدہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ دستک دیتے ہی وہ دروازے پر آ گئی اور بڑی عزت سے اسے اندر لے کر گئی۔ سادہ سا ڈرائنگ روم تھا لیکن بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

''یہ گھر آپ کے لائق نہیں ہے جی پھر بھی آپ آئے۔ آپ نے ہمیں عزت بخشی بس یہ سمجھیے میں نے آپ کو پلکوں پر بٹھایا ہے، آنکھوں میں جگہ دی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو حمیدہ۔ سب انسان اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔''

''وہ تو ہے جی لیکن پھر انسانوں انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔''

''یہ فرق خود ہمارا بنایا ہوا ہے۔ میں تو کوئی فرق

نہیں سمجھتا۔ ہاں میرے گھر والوں کی بات اور ہے۔''

''آپ کی یہی تو خوبی ہے جو آپ کو بہت ترقی دلائے گی۔ آپ نے ایک ہزار روپے سے میری مدد کی۔ رشیدہ تو آپ کے لیے دعا کر کے بیٹھی ہے۔ آپ بیٹھیے، میں اسے بتاتی ہوں کہ آپ آئے ہیں۔ سنے گی تو پاگل ہو جائے گی۔''

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ لوٹ کر آئی تو رشیدہ اس کے ساتھ تھی۔ ایسی خوب صورت لڑکی بھی اس گھر میں ہو سکتی ہے، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے کھلے ہوئے کمر سے نیچے بال، چراغ سی آنکھیں۔ آنکھوں پر پلکوں کی جھالر۔ ہونٹ جیسے گلاب کی پتیاں۔ قد نکلتا ہوا، چھریرا بدن۔ کیا تھا جو اس کے پاس نہیں تھا۔ ایسا حسن تو اس نے ہزار گز کی کوٹھیوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی حیرتوں میں ایک حیرت کا اور اضافہ ہو گیا۔

''سلام کرو علی صاحب کو یا بس یونہی کھڑی رہے گی۔'' حمیدہ نے کہا۔

''ہیلو، علی صاحب کیسے ہیں۔ اماں نے آپ کا ذکر کیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ اتنی جلدی آ بھی جائیں گے۔''

''میرے لیے تعجب کی بات یہ تھی کہ لوگ وسائل نہ ہونے کے باوجود کس طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ بس یہی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔''

''یہ سب اماں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ویسے میں نے اتنا بڑا تیر بھی نہیں مارا ہے کہ آپ کو حیرت ہو۔''

''مجھے تو حیرت ہوئی تھی۔ اب آپ چاہے اسے اہمیت نہ دیں۔''

''تم بیٹھ کر علی صاحب سے باتیں کرو۔ میں ابھی آئی۔'' حمیدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

''آپ تو یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔''

''ہاں۔''

''کبھی کبھی فرصت ملا کرے تو یہاں آ جایا کریں مجھے پڑھا دیا کریں۔''

''مجھے تو فرصت ہی فرصت ہے لیکن تمہاری اماں کہیں گی، یہ روز ہی آنے لگا۔''

''کچھ نہیں کہیں گی بلکہ انہیں تو خوشی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے، آ جایا کروں گا لیکن صرف ٹیوشن پڑھانے کو۔''

''پھر۔۔۔''

''تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو۔''

''ابھی آپ نے میری باتیں سنی ہی کہاں ہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ روز آؤں گا تو بہت سی باتیں سنوں گا۔''

''آپ تو اتنی اچھی اچھی باتیں سنتے ہوں گے۔ میری باتیں آپ کو کیا اچھی لگیں گی۔''

''تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں گھر سے بہت کم ہی نکلتا ہوں۔ یہاں بھی بس چلا ہی آیا۔''

''کمال ہے۔۔۔ آپ جیسے بڑے لوگوں کی شامیں تو بڑی رنگین ہوتی ہیں۔''

''تم نے ٹھیک کہا لیکن مجھے ان رنگینیوں سے نفرت ہے۔''

''میں حیرت کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں۔''

''تم اور کچھ بھی کر سکتی ہو۔''

''وہ کیا؟''

''میرے کہنے کا یقین۔''

رشیدہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ یوں ہنسی جیسے ویرانے میں بہار آ جائے جیسے کوئی کلی کسی کے سامنے اچانک پھول بن جائے۔

اسی وقت حمیدہ ایک ٹرے میں چائے اور کھانے کی کچھ چیزیں لے کر کمرے میں داخل ہوئی

''کیا باتیں ہو رہی ہیں علی صاحب سے۔''

''اماں، یہ مجھے پڑھانے آیا کریں گے۔''

''اس سے اچھی اور کیا بات ہو گی۔ اب تو بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے گی۔''

''یہ آپ اتنی ڈھیر ساری چیزیں کیوں لے آئیں۔ خالی چائے بہت تھی۔'' علی نے کہا۔

"مالک! یہ سب آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔"
"تم بار بار کیوں شرمندہ کر رہی ہو۔"
"میں آپ جیسے مالک کی نوکرانی ہوں۔ یہ یاد رکھنا تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔"
"اماں! تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ علی صاحب آپ چائے پئیں۔"
علی سر جھکا کر چائے پینے لگا۔ رشیدہ اس کا دھیان بٹانے کے لیے مستقل باتیں کیے جا رہی تھی لیکن اب وہ خاموش تھا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کیا سوچنے لگے علی صاحب۔" رشیدہ نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" علی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "سوچ رہا تھا آپ لوگ کتنے عظیم ہیں۔"
"بس اتنی سی بات سوچنے کے لیے اتنی دیر سے چپ تھے۔" رشیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
"کیا میں تمہارے شوہر سے مل سکتا ہوں۔" علی نے حمیدہ سے کہا۔
"ہاں، کیوں نہیں۔ وہ یہاں آ نہیں سکتے اس لیے آپ کو دوسرے کمرے میں چلنا پڑے گا۔"
"اس میں کیا حرج ہے۔" علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرے میں ایک آدمی مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ قریب ہی دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔
"یہ سیٹھ ظفر کا بیٹا ہے علی جہاں میں کام کرتی ہوں۔ آپ سے ملنے آیا ہے۔" حمیدہ نے اس آدمی سے کہا۔

اس آدمی نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ایک پھیکی ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔
"بس، یہ حال ہے ان کا۔"
"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔" علی نے پوچھا۔
"ہر جگہ علاج کرا کے دیکھ لیا۔ اب تو ڈاکٹر بھی مایوس ہو گئے ہیں۔"

علی کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر حمیدہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔
وہ حمیدہ کے گھر سے نکلا تو عجیب پر مسرت احساسات میں گرفتار تھا۔ وہ یہاں ایک ایسی ذہین طالبہ سے ملنے آیا تھا جو ایک معمولی نوکرانی کی بیٹی ہے لیکن ایک حسین ترین لڑکی سے مل کر جا رہا تھا۔ ہمدردی کے جذبات سے لبریز تھا۔ رشیدہ کی ہنسی، اس کی باتیں، اس کا حسن اسے یاد آ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی سے روز مل سکے گا، یہ خیال ہی اسے سرشار کیے دے رہا تھا۔ مجھے اس گھر میں دوبارہ آنے کے لیے کتنی ہمت کرنی پڑتی لیکن اب اس نے خود ہی موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس کی ماں میرے گھر میں ملازمت کرتی ہے۔ اسے میری محبت پر کیا اعتراض ہوگا۔ اسے تو فخر ہوگا کہ مجھ جیسا دولت مند باپ کا بیٹا اس سے محبت کرتا ہے۔ اسے پہلی مرتبہ اپنے دولت مند ہونے پر فخر ہوا۔ میں اپنی دولت سے اگر ان کی ضرورتیں پوری کروں گا تو وہ سب میرے پرستار ہو جائیں گے۔ حمیدہ اپنی آنکھیں بند رکھے گی کیونکہ میں اس کے مالک کا بیٹا ہوں۔
وہ گھر پہنچا تو گھر کے سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ ممی اور ڈیڈی کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ مسکان اپنے کمرے میں بند تھی۔ کوئی یہ پوچھنے والا بھی نہیں تھا، تم کہاں گئے تھے، کہاں سے آ رہے ہو۔ وہ سوچنے لگا اتنی دولت کے ہوتے ہوئے اس گھر میں خوشیوں کی کتنی قلت ہے۔ کل چار آدمی ہیں اور وہ بھی مل کر نہیں بیٹھتے۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ رشیدہ کے گھر میں کتنی رونق تھی۔ رشیدہ کے چہرے پر کیسی سچی خوشی تھی۔ اسے وہاں کتنی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہاں تو نوکروں کے سوا کوئی اس کی عزت ہی نہیں کرتا۔ اس گھر کے مکین ایک ساتھ بیٹھتے بھی ہیں تو غیروں کی طرح۔ دولت کی طرح ہنسی کو بھی بچا بچا کر رکھتے ہیں۔
وہ بھی دوسروں کی طرح اپنے کمرے میں بند ہو گیا مگر آج کمرے کی کئی کھڑکیاں رشیدہ کے گھر کی

طرف کھل گئی تھیں۔ وہ بڑی دیر تک اپنے کمرے میں رشیدہ کی ہنسی دیکھتا اور سنتا رہا۔ زندگی اسے اتنی خوب صورت کبھی نہیں لگی تھی، جتنی آج محسوس ہو رہی تھی۔

دوسرے دن شام ہوتے ہی وہ پھر تیار ہونے لگا۔

''علی! یہ تمہارا دوست کتنے دن میں پیدا ہوا تھا کہ روز اس کی سالگرہ ہوتی ہے۔ کل بھی تم سالگرہ میں گئے تھے۔ کیا آج بھی۔'' مکان نے کہا۔

''ہاں آج بھی۔ جب کسی کا دل اس گھر میں نہیں لگتا۔ اڑے اڑے پھرتے ہیں تو میں کیوں گھر میں رہوں؟''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ آخر تمہیں بھی عقل آ گئی۔ ویسے کوئی اور بات ہو تو مجھے ضرور بتانا۔''

اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور رشیدہ کے گھر پہنچ گیا۔ رشیدہ آنکھیں بچھائے دروازے پر کھڑی تھی۔

''تمہیں یقین تھا کہ میں آؤں گا۔''

''میرا دل کہتا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔''

''جب تم نے کہہ دیا تھا تو میں کیوں نہ آتا۔''

''یہ سوچ کر اداس ہو جاتی ہوں کہ آپ کی راہ دیکھنے کی عادت نہ پڑ جائے۔''

''میں وقت سے پہلے آجایا کروں گا۔ تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''علی صاحب! ہم غریبوں کی زندگی میں بڑی مشکل سے کوئی خوشی آتی ہے اس لیے اس کے چھن جانے کا افسوس بھی ہمیں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بس یہ خیال رکھیے گا۔''

''میں تم سے بھی زیادہ غریب ہوں۔ میری زندگی میں تم پہلی خوشی بن کر آئی ہو۔ میں اس خوشی کو رائیگاں نہیں کروں گا۔ میرے پاس اتنی دولت ضرور ہے کہ اس خوشی کو جب چاہوں گا خرید لوں گا۔'' علی نے شوخی سے کہا اور رشیدہ شرما کر رہ گئی۔

حمیدہ کسی کام میں مصروف تھی اس لیے دونوں کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد آئی تو خوشی سے اس کی حالت بھی وہی تھی جس کا مظاہرہ کچھ دیر پہلے رشیدہ کر چکی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، آپ کو کہاں بٹھاؤں۔ ہمارے گھر میں آپ کے بیٹھنے کے لائق تو کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔''

''تم اگر ایسی باتیں کرو گی تو کل سے میں نہیں آؤں گا۔''

''میری توبہ۔ آئندہ ایسی بات نہیں کہوں گی۔ آپ کا گھر ہے جہاں بیٹھیے، جو جی چاہے کیجیے۔''

''یہ ہوئی نا اپنوں کی سی بات۔ اگر میں مالک اور نوکر کا رشتہ رکھنا چاہتا تو یہاں آتا ہی کیوں۔''

''تم پڑھے لکھوں میں میرا کیا کام۔ تم باتیں کرو، میں ذرا گھر کا کام دیکھ لوں۔'' یہ کہہ کر حمیدہ وہاں سے روانہ ہو گئی۔

تنہائی ملتے ہی دونوں نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ رات کا کھانا بھی اس نے وہیں کھایا۔ کھانے کے بعد وہ دیر تک رشیدہ سے باتوں میں گم رہا۔ پیاس بڑھتی جا رہی تھی مگر اب اس گھر بھی جانا تھا۔

''اچھا رشیدہ، بہت رات ہو گئی۔ اب میں چلوں گا۔''

''بیٹھیے نا۔ اماں کو صبح جلدی جانا ہوتا ہے اس لیے سو گئی ہیں۔ میں اکیلے میں کس سے بات کروں گی۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ تمہاری اماں سو گئی ہیں، اب میرا بیٹھنا ٹھیک نہیں۔''

''اماں کو آپ پر اعتبار نہ ہوتا تو یوں آرام سے کیوں سو جاتیں۔ آپ غیر ہوتے تو میں کیوں آپ کو روکتی۔''

''ہماری زندگی میں کل کا دن بھی تو آئے گا۔''

''آپ نے ایک ہی دن میں مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ میرے لیے ایک لمحے کی جدائی بھی ناقابل برداشت ہے۔''

''یہ جدائی نہیں ہے رشیدہ، دوری ہے۔ یہ

دوری بھی ہمیشہ نہیں رہے گی۔''

''یہی تو مجبوری ہے کہ آپ اپنے ہو کر بھی غیر ہیں۔ آپ کو جانا تو ہوگا۔''

اظہار محبت جب عورت کی جانب سے ہو تو مرد بے دام غلام بن جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت علی کا تھا۔ وہ رشیدہ جس کے حسن کو پہلی مرتبہ دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا کہ اسے عرش سے فرش پر اتارنے کے لیے صدیاں بھی لگ سکتی ہیں، وہ ایک ہی دن میں اس کے شانے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ آسمان اس کے قدموں میں بچھا ہوا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ ایسی جنت سے اٹھ کر جانے پر مجبور تھا۔

وہ وہاں سے نکلنے کے بعد رستے بھر سوچتا رہا کہ رشیدہ نے اسے پڑھانے کے لیے بلایا تھا لیکن پڑھنے کا تو ذکر تک درمیان میں نہیں آیا۔ وہ خود ہی خود مسکرایا۔ پڑھنے کا تو محض بہانہ تھا۔ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ وہ میری قربت چاہتی ہے گویا جو میں چاہتا ہوں اسی کی طلب گار وہ بھی ہے۔ راستے اتنے آسان ہو جائیں گے یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ گھر پہنچا تو پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اندھیرے میں مل کر اندھیرا ہو گیا لیکن رشیدہ کی روشنی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔

وہ صبح یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہوا تو حمیدہ کام پر آچکی تھی۔ اس نے علی کو سلام کیا۔ علی نے سلام کا جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ گھر میں ان کا رشتہ مالک اور نوکر کا ہوگا۔ وہ اب اتنی بات بھی نہیں کریں گے جتنی پہلے کر لیا کرتے تھے۔

جب سہولتیں ساتھ دینے لگیں تو انسان بہت سی مشکلوں کو بھول جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ حمیدہ کے گھر میں اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ جس وقت چاہتا جا سکتا تھا۔ جتنی دیر چاہتا بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اس سہولت کا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اب وہ ان کے وقت بھی وہاں جانے لگا تھا۔ یونیورسٹی سے سیدھا وہاں پہنچ جاتا اور رات گئے اٹھتا۔ حمیدہ کی موجودگی اور غیر موجودگی کی کوئی شرط نہیں تھی۔ اب وہ حمیدہ کی اجازت سے رشیدہ کو لے کر باہر بھی جانے لگا تھا۔ وہ اسے ان دنیاؤں کی سیر کرا رہا تھا جو اس کے خیال کے مطابق رشیدہ کے لیے بالکل نئی تھیں۔ شاندار ہوٹلوں کے نرم، دبیز قالین رشیدہ کے پیروں تلے تھے۔ وہ اپنے باپ کی دولت رشیدہ پر نچھاور کر رہا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق یہی وہ طاقت تھی جو حمیدہ کو آنکھیں بند رکھنے پر مجبور رکھ سکتی تھی۔ جیولری کی کوئی ایسی دکان نہیں تھی جہاں وہ رشیدہ کو لے کر نہ گیا ہو۔ کوئی ایسا جدید لباس نہیں تھا جو اس نے اسے بنوا کر نہ دیا ہو۔

☆☆☆

سلطان ظفر کسی کاروباری پارٹی سے ابھی ابھی گھر لوٹے تھے۔ نشے اور نیند سے آنکھیں بوجھل تھیں لیکن کام کچھ ایسا تھا کہ علی کی انہیں اسی وقت ضرورت تھی لیکن جب ان کی بیگم نے یہ بتایا کہ علی گھر میں نہیں ہے تو انہیں حیرت ہوئی۔ اس سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب ان کی مسز نے یہ بتایا کہ ان دنوں اس کا یہی معمول ہے۔ گھر میں بہت کم رہتا ہے اور رات گئے آتا ہے۔

''تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آج کل اس کی مصروفیات کیا ہیں۔''

''دوستوں میں رہتا ہوگا۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی جو میں پوچھتی۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ اس نے گھر سے نکلنا تو شروع کیا۔''

''میرے ایک دوست نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔''

مسز ظفر نے قہقہہ لگایا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے مگر اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ کوئی دوست ہوگی جس کے ساتھ گھوم رہا ہوگا۔''

''مجھے فکر نہیں، تشویش ہے۔''

''اوہ ظفر! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اتنے فرسودہ خیال تم پہلے تو کبھی نہیں تھے۔ اپنے بیٹے کے ساتھ

ایک لڑکی کو دیکھ کر تم اتنے فکرمند ہو گئے۔ مڈل کلاس باپوں کی طرح سوچنے لگے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ لڑکی ہمارے معیار کی نہیں ہے۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''سیدھی سی بات ہے۔ وہ لڑکی یقیناً اس قابل نہیں ہوگی ورنہ علی اسے یہاں لے کر آتا۔ تم سے ملواتا۔ وہ چوری چھپے اس سے ملتا ہے اور یہ بات فکر کی ہے۔''

''علی کو تو تم جانتے ہو۔ موڈی سا لڑکا ہے۔ کسی دن موڈ ہوا تو لے بھی آئے گا۔''

''اسے جانتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ غریبوں کا ہمدرد بنا پھرتا ہے۔ کہیں اسی طبقے کا کوڑا تو اپنے لیے پسند نہیں کرلیا ہے۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے میرا علی۔''

''یہ سمجھ لینا کہ اگر ایسا ہوا تو میں یہ نہیں سوچوں گا کہ علی ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں کروں گا۔''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ میں موقع دیکھ کر خود اس سے پوچھ لوں گی کہ وہ لڑکی کون ہے اور وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔''

☆☆☆

''علی! اب تو میرے امتحان بھی ہو چکے۔ تم بھی فارغ ہو۔ آخر تم اپنے گھر والوں سے کب بات کرو گے۔''

''یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی تم سمجھ رہی ہو۔''

''تو پھر کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہارے وعدے جھوٹے تھے۔ تم ابھی تک مجھے بہلا رہے تھے۔''

''یہ بات نہیں ہے رشیدہ۔ میں خود تمہارے بغیر ادھورا ہوں لیکن ۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا۔ تم بولتے کیوں نہیں؟''

''میرے گھر کے لوگ دولت کے پجاری ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ تمہیں ٹھکرا نہ دیں۔''

''یہ بات تو تمہیں پہلے بھی معلوم تھی۔''

''میں نے کب انکار کیا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں اس کے بعد بات کروں تاکہ اگر انہیں اعتراض بھی ہو تو میں اپنی دنیا الگ بسا سکوں۔''

''اس میں تو برسوں بیت جائیں گے علی!''

''ڈیڈی مجھ سے کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ میں کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ اب تک میں نے دلچسپی نہیں لی تھی لیکن اب میں ان کی بات مان لوں گا۔ ذرا قدم جمتے ہی میں ان سے اپنی شادی کی بات کرلوں گا۔''

اس نے اپنی دانست میں رشیدہ کو مطمئن کر دیا تھا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئی۔ اس شام اس کی وہ فطری شوخی بجھی بجھی سی تھی۔

وہ گھر پہنچا تو رشیدہ کا مایوس چہرہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے بڑی حقارت سے اپنی وسیع کوٹھی کو دیکھا جہاں جذبے، دولت کی ترازو میں تلتے ہیں۔ جہاں دل کی بات کہتے ہوئے بھی دل دھڑکتا ہے۔

وہ انتظار کی طویل راہوں پر چلنے کے لیے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ ڈیڈی سے بات کرے گا کہ وہ اسے کوئی کاروبار کرادیں۔ اس مرحلے کی طے ہونے تک وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ اسے یہ خوشی بھی تھی کہ اب تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔

یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ بیگم ظفر نے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ وہ حمیدہ کے گھر جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ گھومنے والی لڑکی حمیدہ کی بیٹی ہوگی۔ اس کی تصدیق اس وقت ہوگئی جب حمیدہ سے انہوں نے پوچھا اور اس نے تصدیق کردی۔ حمیدہ کو انہوں نے اسی وقت ملازمت سے فارغ کردیا۔ علی ان حالات سے بے خبر رشیدہ کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھا رہا تھا اور وہیں سے گھر آ گیا تھا۔ بیگم ظفر

اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کو اس معاملے سے فی الحال دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کمرے میں بند تھے البتہ مسکان ان کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔

گھر پہنچتے ہی اس کی طلبی ہوگئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ممی کو اس سے کیا کام پڑ گیا۔

''ممی! وہ ایک دوست کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا۔''

''دوست کے ساتھ گئے تھے یا حمیدہ کے گھر گئے تھے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں حمیدہ کے گھر کیوں جاؤں گا؟''

''جھوٹ مت بولو۔ میں کسی بنیاد پر ہی یہ بات کہہ رہی ہوں۔''

''میں صرف ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔ اسی دن آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔''

''کیوں گئے تھے؟''

''اس کی بیٹی سے ملنے گیا تھا جو غریب ہونے کے باوجود اے لیول کر رہی ہے۔''

''پھر تمہیں اس پر اتنا رحم آیا کہ اس کے ساتھ گھومنے بھی لگے۔ اس کے گھر جا کر بیٹھنے بھی لگے اور جھوٹ بھی بولنے لگے کہ صرف ایک مرتبہ گئے تھے۔ جبکہ تمہاری چہیتی نوکرانی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے اس دو کوڑی کی ملازمہ کو دھکے دے کر کوٹھی سے باہر نکال دیا۔''

''بہت اچھا کیا آپ نے۔ ایسی باہمت عورت کے ساتھ آپ کو یہی سلوک کرنا چاہیے تھا۔ شاید اب وہ اپنی بیٹی کو تعلیم نہ دلا سکے۔ اس کی مدد کرنے کے بجائے اس کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے تھا۔''

''وہ واقعی باہمت تھی۔ اس نے یہ ہمت کی تھی کہ تمہیں پھانس کر اپنی بیٹی کو یہاں بھیجے۔ اس بچی ذات نے یہ ہمت کی تھی۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تم کس باپ کے بیٹے ہو؟''

''ممی! جب آپ کو یہ سب معلوم ہی ہو گیا ہے تو میں یہ بتا دوں کہ میں حمیدہ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''خبردار! جو ایسی بات آئندہ زبان سے نکالی۔ شکر کرو ابھی تمہارے ڈیڈی کو کچھ معلوم نہیں۔''

''ان سے آپ ذکر کر دیں۔ رشیدہ غریب ضرور ہے لیکن تعلیم یافتہ ہے اور خوب صورت اتنی کہ آپ کا گھر سج جائے گا۔''

''میرا گھر یتیم خانہ نہیں ہے۔ سمجھے تم۔''

''ممی! غریب ہونا جرم نہیں ہے۔ آپ میری خوشی کے لیے اسے قبول کر لیں۔''

''میں نے کب کہا، غریبی جرم ہے۔ وہ اپنے لوگوں میں شادی کر سکتی ہے۔ وہ ہمارے معیار کی نہیں ہے۔''

''یہ معیار آسمان سے نہیں اترتے۔ ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔''

''تم ایک نوکرانی کو اپنی ساس کہتے ہوئے اچھے لگو گے؟''

''وہ محنت کرتی ہے۔''

''کوئی مزدور ہی اس کا داماد بن سکتا ہے۔''

''میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''

''اس محبت کو خیرباد کہا جا سکتا ہے۔''

''معاف کیجئے گا، میں مجبور ہوں۔''

''ضد مت کرو، ابھی وقتی ابال ہے۔ بعد میں تم خود پچھتاؤ گے۔''

''مجھے آپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ میں رشیدہ سے ہی شادی کروں گا۔''

''تمہارا یہی فیصلہ ہے تو پھر مجھے تمہارے ڈیڈی سے بات کرنی پڑے گی۔''

''میں آپ لوگوں کو وقت دے رہا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ لیں۔ آپ کے جواب کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھاؤں گا۔''

اس کے اس کورے جواب کے بعد بحث کی

کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

علی کو معلوم تھا اب کیا ہونے والا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ڈیڈی اس شادی پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کم از کم ایک مرتبہ اسے اپنے ڈیڈی کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔ وہ رات بھر ان سوالوں پر غور کرتا رہا جو اس سے پوچھے جانے والے تھے اور ان سوالوں کے جواب سوچتا رہا۔ وہ یہ بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر کسی طرح بات نہیں بنی تو وہ اس کوٹھی کو چھوڑ دے گا لیکن رشیدہ سے شادی ضرور کرے گا۔

اس سے پہلے کہ گھر والے جاگتے، وہ گھر سے نکل گیا۔ اسے اپنے فیصلے سے حمیدہ اور رشیدہ کو آگاہ کرنا تھا۔

حمیدہ اسے دیکھتے ہی پریشان ہوگئی۔ اتنی صبح صبح اس کا آنا علت سے خالی نہیں تھا جب کہ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکا ہے۔

اس نے کسی تمہید کے بغیر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''میں اپنے گھر والوں کو تیار کر رہا ہوں۔ اگر وہ نہ مانے تو میں اپنی مرضی سے رشیدہ کا ہاتھ تھام لوں گا لیکن اس حالت میں کہ میرے باپ کی دولت میرے پاس نہیں ہوگی۔ تمہیں میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے تو ابھی بتا دو۔''

''علی صاحب! ہم غریب ہیں۔ الزام ہم پر آئے گا۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ آپ اپنے ماں باپ کو چھوڑیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دولت کے بغیر میں آپ کے لیے بے کار ہوں۔''

''اگر تم یہ سمجھتے ہو تو یہی سہی۔'' حمیدہ نے کہا لیکن رشیدہ خاموش نہ رہ سکی۔ ''اماں مجھے صرف علی چاہیے، اس کی دولت نہیں۔''

''دولت لے کر میں بھی کیا کروں گی۔'' حمیدہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں کسی کے بیٹے کو اس کے ماں، باپ سے دور ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ علی بیٹے تم اپنے گھر جاؤ۔ ہم صبر کر لیں گے۔''

''آپ دعا کیجئے کہ وہ لوگ مان جائیں ورنہ میں پھر وہی کروں گا جو میں نے کہا ہے۔''

☆☆☆

سلطان ظفر اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے لیکن علی اپنی ضد پر جما ہوا تھا اور جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے دی تو سلطان ظفر نے اس فیصلے پر عمل کر لیا جو انہوں نے آخری حربے کے طور پر اٹھا رکھا تھا۔

وہ کسی کو بتائے بغیر حمیدہ کے گھر پہنچ گئے۔ حمیدہ کو ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔

''آپ کی بہت بڑی کوٹھی میں مجھ غریب کے لیے جگہ نہیں تھی لیکن میں آپ سے یہ ضرور کہوں گی کہ تشریف رکھیے۔''

''ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ تم سے ایک سودا طے کرنے آئے ہیں۔''

''فرمایئے، بندی کے گھر کا کون سا سامان حضور کو پسند آ گیا ہے۔''

''تم میرے بیٹے کی جان چھوڑ دو۔ یہاں سے کہیں دور چلی جاؤ۔ ہم تمہیں اس کی قیمت دینے کو تیار ہیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ کی خاطر میں یہ بھی کر لوں گی۔ دس لاکھ کی رقم گن دیجئے، میں یہ شہر چھوڑ دوں گی۔''

''اپنی حیثیت دیکھ کر مطالبہ کرو۔''

''میں تو آپ کی حیثیت دیکھ کر مانگ رہی ہوں ورنہ سمجھیں بیٹے سے آپ نے ہاتھ دھو لیے۔''

''یہ رقم تو بہت ہے۔''

''مرضی ہے آپ کی۔ جلدی کیجئے علی میاں آتے ہی ہوں گے۔''

''رقم تمہیں کل مل جائے گی۔''

''پرسوں میں یہ شہر چھوڑ دوں گی۔''

رقم بہت تھی لیکن بیٹے کی زندگی اور اپنی عزت سے زیادہ نہیں تھی۔ سلطان ظفر نے دس لاکھ بینک سے نکلوائے اور حمیدہ کے منہ پر مار کر چلے گئے۔

ان کے نکلتے ہی حمیدہ نے گھر کے دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور بستر پر لیٹے ہوئے آدمی کے پاس پہنچ گئی۔"

"اب جلدی سے اٹھ جاؤ۔ چلنے کی تیاری کرو۔"

"کام ہوگیا۔"

"سیٹھ صاحب آئے تھے۔ پورے دس لاکھ دے گئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ آدمی بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بیگم ہو تم کہاں کی۔۔۔"

"علی کے سامنے اداکاری تو تم بھی خوب کرتے تھے۔ مجھے بھی شک ہونے لگتا تھا کہ کہیں تمہیں سچ مچ تو فالج نہیں ہوگیا۔"

"اب یہ شہر بھی چھوڑنا پڑے گا۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔" حمیدہ نے کہا اور رشیدہ نے تو اس مرتبہ بھی کمال کر دیا۔ علی عرصے تک یہی سمجھتا رہے گا کہ وہ واقعی اس پر مرنے لگی تھی۔ بے چارہ علی۔۔۔"

"اماں! ہم آج رات ہی کو یہاں سے نکل جائیں۔ علی کل آنے کے لیے کہہ گیا تھا۔ صبح ہی صبح آدھمکے گا۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ ہمارا کام ہوگیا۔ اب یہاں رکنے کا کیا فائدہ۔ نادرہ بہن سے کہو اپنا گھر سنبھالیں۔ ہم چلے۔"

کچھ سامان گھر میں چھوڑا کچھ ساتھ لیا، کرائے کا مکان، مالک مکان کے حوالے کیا اور رات کے اندھیرے میں ان تینوں نے یہ مکان چھوڑ دیا۔

یہ حمیدہ کی تیسری واردات تھی جو کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی۔

◆.....◆.....◆

سنہری باتیں

حضرت خدیمؓ بن فاتک کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور رخ مبارک لوگوں کی طرف پھیرا تو خلاف معمول بیٹھے رہنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے کھڑے ہوگئے اور تین بار فرمایا:

"جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا، دونوں برابر کے گناہ ہیں۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بتوں سے دور رہو جھوٹی بات کہنے سے دور رہو خدا تعالیٰ کے لیے یکسو ہو جاؤ، شرک چھوڑ دو، توبہ اختیار کرو۔"

☆.....☆.....☆

☆ جب مسلمان دعا مانگنا کم کریں گے..... تو مصائب نازل ہوں گے۔

☆ جب صدقات دینا بند کریں گے..... تو بیماریاں بڑھیں گی۔

☆ جب زکوٰۃ دینا بند کریں گے..... تو مویشی ہلاک ہوں گے۔

☆ جب بادشاہ ظلم کریں گے..... تو بارشیں روک لی جائیں گی۔

☆ جب بدفعلیاں عام ہوں گی..... تو اچانک اموات آئیں گی۔

☆ جب لوگ بد اعمال ہو جائیں گے..... تو زلزلے بہ کثرت آئیں گے۔

☆ جب حکم خدا کے خلاف فیصلے ہوں گے..... تو ان پر ان کے دشمن غالب آجائے گے۔

☆ جب عہد شکنی بہت ہوگی..... تو اللہ تعالیٰ انہیں قتل کے ذریعے آزمائے گا۔

☆ جب ناپ تول میں کمی کی جائے گی..... تو ان پر قحط نازل کیا جائے گا۔☆

آنکھیں

ایم اے عظیم

آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہے اس بات کی اہمیت کا اندازہ صحیح طرح صرف وہ ہی شخص لگا سکتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہو۔۔ ایک ایسے ہی نابینا شخص کی داستان جس نے اپنی زندگی کی پچاس بہاروں کو آنکھوں سے نہیں ہاتھوں سے دیکھا تھا۔۔۔

ایک نابینا شخص کے احساسات پر مبنی دل کو چھو لینے والی کہانی

میرے اردگرد پھیلی ہوئی تمام کائنات کا صرف ایک ہی رنگ تھا بلکہ اب تو میں اسے رنگ بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ صرف اندھیرا تھا۔ آسمان، زمین، زمین پر بسنے والے اور ان کی بستیاں، جنگل، پہاڑ، چرند اور پرند میرے لیے سب ایک جیسے تھے۔ میری زندگی پر یہ تاریکی اڑتالیس سال تک چھائی رہی۔۔۔ نصف صدی۔۔۔ میرا بچپن، جوانی اور بڑھاپا، میری تمام زندگی اس اندھیرے میں گم ہوگئی تھی۔ میری عمر صرف دو سال کی تھی جب میری دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ داہنی آنکھ میں روشنی کا ایک موہوم سا احساس باقی رہ گیا تھا جس کے سہارے میں اڑتالیس سال تک دن اور رات میں تمیز کرتا رہا۔ دن کے وقت جب کبھی مطلع صاف ہوتا تو سورج کی تیز اور چمکیلی شعاعیں دودھیا دھند کی مانند میرے دماغ پر چھا جاتیں۔ میرے لیے اجالے کا یہی احساس، دن تھا اور جب یہ سفید دھند غائب ہوجاتی تو میں سمجھتا کہ بس اب رات آگئی ہے۔ روشنی اور تاریکی کی اس بے رنگ دنیا میں، میں پچاس سال تک سانس لیتا رہا۔

دو سال کی عمر تک میں نے اپنے آس پاس کی چیزوں کو جس حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھا تھا، وہ چیزیں پچاس سال تک میرے لیے حیرت ہی کا باعث بنی رہیں۔ کسی بھی چیز کی شکل وصورت یا رنگ مجھے یاد نہ تھا۔ عمر کا وہ ابتدائی حصہ میرے لیے ایک ایسا بھولا بسرا خواب تھا جس کا ہر نقش اب محو ہو چکا تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لینا شروع کیا۔ ہاتھوں کے لمس اور تصور کی اڑان نے میرے ذہن میں کائنات کی ایک تصویر بنائی۔ مختلف چیزوں کی ماہیت، رنگوں کے نکھار اور اجرام فلکی کی گردش کو میرے تخیل نے کچھ فرضی شکلیں دے دی تھیں۔ میرا تخیل کہیں تو حقیقت سے قریب تر تھا اور کہیں اس کے بالکل برعکس۔ بہرحال میں اپنے مقدر سے مطمئن اور اپنی اندھیری دنیا سے رفتہ رفتہ مانوس ہوگیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں درخت میرے لیے قدرت کا ایک ایسا معمہ تھے جو ہمیشہ میرے لیے دلچسپی کا سامان بنے رہے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ درخت زمین سے اگ کر آپ ہی آپ بلند تک کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ میری عمر اس وقت آٹھ یا نو سال کی ہوگی جب میں اپنے گھر سے نکل کر کچے راستے پر درختوں کی قطار کو ہاتھوں سے ٹٹولتا ٹٹولتا کھیل کے میدان تک چلا جایا کرتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا

کہ میں کسی درخت سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا اور گھنٹوں اس کی سوندھی خوشبو میں سانس لیتا رہا، میں نے بازو اٹھا کر اس کی بلندی کا اندازہ کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ ہوا چلتی تو درختوں کے پتے تالیاں بجانے لگتے۔ میں سر اوپر اٹھاتا مگر وہاں صرف اندھیرا ہوتا۔ مجھے کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بلندی کیا چیز ہوتی ہے۔ مجھے درختوں کے بارے میں صرف یہ بات معلوم تھی کہ ان کے نیچے سایہ ہوتا ہے اور سائے میں ٹھنڈک۔

میں اپنے بزرگوں کی شفقت اور اپنے ان دوستوں کی ہمدردی کے جذبے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جنہوں نے میری انگلی تھام کر زندگی کی کٹھن راہوں میں میری رہنمائی کی تھی اور قدم قدم پر مجھے سہارا دیا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے زندگی گزارنے کے مختلف طریقے بتائے اور سب سے بڑھ کر یہ سبق دیا کہ انسان کو کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور حالات خواہ کیسے بھی ہوں مگر مایوس ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بار میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ ''تم درخت پر کیسے چڑھتے ہو۔'' تو اس نے مجھے دو دن تک باقاعدہ ٹریننگ دی اور تیسرے دن ایک درخت پر چڑھنے میں میری مدد بھی کی۔ صبح بالکل اندازہ نہ تھا کہ درخت کا مضبوط تنا اوپر جا کر ٹہنیوں اور اس کے بعد کمزور اور نازک شاخوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں ہاتھوں اور پیروں سے ٹٹولتا ہوا اوپر چڑھتا چلا گیا۔ میں ایک پتلی سی ٹہنی سے چمٹا ہوا تھا اور وہ میرے بوجھ سے جھول رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں زمین سے کتنی دور ہوں اس پر مستزاد یہ کہ مجھے اپنے اس دوست کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جس نے اوپر چڑھنے میں میری مدد کی تھی۔ میں ابھی سخت پریشانی میں مبتلا سوچ بھی رہا تھا کہ اچانک وہاں سے کسی پڑوسی کا گزر ہوا اور اس نے مجھے درخت پر دیکھ لیا اور گھر جا کر اطلاع کر دی۔ پھر کچھ لوگ ایک لمبی سی سیڑھی لے کر پہنچے اور مجھے بڑی مشکل سے نیچے اتارا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن میری اس حرکت پر میری دادی اماں نے مجھے پہلے تو ڈانٹا تھا اور پھر میری محرومی پر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ اگلے دن میں نے بھی اس درخت سے لپٹ کر آنسو بہائے تھے۔

میرا بچپن اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے گزر گیا یہاں تک کہ جوانی کی منزل آ گئی۔ میرا وہ

ہمدرد دوست جس نے بچپن میں ہر قدم پر میری رہنمائی کی تھی۔ جوانی میں بھی میرا ہمدرد اور غمگسار رہا۔ اس کے ساتھ ایک دن اس کے بڑے بھائی کے مکان پر میری ملاقات اس لڑکی سے ہوئی جو چند ماہ بعد میری بیوی بن گئی۔ میری شادی، میری زندگی میں میری بینائی کی واپسی سے بھی زیادہ عظیم الشان اور یادگار واقعہ تھا۔ میری بیوی نے مجھے سچی محبت کی وہ روشنی عطا کی جو اس دنیا میں بعض آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔

شادی کے بعد شروع کے چند سال مصیبت کے تھے۔ مجھے اپنے اندھے پن کا شدت سے احساس تھا اور پھر روزی کمانے کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ تھا۔ پھر طور کچھ عرصے بعد مجھے ایک معقول ملازمت مل گئی اور دن سکھ سے گزرنے لگے۔ ہمارے ہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں اور میں نے پچاس سال کی عمر میں پہلی بار جب انہیں دیکھا تو دونوں کی شادیاں ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔

میں جوتوں کے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ مجھے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے گھر کے روزمرہ کے اخراجات باآسانی پورے ہوجاتے تھے۔ میں نے ایک مکان بھی قسطوں پر حاصل کرلیا تھا۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ میرا اندھا پن اب میرے معمول کے کاموں میں حائل نہ ہوتا تھا۔ میں فارغ اوقات میں اپنی نواسیوں کے ساتھ باغیچے میں گزارا کرتا تھا۔

چند روز بعد اچانک میری داہنی آنکھ میں تکلیف شروع ہوگئی۔ یہ بات میرے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ یہ وہ آنکھ تھی جس کے سہارے میں پچاس سال تک دن کے اجالے اور رات کی تاریکی میں تمیز کرتا رہا تھا۔ آنکھوں والوں کے لیے ہوسکتا ہے میرا یہ احساس مضحکہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے تو سورج کی روشنی کو گہری دھند کی مانند محسوس کرلینا ہی ''بینائی'' تھا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر نے مجھے یہ بتایا کہ آنکھ کا آپریشن ہوگا اور اس کی جگہ ایک صحت مند آنکھ لگائی جاسکتی ہے تو مجھے کچھ تشویش سی ہوئی، لیکن ڈاکٹر نے جب یہ بتایا کہ آپریشن ناکام ہونے کی صورت میں میری داہنی آنکھ کی وہ ہلکی سی بینائی بھی جاتی رہے گی تو میں نے آپریشن کرانے سے انکار کردیا۔ روز و شب اسی طرح گزرتے رہے۔ اس دوران میں آنکھ کی تکلیف اس قدر بڑھ گئی کہ میں صرف درد سے نجات حاصل کرنے کے خیال سے آپریشن کے لیے رضامند ہوگیا۔

آپریشن کے بعد میں ایک ہفتے تک اسپتال میں رہا۔ میری آنکھ پر تہہ در تہہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور مجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ میرا آپریشن کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ سرجن کو صرف مناسب موسم کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ دن بھی آپہنچا۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ پٹی کھول رہا تھا۔ ایک تہ کے بعد دوسری تہ اترتی چلی جارہی تھی اور پھر تہ کے ساتھ ساتھ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ ابھی چند تہیں اور باقی تھیں کہ میں نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں بھی لرزش محسوس کی۔ نامعلوم وہ کون محسن تھا جس نے اپنی آنکھ کی روشنی کسی اندھے کے لیے بخش دی تھی۔ پٹی کی صرف ایک تہہ باقی رہ گئی۔ ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ اسے میری آنکھ سے جدا کردیا۔۔۔ ''اب آہستہ سے اپنی آنکھ کو کھول دو۔'' ڈاکٹر کی مہربان آواز سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور۔۔۔ پھر خوشی سے چیخ پڑا۔۔۔ روشنی۔۔۔ بینائی۔۔۔ مجھے بینائی مل گئی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ میرے برابر ڈاکٹر کھڑا تھا اور بستر کے چاروں طرف اجلے لباسوں میں نرسیں کھڑی تھیں۔ وہ سب مسکرا رہے تھے اور مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ لیکن میرے پاس اپنی مسرت بیان کرنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ میری زبان گنگ تھی۔ میں بار بار اپنا سر ادھر ادھر گھما رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ایک ہی نظر میں تمام کائنات کو دیکھ لوں، وہ کائنات جو پچاس سال تک میرے لیے ایک معمہ بنی رہی۔ اب وہ میرے سامنے تھی اور میں اسے دیکھ سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے آپریشن کی کامیابی کا یقین کرنے کے بعد دوبارہ میری آنکھ پر پٹی باندھ دی۔ میں کچھ دیر کے لیے پھر اندھا بن گیا تھا۔ لیکن مجھے اب کوئی غم نہ تھا کیوں کہ جو کچھ میں دیکھ چکا تھا اب اسے بیان بھی کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر نے آخری ہدایات دے کر مجھے اسپتال سے رخصت کردیا۔ میں اپنے گھر میں ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میرے چاروں طرف میرا ایک داماد اور میری دونوں بیٹیاں سانس روکے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ میری بیوی آہستہ آہستہ دعائیں مانگتے ہوئے میری پٹی کھول رہی تھی۔ ہر تہ کے بعد تاریکی کم ہو رہی تھی اور پھر اچانک مجھے چمکدار نیلی اور سفید ٹائلوں کا فرش نظر آنے لگا۔ میں نے سر اوپر اٹھایا اور زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی بیوی اور بچوں کی شکلیں دکھائی دیں۔ میری بچیاں، جن کی محبت میری رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ جن کے بچپن کے معصوم قہقہے آج تک میرے کانوں میں موسیقی کا رس گھولتے رہے ہیں اب میرے سامنے تھیں۔ وہ ماحول جس میں، میں پچاس برس تک سانس لیتا رہا تھا، وہ لوگ جو میرے بچپن سے لے کر اس بڑھاپے تک میرے ساتھی تھے۔ میری پیاری بیوی، جس نے اپنی پوری جوانی میری خدمت میں گزار دی تھی، اب یہ سب میرے سامنے تھے۔ میری وہ کائنات جو پچاس برس تک تاریکی کے پردے میں چھپی رہی تھی، اب اچانک اس میں اجالا ہوگیا تھا۔ اپنی خوش نصیبی پر میرا دل بھر آیا اور خدا کے حضور اظہار تشکر کے لیے میرے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے اور دعا مانگتے ہوئے میں نے آسمان کی طرف دیکھا، افق تک پھیلے ہوئے نیلے آسمان کی وسعت کا میرے دل پر عجیب اثر ہوا۔ دعا کے بعد میں اپنے پیاروں سے لپٹ گیا اور انہیں خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور انہیں دیر تک دیکھتا رہا۔

پچاس سال تک رنگ میرے لیے ایک بے معنی لفظ رہا، لیکن بینائی لوٹنے کے بعد مجھے یہ دنیا رنگوں کی دنیا نظر آئی۔ ایک کے بعد ایک رنگ نظر آتا

مسکراہٹیں

''اتنی زیادہ رقم کا بل.....؟'' آپریشن کے بعد ایک مریض نے سرجن کا بل دیکھ کر احتجاج کیا۔

''میرے دوست!'' سرجن نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں معلوم ہوجاتا کہ تمہارا کیس کتنا پیچیدہ تھا اور کس طرح میں نے تمہارے آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے سے روکا۔ تو تم اس سے تین گنا بل بھی خوشی سے ادا کردیتے۔''

☆☆☆

ایک شخص کو شہر کے سب سے بڑے شعبہ جاتی اسٹور سے قیمتی اشیاء چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ ضمانت پر رہا ہوکر اس نے ایک وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب نے ایف آئی آر کا مطالعہ کرنے کے بعد سنجیدگی سے کہا ''میں دو شرائط پر آپ کا دفاع کرسکتا ہوں' آپ کو مجھے یقین دلانا ہوگا کہ آپ بے گناہ ہیں اور یہ کہ مجھے دو ہزار روپے فیس کے طور پر ادا کریں گے۔''

ملزم نے چند لمحے غور کیا اور بولا: ''میں آپ کو پندرہ سو روپے اور ایک سیکوگھڑی پیش کرسکتا ہوں جو میں نے اس اسٹور سے دو ماہ پہلے اڑائی تھی۔ اب بتایئے کیا آپ میرا دفاع کریں گے۔!''

☆☆☆

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا:

''بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔''

خاتون نے پریشان ہوکر کہا: ''لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔

اور میری حیرت اور خوشی میں مزید اضافہ کردیتا۔ قدرت نے اس حسین دنیا میں بے شمار رنگ بکھیر دیے تھے جنہیں دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک سی پیدا ہوتی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ مسرت اپنے ہم جنس انسانوں کو دیکھ کر ہوئی۔ اپنے بیوی بچوں کی شکل و صورت اور ناک نقشے کے بارے میں میرے اندازے تقریباً صحیح ثابت ہوئے۔ مثلاً میں نے اپنی بچیوں کو اپنے گھر میں پروان چڑھتے ہوئے ہاتھوں سے دیکھا تھا۔ بچپن میں ان کے چہرے گول مٹول اور بہت نرم و ملائم تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے ناک نقشے بدلتے رہے، اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی سی ناک کی جگہ ستواں ناک ابھر آئی تھی۔ اسی طرح چہرے کی جلد میں وہ پلپلا پن نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے تصور میں اپنی بیوی بچوں کی جو تصویریں بنائی تھیں وہ اس سے زیادہ مختلف نہ تھے۔

ڈرائنگ روم سے اٹھ کر میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہ کمرہ جس کے فرنیچر سے میں برسوں ٹھوکریں کھاتا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ کمرا بہت تنگ ہوگا اب بھی کمرہ کافی کشادہ اور ہوادار معلوم ہوا۔ سہ پہر کے قریب میرا نواسا اسکول سے واپس آیا تو میں نے پہلی بار اس کا شگفتہ چہرہ دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت گیند تھی اور ایک بلا بھی۔ میرے بچپن کا ایک سہانا خواب، ایک حسرت جو آج پوری ہوئی۔ میں سورج ڈوبنے تک منے کے ساتھ گیند بلا کھیلتا رہا۔

رات کو آسمان کا منظر دیکھنے کے لیے میں صحن میں آن کھڑا ہوا اور نہ جانے کتنی دیر تک سر اٹھائے وہیں کھڑا رہا۔ آسمان پر بے شمار ننھے ننھے تارے جھلملا رہے تھے، ان کی مدھم روشنی میرے لیے ایک خوش گوار تجربہ تھی۔ میں نے جی بھر کے آسمان کو دیکھا اور اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ لوگ جب دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو آسمان کی طرف کیوں دیکھتے ہیں۔ دھرتی کے اوپر پھیلے ہوئے نیلگوں آسمان کا منظر، خدائے لازوال کی قدرت کا ایک ایسا مظہر ہے جس سے نظر چرائی نہیں جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی بینائی مل جانے کے بعد جب پہلی بار دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میری نظر قدرتی طور پر آسمان ہی کی طرف اٹھی تھی۔

رات کے وقت آسمان کا نظارہ، دن کی نسبت کہیں زیادہ دلفریب تھا۔ حیرت ہے کہ لوگ رات کو تاریک کیوں کہتے ہیں۔ مجھے تو وہ تاروں بھری رات بہت روشن معلوم ہورہی تھی۔۔۔ دوسرے دن میں سورج نکلنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا تاکہ طلوع آفتاب کا منظر دیکھ سکوں۔ اس دنیا میں ہر چیز کو جلد سے جلد دیکھ لینے کی زبردست خواہش کو چھپانا میرے لیے ناممکن تھا۔ طلوع آفتاب کے منظر نے مجھے جو لطف بخشا اسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے، اس منظر نے خدا پر میرا ایمان اور پختہ کردیا۔

ناشتے کے وقت میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے پچاس سال تک کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کھانے کی چیزیں اتنی خوب صورت بھی ہوسکتی ہیں۔ سنہری رنگ کے توس اور تلے ہوئے انڈے دیکھ کر ہی میری بھوک چمک اٹھی۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ کھانے کی خوبی محض اس کا ذائقہ ہی نہیں بلکہ میز پر اس کا حسن اور رنگ بھی ہے۔ ناشتے کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ باہر سیر کے لیے نکلا۔ کاش میرے پاس وہ الفاظ ہوتے جن کے ذریعے گھر سے باہر کی دنیا کے بارے میں اپنے اولین احساسات و جذبات بیان کرسکتا۔ میں جب تک اندھا تھا تب تک میرے لیے فاصلہ، گہرائی یا بلندی سب بے معنی تھے۔ گھر میں رہنا یا گھر سے باہر آنا میرے لیے برابر تھا لیکن اب۔۔۔ اوہ! اب میں کیسے بتاؤں کہ میری نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی وسیع و عریض دنیا میں کس قدر کشش اور حسن تھا۔

اسپتال جانے سے پہلے میں نے اپنے گھر

کی کیاری میں گلاب کی چند قلمیں اپنے ہاتھ سے لگائی تھیں۔ جس وقت میں اسپتال میں تھا وہ قلمیں پودوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں اور میں وہاں بستر پر لیٹا ہوا دل ہی دل میں دعا مانگا کرتا تھا کہ کاش گلاب کی پہلی کلیوں کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ خدا نے میری یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ چند دن بعد پورے سرخ اور سفید گلاب کے پھولوں سے لد گئے۔ چمکیلی دھوپ میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھومتے ہوئے پھولوں نے مجھے بالکل مسحور کر دیا اور میں کچھ دیر کے لیے یہ بھی بھول گیا کہ گلاب صرف رنگ ہی نہیں بلکہ خوشبو کا نام بھی ہے۔

آنکھوں سے محروم لوگ کتنی مجبوری اور بے بسی کی زندگی بسر کرتے ہیں، انہیں کیا کیا نہ تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں، انہیں کس طرح قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں دنیا کی کیا کیا باتیں نہ سننی پڑتی ہیں۔ اس کا اندازہ کوئی آنکھوں والا ہرگز نہیں لگا سکتا۔ جن لوگوں کو خدا نے آنکھوں جیسی لازوال نعمت بخشی ہے وہ تو اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ مجھ سے پوچھیے، میں نے پچاس برس تک آنکھوں سے محرومی کا زہر پیا ہے۔ میری زندگی مسلسل ٹھوکروں میں گزری ہے۔ دنیا میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے لیے تو کچھ بھی نہ تھا۔ میں تو جیسے زندہ درگور تھا۔ میرا بچپن، جوانی اور بڑھاپا اس عمیق اندھیرے میں گزرا ہے۔ یہ دنیا کتنے حسین رنگوں کا مجموعہ ہے، یہ تو مجھے آنکھیں ملنے کے بعد ہی علم ہو سکا تھا

اتنی بے بسی، بے کسی، مجبوری اور محرومی کے بعد بھی میں خدائے لازوال کا دل سے شکر گزار ہوں جس نے آخری عمر میں ہی سہی، مجھے اپنی حسین دنیا دیکھنے کا موقع عطا فرمایا۔ میں نے بھی اپنے ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھ کر اس کی خوب صورت دنیا کے بے مثال حسن اپنی آنکھوں میں سمونے کی پوری کوشش کی۔ یہ صرف میں جانتا ہوں کہ اس عظیم خدا کی یہ عظیم دنیا کتنی حسین ہے۔

کچھ دن مطلع صاف رہا پھر موسم نے انگڑائی لی اور آسمان پر ادے ادے بال چھانے لگے۔ یہ حسین موسم مجھے پچھلے موسم سے بھی زیادہ خوب صورت معلوم ہوا۔ بینائی ملنے کے بعد میں نے پہلی بارش کا نظارہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے کیا۔ موسلا دھار بارش کے دوران آسمان پر بار بار بجلی کی چمک اور جھلملاتی ہوئی ننھی ننھی بوندیں عجب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ یہ منظر جو میرے لیے اتنا انوکھا اور حیرت انگیز تھا، دوسروں کے لیے اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے بچوں کی طرح پرجوش انداز میں اپنی بیوی کو آواز دی۔ ''ارے ذرا جلدی آ کر تو دیکھو، کتنی خوب صورت بارش ہو رہی ہے۔'' میری بیوی یہ بات سن کر صرف مسکرا دی۔

میری بیوی کی وہ مسکراہٹیں، موسموں کے بدلتے ہوئے رنگ، پھولوں کی وہ نکھار، آسمان کی نیلاہٹ، بلندی اور حسن فطرت کے وہ انمول خزانے جنہیں میں نے بینائی ملنے کے بعد چند دن کے اندر اندر اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیا، وہ چند دن میری تمام عمر کے تجربوں کا حاصل اور میرے حسین ترین خوابوں کی تعبیر ہیں۔ بینائی کے بعد میں نے دور دور کا سفر کیا، کئی ممالک دیکھے، بہتے ہوئے جھرنوں اور پہاڑی علاقوں کا نظارہ کیا۔ مصر کے اہرام، تاج محل، امپائر اسٹیٹ بلڈنگ اور دنیا کے مشہور تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ سوئٹزرلینڈ کے خوب صورت علاقوں کی سیر بھی کی اور اب۔۔۔ اب چاہے موت بھی آئے تو مجھے غم نہ ہوگا کیوں کہ میں نے دنیا کا حسن اپنی آنکھوں میں بسا لیا ہے، میں نے خدا کی یہ عظیم دنیا دیکھ لی ہے، یہ کائنات دیکھ لی ہے۔

ساتھی زندگی کا

سردار احمد نازش

وہ زندہ بچ جانے پر اتنا خوش نہیں تھا جتنا اُس کے مل جانے پر۔ وہ زندگی کی ساتھی تو تھی ہی لیکن اُس نے موت کی کش مکش میں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔۔۔

محبت جیسے لازوال رشتے پر مبنی دلوں کو چھو لینے والی کہانی

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے برآمدے میں کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لباس کی سرسراہٹ بھی سنائی دی۔ لیکن میں لحاف میں منہ چھپائے لیٹا رہا۔ سرما کی اس طویل رات میں سوتے رہنا بھی مشکل تھا چنانچہ جب وہ آواز دروازے کے پاس سے آنے لگی تو لیٹا نہ رہ سکا۔ لحاف کا ایک کونا اٹھایا اور قدرے اٹھ کر کہنی کے بل بیٹھ گیا۔ میں اگلے لمحات کا انتظار کرنے لگا کہ آنے والا کیا اقدام کرتا ہے، کیوں کہ دروازہ اندر سے بند تھا اور میرے اطمینان کے لیے اتنا بہت تھا۔

میں سانس روکے لمحات شماری کر رہا تھا کہ دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے جلترنگ بج اٹھا ہو یا پھر آنے والے کا ہاتھ اس قابل نہ ہو کہ زور سے دستک دے سکے۔ میں ابھی اس آواز پر غور ہی کر رہا تھا کہ دوبارہ دستک ہوئی اور ساتھ ہی ہولے سے کھانسنے کی آواز آئی۔ تو میں چونک پڑا۔ آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی عورت ہو۔

یا اللہ خیر۔ اتنی شدید سردی میں، رات گئے ایک عورت! اور پھر یہاں۔ میں نے ہمت کی اور بستر سے باہر نکل کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جب میں نے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو گنگنانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کنڈی کھول کر ذرا سا دروازہ وا کیا تو میری آنکھوں کے سامنے جیسے بجلی سی کوند گئی ہو۔

میں زیادہ پڑھا لکھا تو ہوں نہیں کہ اس کے حسن اور رعنائی کو الفاظ کا جامہ پہنا سکوں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ میں نے دنیا میں آج تک اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس زمین کی مخلوق نہیں بلکہ آسمان سے سیدھا زمین پر ہی آ رہی ہو۔

میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ روشنیوں کے جھماکے میری آنکھوں کو چندھیا رہے تھے اور میں تھا کہ ''صم بکم'' بنا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

''کیا کر رہے تھے۔'' بیک وقت مدھر گھنٹیوں کی آواز نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن گلا رندھ سا گیا۔ الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے اور منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ ''غوں۔۔''

وہ یک بیک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ شبنمی قطروں میں بھیگتا ہوا میں اس ماہ پارہ کو دیکھتا گیا۔

BUS
STOP

''کیا سوچ رہے ہو۔ کچھ تو بولو، دیکھو میں تم سے ملنے کے لیے اتنی دور سے آئی ہوں اور تم مجھے اندر بھی نہیں آنے دے رہے۔'' میں اس کی آواز کے نشے میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ پھر اچانک مجھے ہوش آ گیا میں واقعی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ سرد ہوائیں اس کی ریشمی بالوں کو پریشان کر رہی تھیں اور وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے انہیں بار بار اپنے چہرے سے ہٹا رہی تھی۔

اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ستواں ناک، گندم گوں رنگ اور نازک نازک سے گلاب ہونٹ، ہر طرح کے منوعی میک اپ سے بے نیاز چہرہ، قدرتی حسن کا ایک ایسا کرشمہ جس کی تعریف نہ کرنا کفران نعمت تھا۔

''جی ہاں، اندر تشریف لائیے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں حیران ہو رہا تھا کہ آپ یہاں کیسے؟''

''میں یہاں کیسے۔'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ گلاب کی پتیاں چاروں طرف بکھر گئیں۔

''سنو دلارے۔'' اس نے بڑے دلار سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم کہتے ہو میں یہاں کیسے۔ کیا تم مجھے اتنی جلدی بھول گئے۔ شاید تم اس بات کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں ہو اور اگر تم مجھے دیکھ کر پہچان نہیں سکے تو اس میں تمہارا شاید کوئی قصور نہیں۔ لیکن میں تو سب کچھ جانتی ہوں، ایک ایک بات میرے سامنے ہے، یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔ میرا تمہارا جنم جنم کا ساتھ ہے، میں تمہارے بغیر اتنی بیکل رہی کہ تمہیں بتا نہیں سکتی۔ یوں کہو ایک روح اپنے جسم کے بغیر بھٹکتی رہی اور اب جب میں تمہارے پاس آئی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میری زندگی پھر لوٹ آئی ہو۔ تم میرے محبوب ہو، انتہائی پیارے۔ ہم نے تمہارے بغیر کبھی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا۔ آؤ، میرے ساتھ، اس کمرے میں گھٹن ہے، آؤ باہر چلیں، میں تمہیں سیر کراؤں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی، مجھے یوں لگا جیسے قوس قزح کے رنگ بھگو گئے ہوں اور پھر یہ قوس قزح میری آغوش میں آ گئی۔

میں ایک معمول کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے میرا بازو تھام لیا۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے کنڈی لگا دی اور وہ مجھے اپنے ساتھ لیے آگے بڑھ گئی۔

''کیا ہوا میں اڑو گے؟'' خوشبوؤں کے ہالے سے مجھے آواز سنائی دی۔

''ہوا میں۔۔۔ وہ کیسے۔'' میں نے تعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا۔ جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ میں اس سمندر میں ڈوبنے لگا۔

''ہاں کیوں نہیں، تم دیکھ نہیں رہے کہ میں ہوا میں تیر رہی ہوں۔ تمہارے پیار نے مجھے امر کر دیا ہے اور میں ہر وہ کام کر سکتی ہوں جو تمہیں ناممکن نظر آتا ہے۔''

میں اس کی محبت میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ وہ بات کرتی تو یوں لگتی جیسے میرے کانوں میں امرت رس گھول رہی ہو۔ کبھی جھک کر میرے کان میں سرگوشی کرتی تو یوں لگتا جیسے میں قوس قزح کے دوش پر ہواؤں میں محو پرواز ہوں۔ اور پھر وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لیے ہوا کے دوش پر سوار ہو گئی۔ اس کا مہین ریشمی لباس سرسرا رہا تھا، اس کے ہلکورے مجھے غنودگی کے عالم میں لے جانے لگے۔

''ارے! تم تو سونے لگے، یہ دیکھو نیچے کیسا پیارا منظر ہے۔'' میں نے نیچے جھانک کر دیکھا، ہر طرف پھول ہی پھول تھے، سفید، نیلے، پیلے، نارنجی، سرخ، بنفشی، غرکہ کوئی رنگ ایسا نہ تھا جس کے پھول نہ ہوں۔ چاروں طرف نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر چمکتے ہوئے پھول ننھے ننھے قمقمے لگ رہے تھے۔

''آؤ اب ذرا اوپر چلیں۔'' اور یہ کہتے ہیں وہ اوپر ہی اوپر اٹھنے لگی۔ اس نے بڑی احتیاط سے مجھے

اپنے بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔ ایک بار یوں ہی اس کا ہاتھ پھسل گیا، تب اس کے منہ سے ایک آہ نکل گئی اور پھر اس نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ کہیں میں گر نہ جاؤں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی آسمانوں میں اڑ رہا ہوں، مجھے اس کی قربت بادلوں جیسی لگی جو ہوا میں اڑتے رہتے ہیں اور میں ان بادلوں کی آغوش میں آسمانوں کی سیر کر رہا ہوں۔ پھر ہم اتنی دور نکل آئے جہاں ایک عجیب سی ملگوبی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ مگر پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے۔ وہاں پھولوں کے تخت تھے۔ جن پر ہم بیٹھے تھے۔ ہلکورے دیتے ہوئے یہ پھولوں کے تخت کبھی مجھے نیچے گرا دیتے اور کبھی اسے۔ پھر وہ کھلکھلاتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور مجھے دھکا دے کر پھولوں پر لٹا دیتی۔ کافی دیر تک وہ مجھ سے اسی طرح پیار کرتی رہی۔ اس کے چہرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ جیسے اسے عرصے کے بعد ایک سچی خوشی حاصل ہوئی ہو۔

اب میرا جسم بھی کافی ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ شام کو جو گراوٹ اور بے چینی محسوس ہو رہی تھی اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ مجھے غنودگی سی آنے لگی۔

''مجھے اب نیند آرہی ہے، آؤ واپس چلیں۔''

''واپس چلیں؟ رلا دے نہیں، ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔''

اس نے ملتجیانہ انداز سے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے واپس جانے کی بات کر کے شاید اس کا دل دکھا دیا تھا۔

''دلارے! اتنی مدت بعد تم ملے ہو اور ابھی سے واپس جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ میں نے تو ابھی تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں۔''

مجھے خیال آیا کہ وہ بار بار مجھے ''دلارے'' کہہ کر مخاطب کر رہی ہے جب کہ یہ میرا نام نہیں تھا۔ میں بہت چھوٹا سا تھا جب میری اماں کبھی کبھار پیار سے مجھے دلارے کہتی تھیں۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو مجھے کبھی کسی نے ''دلارے'' نہیں کہا۔ لیکن میرے دل میں ایک کسک سی پیدا ہو گئی۔ ''دلارے دلارے۔'' جیسے کوئی بت دور سے مجھے پکار رہا ہو۔ ''دلارے''

میرے دل میں عجیب سی کھد بد ہونے لگی۔ پھولوں کا تختہ مجھے کانٹوں کا بستر محسوس ہونے لگا اور میں زور سے اٹھ بیٹھا۔ میرے اچانک اٹھنے سے اسے دھکا لگا اور وہ نیچے گر گئی۔

''کیا بات ہے دلارے۔'' اس نے میری طرف پیار اور ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دلارے۔۔۔ دلارے۔'' میرے ذہن کی کڑیاں چٹخنے لگیں۔ اضطراب کی لہریں مجھے بے چین کیے دے رہی تھیں اور تب میرے نہاں خانوں میں ایک چیخ بلند ہوئی۔ ''دلارے''

میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ میں واقعی اس کا ''دلارا'' تھا۔ میں نے بے تاب ہو کر اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ وہ شاید پہلے ہی میری کیفیت دیکھ رہی تھی۔ وہ اس طرح میری آغوش میں آ گئی جیسے کوئی بادلوں کا ٹکڑا اڑتا ہوا میرے جسم سے آ کر لپٹ گیا ہو۔ میں اس کی خوشبو میں ڈوبنے لگا۔

''مجھے یقین تھا دلارے کہ تم مجھے پہچان لو گے۔ یاد کرو جب تمہاری اماں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ تم بالکل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ تب میں نے آگے بڑھ کر تمہیں کہا تھا۔ ''دلارے!'' اور تم روتے روتے ایک دم چپ ہو گئے تھے۔ میرے گھر والوں نے وہ محلہ چھوڑ دیا اور ہم اپنے بنگلے میں آ گئے۔ میں تمہیں دل ہی دل میں پوجتی رہی۔ اور آج میں تمہیں لے کر یہاں آ گئی ہوں۔''

یہ میرے بچپن کی باتیں تھیں جو وہ مجھے بتا رہی تھی، یاد دلا رہی تھی اور میں تھا کہ کسی اور ہی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ افق سے۔۔۔ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ جلدی سے مجھ سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

''آؤ اب واپس چلیں۔''

کہاں تو وہ مجھ سے جدا نہیں ہونا چاہ رہی تھی۔ خیر، میں تو ویسے ہی واپس جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بڑی رسانیت سے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور پھولوں کے جنگل پر سے پرواز کرتے ہوئے ہم واپس آ گئے۔ اس نے کنڈی کھولی، مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر بستر تک لائی، اور مجھے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر اچانک وہ میرے اوپر جھک آئی۔ میں روشنیوں اور خوشبوؤں سے نہا گیا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں پھر میرے کانوں میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اور میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

میں کافی دن چڑھے تک سوتا رہا۔ لیکن سارا وقت وہ میرے حواسوں پر چھائی رہی۔ چند گھنٹوں کی قربت میں اس کی خوشبو میری نس نس میں رچ گئی تھی۔ دل بہت بے قرار ہو رہا تھا۔ بے چینی سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ شاید وہ رات کی طرح اچانک کہیں سے نمودار ہو جائے۔ پھر میرے قدم لان کی طرف اٹھنے لگے۔ عجیب سی بے کلی ہو رہی تھی، گویا دل کا سکون لٹ گیا ہو۔ میں اپنا کھویا ہوا سکون تلاش کرنے لگا۔ لان میں پودوں کے جھنڈ تھے میں نے ان کے اندر جھانک کر دیکھا، درختوں کی گھنی پتیوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا مگر وہ تو جیسے ایک جھلک دکھا کر کہیں روپوش ہو گئی تھی۔ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔

اسی اضطراب میں دن گزر گیا۔ شام آئی تو ایک ڈھارس سی بندھ گئی کہ کل تو وہ رات کو آئی تھی، شاید آج رات بھی آئے اور مجھے سکون مہیا کرے۔ لیکن بے چینی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ رات کا لبادہ بکھرنے لگا اور شام کی آنکھوں میں کاجل کی سیاہی بھر گئی۔ دن بھر کی تکان اپنا اثر دکھانے لگی، جسم کا بند بند دکھنے لگا، اور یوں نیند نے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ جاگتا رہوں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ نیند کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھے دروازے کی کنڈی لگانا یاد نہ رہا تھا۔ دونوں پٹ کھلے ہوئے پھر ہوا کے جھونکے خوشبوؤں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ حتیٰ کہ چاروں طرف خوشبو ہی تھی اور میں اس میں بے خود ہوا جا رہا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف لپکا۔ وہ بے اندر کی طرف آ رہی تھی، مجھے یوں بے تابانہ لپکتے دیکھ کر اس کے بازو آپ سے آپ لہرا اٹھے اور میں اس کی آغوش میں سمٹ گیا۔

''دلارے! تم میرا انتظار کر رہے تھے۔'' جی چاہا میں اپنا تن من اسی خوشبوؤں میں ڈبو دوں۔ اس کی آواز مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔

''انتظار! تم اسے محض انتظار کا نام دے رہی ہو، میں تو سراپا انتظار ہوں۔ سارا دن تمہیں تلاش کرتا رہا، تم کہاں چلی گئی تھی۔'' میں سسکنے لگا۔ اس کی قربت کی صورت سے میرا وجود پگھلنے لگا تھا۔

''دلارے! میں کہیں نہیں گئی، یہیں تمہارے پاس تھی، میری قربت کا احساس ہی تمہیں سارا دن مضطرب کرتا رہا۔ میں ان کی روشنی میں تمہارے پاس نہیں آ سکتی۔ لوگ دیکھیں گے تو سو طرح کی باتیں بنائیں گے۔''

''تم صرف باتیں کرتی رہو گی۔ میں سارا دن تمہارے انتظار کا عذاب جھیلتا رہا۔ تمہیں میرا کوئی احساس نہیں۔''

''اس طرح نہ کہو دلارے! تم تو میری روح ہو، میں خود تمہارے بغیر بے چین ہوں۔ میرا چین تم ہو، میں تمہیں پریشان ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔'' اس نے اپنی نرم نرم ملائم انگلیوں سے میرے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''آج یہیں لان میں بیٹھیں گے۔ دونوں باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے نا۔'' وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹائے آگے بڑھنے لگی۔ اس کے قدم ہوا میں پڑ رہے تھے اور سرسراتا ہوا لبادہ ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ اس کا نازک بدن اس طرح چھپ کر رہ گیا تھا کہ محسوس تک نہ ہوتا تھا۔ میری تو کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ میں کبھی محسوس نہ کر سکا کہ میں کسی بدن کی

آغوش میں ہوں یا ہوا کے پردوں میں لپٹا ہوں۔

''کیا سوچ رہے ہو دلارے! تم پریشان دکھائی دینے لگے ہو۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں میرا چہرہ لے کر پوچھا۔

''بس یونہی، پتا نہیں آج طبیعت بہت اداس رہی تھی، تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ اور اب تم آئی ہو تو دل میں عجیب طرح کی کھد بد ہو رہی ہے۔''

''میرا آنا تمہیں اچھا نہیں لگا۔'' اس نے تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں، یوں نہ کہو۔ تم تو میری زندگی ہو، تمہارے بغیر میں کیسے رہ سکوں گا۔ لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔''

''یہاں آرام سے لیٹ جاؤ۔'' اس نے آہستہ سے مجھے گھاس پر لٹا دیا اور پھر میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

''پریشان نہ رہا کرو، ہنسی خوشی سے وقت گزارو، دیکھو میں تمہارے پاس بیٹھی ہوں، اب مسکرا دو۔'' اس نے میرے گدگدی کر دی تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہوں! اب ہوئی نا بات، اچھا یہ بتاؤ، میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟'' اس نے میرے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے کیسی لگتی ہو۔۔۔ کیسی لگتی ہو۔۔۔ کیسی لگتی ہو۔'' میرے کانوں میں تین لفظوں کی تکرار ہونے لگی۔ کیسی لگتی ہو۔ ذہن کی کڑیاں چٹخنے لگیں، کسی کہنہ ورق کتاب کے صفحے پلٹے جا رہے ہوں، کرچیاں سی چبھنے لگیں۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔

☆☆☆

''کون ہو تم؟''

''جی۔۔۔ میں کون ہوں؟'' اس نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا تو میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔

''اچھا تو بدتمیزی۔ تم کیسی لڑکی ہو، تمہیں شرم نہیں آتی۔'' مگر وہ شرارت سے مسکراتی رہی۔

دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتی رہی اور پھر اس کی پلکیں گر گئیں، سر جھک گیا اور میری طرف دیکھے بغیر واپس مڑی اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔

میں وہیں کھڑا دیکھتا رہا کہ یہ کہاں جاتی ہے، مگر میں حیرت زدہ رہ گیا جب اس نے ہمارے ہی گھر کے برابر والے مکان کے دروازے میں داخل ہونے کے لیے بیل پر ہاتھ رکھا۔

''اچھا تو یہ ہمارے نئے ہمسائے ہیں۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

اگلے روز میں یونیورسٹی پہنچا تو دیکھا کہ وہ سامنے سے چلی آ رہی ہے۔ چال میں ایک نمایاں وقار تھا۔ سپاٹ چہرہ، تاثرات سے عاری، لیکن جب وہ میرے قریب سے گزری تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، ایک لمحہ کے لیے وہاں شناسائی کی چمک ابھری لیکن فوراً ہی معدوم ہو گئی اور وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔

وہ ناراض تھی، میں نے کل اسے بری طرح جھڑک دیا تھا لیکن میں تو اسے ایک چھوٹی سی لڑکی سمجھا تھا مگر یونیورسٹی میں وہ میرے سامنے جس انداز سے گزری اور اس کی آنکھوں میں ابھرتی اور ڈوبتی چمک دکھائی دی، اس نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا۔ پھر رفتہ رفتہ بہت سا وقت بیت گیا، بہاروں کی رت آئی، گزر گئی، موسم گرما آیا، دبے پاؤں گزر گیا، پھر خزاں نے ڈیرے آئے، وہ بھی گئے۔ اب پھر موسم سرما آ گیا۔ سردیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے، سرد لحافوں میں دبک جانا، ذرا سی دیر بعد وہ آپ کو اپنی نرم گرم آغوش سے لطف اندوز کریں گے۔ سردیوں میں یونہی سٹر پٹر گھومتا رہتا اور گھر میں آتے ہی فوراً لحاف لے کر دبک جاتا، ایسے میں میری امی کہتی۔ ''لو آ گیا لحاف کا بندر۔'' کیونکہ میں منہ سر لپیٹ کے پڑ جاتا تھا۔

''واہ کیا کہنے جناب کے۔ اور پھر میں بھی تو ایسے ہی وقت میں آئی ہوں، ٹھیک ہے، میں سردیوں میں ہی آیا کروں گی، آپ کو تنگ کرنے کے لیے۔''

''وہ کیوں۔'' میں نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ نے مجھے بہت تنگ کیا ہے۔''

''محترمہ! میں نے آپ کو کوئی تنگ نہیں کیا۔ اب جائیے یہاں سے۔''

''اے مسٹر! تم زیادہ باتیں نہ بناؤ۔'' وہ فوراً آپ سے ''تم'' پر اتر آئی۔ ''میں زیادہ دیر تک اپنی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔

میں اس کی آمد اور معنی خیز باتوں کو نظر انداز کرتا ہوا لحاف کی آغوش میں دبک گیا۔ سردی کا لطف اس قسم کی باتوں کی نذر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لیکن اس روز کے بعد تو وہ لڑکی واقعی میری جان کو آ گئی، یونیورسٹی آتے جاتے، گلی میں گزرتے وقت، حتیٰ کہ پوائنٹس کی طرف جاتے ہوئے سب کے سامنے بھی وہ کوئی فقرہ کسنے کرنے میں رعایت نہ کرتی۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی لیکن اس قدر نہیں کہ اسے چاہنے لگوں، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی حرکتیں مجھے بالکل پسند نہ تھیں۔

میں زیادہ دقیانوسی نہ سہی لیکن اتنا آوارہ مزاج بھی نہ تھا کہ ہر کسی سے فری ہوجانے والی لڑکی سے کوئی تعلق اور راہ و رسم رکھتا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا کسی نہ کسی لڑکے کے ساتھ باتیں میں مشغول یا کسی سے مذاق کررہی ہے۔ اور پھر اس انداز میں جیسے اردگرد چلنے پھرنے والے انسان نہیں کوئی جانور ہوں، جو اس کی حرکتوں اور اداؤں سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔ چند دن میں نے غور سے مشاہدہ کیا تو مجھے ہر لڑکا اسی کی طرف مائل نظر آیا۔ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی، چنانچہ ایک دن جب وہ میرے اوپر کسنے کرنے کے لیے کوئی فقرہ موزوں کررہی تھی میں نے اسے جالیا۔

''ہاں محترمہ کیا ارادے ہیں؟''

''بالکل نیک ارادے ہیں، آپ بتائیے، داڑھی کب رکھ رہے ہیں۔'' اس نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ داڑھی کو مذاق کررہی ہو۔ مجھے سخت غصہ آیا۔

''تم بدتمیزی نہ کیا کرو۔''

''یہ کیا تم، تم لگا رکھی ہو۔ میرا نام نہیں آتا؟''

''مجھے نہیں ضرورت تمہارے نام کی۔''

''لیکن ایک دن یہی نام جپا کرو گے۔''

''وہ دن میری زندگی میں نہیں آئے گا، اس خوش فہمی میں مبتلا ہو تو سخت غلطی کررہی ہو۔'' میں بھی آج اسے کھری کھری سنانے کے موڈ میں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر میرے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی، گویا بات چیت سے زیادہ وہ اپنے جسم کی نمائش کررہی ہو۔

''آج تو تم سے لڑائی ہوجائے گی۔''

''کس بات پر جاناں۔'' اس نے اس انداز سے کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی

''کیوں، کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، بس تمہاری بات پر ہنسی آ گئی۔''

''دیکھو، مجھے یہ تمہاری باتیں ہرگز پسند نہیں۔''

''کون سی باتیں۔'' گویا وہ بے خبر تھی اپنی حرکتوں سے۔

''کیا نہیں پتا نہیں۔''

''نہیں، مجھے کیا پتا تمہیں کن باتوں پر اعتراض ہے۔''

''یہی ہر ایک سے فری ہوجانا، مذاق کرنا اور لڑکوں کے درمیان گھرے رہنا۔''

''تو کیا یہ سب مجھے نہیں کرنا چاہیے۔''

''نہیں، تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔''

''مگر کیوں۔ اور بھی لڑکیاں تو ہیں، وہ سب اسی طرح کرتی ہیں۔''

''ان کی بات اور ہے۔ انہیں کوئی سمجھانے والا نہیں۔''

''تو آپ مجھے سمجھا رہے ہیں۔'' اس نے انگلیاں نچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔ اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آجائے تو۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔'' اس نے بڑے دلارے سے پوچھا۔ میں سمجھا کہ چلو آج تو راہ راست پر آ گئی۔

''ہاں، ہاں پوچھو! کیا بات ہے۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ تم میرے شوہر کب سے بن گئے ہو۔'' اس نے اتنی اچانک کہا کہ مجھے چکر آ گیا۔

''کیا کہا! تمہیں شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے۔''

''شرم! اس میں ایسی کون سی بات ہے، ہم تو روانہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔''

''تو کیا صرف شوہر ہی سمجھانے والی باتیں کرتے ہیں، کوئی اور ایسی بات نہیں کر سکتا۔''

''ہاں! ایسی باتیں شوہروں ہی کو زیب دیتی ہیں۔'' اس نے سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''مگر شوہروں کے پاس ایسی باتیں سمجھانے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ لڑکیاں خود ہی ایسی باتیں سمجھ لیا کریں۔''

''اچھا! واقعی شوہر یہ چاہتے ہیں۔'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! یہ بات درست ہے۔''

''اچھا! یہ بات درست ہے۔'' اور پھر وہ خیالوں میں کھوگئی ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ جب دیکھو، یوں محسوس ہوتا جیسے خیالوں کی دنیا میں جا بسی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ میں حیران ہوگیا۔ اس نے لڑکوں کی صحبت میں بیٹھنا چھوڑ دیا، کوئی لڑکا بات کرتا تو چلتے چلتے اس کا جواب دے دیتی اور پھر وہی خاموشی۔ اس کی خاموشی سب گوگراں گزرنے لگی۔ کیونکہ پورے ڈپارٹمنٹ میں اس کی باتیں گونجتی تھیں، اب وہ خیالوں میں کھوگئی تھی شاید وہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ کیونکہ وہ چل رہی ہوتی تو جب بھی اس کی نظریں نیچے زمین پر ہوتیں جیسے واقعی کوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔

لڑکے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز اشارے کرتے، مگر کوئی اس کی خاموشی نہ جان سکا، کسی کو ہمت بھی نہ پڑتی تھی کہ اس سے بات کرتا، یا اداسی اور خاموشی کا سبب پوچھتا۔ رفتہ رفتہ ہر لڑکا اس سے دور ہوتا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ جب مجھے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتی ہے تو ایک ٹک بس دیکھتی ہی رہتی ہے، جب میں نظروں سے اوجھل ہوتا ہوں تو پھر اچانک اسے ہوش آ جاتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوا کہ میں جان بوجھ کر اس کے سامنے رک گیا مگر وہ مجھے دیکھتی گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کی وسعت اور خیالوں کی سی گہرائی آ گئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ویسے ہی مجھے سمیٹنے کی کوشش کرتی تھیں مگر اب تو وہ باقاعدہ مجھے دیکھتی رہتی ہیں۔ گویا وہ بولنا چاہتی ہوں، مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں، کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس کی آنکھوں کا استفسار رد نہ کر سکا میں۔ میں آنکھوں کی پکار کے سامنے بے بس ہوتا چلا گیا۔

اس کی عادات اور انداز میں ایک واضح تبدیلی آنے لگی، جن باتوں کا میرے ذہن میں تصور تھا میں اس کی مجسم ذات میں انہیں اجاگر ہوتا ہوا دیکھنے لگا۔ وہ جیسے جیسے میرا خیالی پیکر اور روپ اختیار کرتی گئی میرے دل سے قریب ہوتی گئی، چلتی ہوئی آتی تو یوں لگتا جیسے اس کے قدم سیدھا میرے دل کے دروازے پر آ رہے ہوں، وہ بات کرتی تو جیسے میرے دل کے دریچوں میں جھانک رہی ہو، دروازے پر دستک دے رہی ہو اور پھر میں نے خود ہی اپنے دل کے کواڑ وا کر دئے اور اس نے قبضہ جما لیا۔ اب مجھے اس سے ایک انسیت پیدا ہو چکی تھی جو اٹوٹ تھی، میں اسے اپنا ایک حصہ سمجھنے لگا۔ کسی دن وہ میرے پاس نہ آتی تو میں بے چین ہو جاتا۔

ہم مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر سیر کو نکل

جاتے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کھیت شروع ہو جاتے ... کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر ہو لیتے اور ... دور تک نکل آتے۔ جب شام ہونے لگتی تو ... لوٹ آتے۔ وہ مجھ سے رات بھر کے لیے ... نے لگتی تو دل اِدھر اُدھر جاتا جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ ... لیے جدا ہو رہی ہو۔ لیکن ایک دن وہ واقعی مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ کبھی نہ ملنے کے لیے۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا، اس سے رکنے کے لیے بھی نہ کہہ سکا اور وہ مجھے دیوانہ بنا کر چلی گئی۔

☆☆☆

"دلارے! دلارے۔" مجھے کوئی آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے چاروں ہاتھ پاؤں استعمال کر کے پانی کی دبیز تہوں کو چیرنے کی کوشش کی مگر سانس تھی کہ بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ میں کبھی ڈوب رہا تھا کبھی ابھر رہا تھا۔ میرے ہاتھ خالی تھے، کوئی سہارا نہیں تھا جسے تھام کر اپنے بدن کا بوجھ اٹھا سکتا۔ پانی کا وزن میری چھاتی پر بڑھتا جا رہا تھا، دماغ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں، آنکھوں میں جیسے مرچیں سی بھر گئی ہوں۔ پھر یکدم نہ جانے کیا ہوا کہ سمندر میں بھونچال آ گیا اور ایک بڑی سی لہر نے مجھے تہہ سے نکال کر اوپر لا پھینکا، تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئیں کہ میرا ذہن ہی تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آنے پر پتا چلا کہ میں اسپتال میں ہوں۔ میں چاروں طرف نرسیں اور ڈاکٹر کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سب میری طرف متوجہ ہو گئے اور پھر بڑی حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"ناممکن! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سب کی زبان سے بیک وقت یہ بات نکلی۔ میں بھی حیران ہو کر ان کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

"خدا کا شکر ادا کرو بیٹا! اس نے تمہیں دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔"

میں نے فوراً خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ مجھے فوراً اس کا خیال آیا۔

"وہ کہاں ہے۔" میں نے بیڈ سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ لیکن سب ڈاکٹروں نے فوراً مجھے روک لیا۔

"مجھے بتاؤ، وہ کہاں ہے؟"

"کون کہاں ہے، کس کی بات کر رہے ہو بیٹا۔" ایک ڈاکٹر مجھے نرمی سے کھاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! وہ ایک لڑکی بھی تھی نا میرے ساتھ۔"

"لڑکی! کہاں، سمندر پر؟ لیکن ہمیں تو تمہارے سوا کسی کا علم نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! وہ میرے ساتھ تھی، ہم دونوں کنارے پر کھڑے کہ اچانک ایک دیوہیکل لہرا ابھرتی دکھائی دی، پھر آناً فاناً ہی سب ہو گیا، مجھے کچھ پتا نہیں کہ اس کے بعد میں یہاں کیسے پہنچا۔

"بیٹا! یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ ہم بھی اتفاق سے وہیں ساحل پر تھے لیکن کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ہم نے ایک کربناک چیخ سنی اور اس کے بعد ایک بڑی سی لہر واپس سمندر میں اترتے دکھائی دی۔ ہم فوراً آگے لپکے لیکن وہاں دور دور کسی کا نشان تک نہ تھا۔ ہم نے غوطہ خوروں کو سمندر میں بھیجا لیکن وہ سب خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور لہر آئی اور وہ واپس جاتے ہوئے تمہیں کنارے پر پھینک گئی۔ ہم تو مایوس ہو چکے تھے لیکن شاید اللہ کو تمہاری زندگی منظور تھی۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب! وہ بھی تو میرے ساتھ تھی، خدارا بتائیے اسے کیا ہوا ہے، وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئی۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔

"بیٹا! ہم تم سے سچ کہہ رہے ہیں، ہمیں صرف تم ہی مل سکے تھے۔ ہم نے وہاں کسی اور کو نہیں دیکھا۔ بلکہ ہمیں تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہاں تمہارے علاوہ کوئی اور بھی ہے ورنہ ہم وہاں ٹھہر کر مزید انتظار

لرتے لیکن اب تو سب بے سود ہے۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی تو پھر۔'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر خاموش ہو گیا، لیکن میرے لیے اتنا کافی تھا۔ ہر بات ڈاکٹر اپنے الفاظ میں بتانا چاہتا تھا میں سمجھ گیا تھا۔ میں نے فوراً اسپتال سے جانے کی اجازت طلب کی، جو مل گئی۔ میں سیدھا سمندر پہنچا۔ سمندر پرسکون تھا اس کی طرح پر ہلکی ہلکی سی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے ریت پر چلتے ہوئے اس کے قدموں کے نشان ڈھونڈنے چاہے مگر وہاں سب کچھ معدوم تھا، پانی کی ہلکی سی لہر سب کچھ مٹا دیتی ہے۔ میں نے پانی کے شور میں اس کے لباس کی سرسراہٹ تلاش کی مگر ناکام رہا۔ میں نے ہوا کے تھپیڑوں میں اس کی خوشبو سونگھی مگر بے سود۔ میری جان، میری خوشبو سمندر کی تہہ میں دفن ہو چکی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں مگر میں بوجھل قدموں سے پورے ساحل پر بھٹک رہا تھا۔ دائیں بائیں دیکھتا ہوا کہ شاید وہ لہر کی زد سے بچ گئی ہو اور مجھے یوں پریشان حال دیکھ کر کہیں سے اچانک آ جائے اور میرے گلے میں جھول جائے۔

''دلارے! تم خوامخواہ پریشان ہو گئے، دیکھو میں تو زندہ ہوں تمہارے سامنے۔''

مگر وہ تو واقعی گم ہو گئی تھی۔ سمندر کا سکون بتا رہا تھا کہ اس کی تہہ میں ایک حسن پوشیدہ ہو گیا ہے۔ وہ حسن جسے دیکھ کر میرا دل ایک لمحہ کے لیے رک جاتا تھا، وہ حسن جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ساری کائنات تھم گئی ہو اور اسے دیکھنے کے لیے ہوا بھی رک جاتی تھی۔ مگر آج سمندر میں روپوش ہو کر اس نے لہروں کی بے تابی بھی سلب کر لی تھی، سمندر کی لہریں اس کے پاکیزہ بدن کو چھو کر وہیں دم توڑ دیتی تھیں، سطح آب پر کوئی ہل چل نہ تھی۔

یہ سانحہ میرے لیے معمولی نہ تھا، میرا دل ڈوب ڈوب جاتا آنسو خشک ہو کر رہ گئے تھے، آنکھوں کی رونق ختم ہوتی جا رہی تھی، مجھے اپنے تن من کا ہوش نہ رہا۔ مجھے جب بھی خیال آتا، سمندر پر چلا جاتا۔ شاید

مسکراہٹیں

ٹیچر: ''تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟''

شاگرد: ''شادی.....''

ٹیچر: ''نہیں! میرا مطلب ہے کیا بنو گے؟''

شاگرد: ''دلہا.....''

ٹیچر: ''اوہو! بھئی بڑے ہو کر کیا حاصل کرو گے؟''

شاگرد: ''دلہن۔''

ٹیچر: ''نالائق! میرا مطلب یہ ہے کہ بڑے ہو کر ماں باپ کے لیے کیا کرو گے؟''

شاگرد: ''بھولاؤں گا.....''

ٹیچر: ''(غصے سے): تمہاری زندگی کا کیا مقصد ہے؟''

شاگرد: ''شادی.....''

وہ بہہ کر کہیں دور نکل گئی ہو اور ہوش آنے پر واپس آ گئی ہو، ساحل پر میرا انتظار کر رہی ہو۔ یہ سوچ کر میرے قدم خود بخود سمندر کی طرف اٹھنے لگتے۔ رفتہ رفتہ میں بے خود ہوتا چلا گیا۔ میرے گھر والے میری اس حالت پر بہت پریشان تھے لیکن اس کا مداوا ان کے پاس بھی نہیں۔ اس کے گھر والے بھی چند دن رو دھو کر اب خاموش ہو گئے تھے مگر مجھ سے تو رویا بھی نہ جاتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میرے سامنے ہی ہو، یا ابھی کہیں سے بھاگ کر میرے سامنے آ جائے گی۔ وہ اکثر مجھے تنگ کرنے کے لیے کسی کونے میں چھپ جاتی تھی، میرے آوازیں دینے پر بھی جواب نہ دیتی اور پھر میں جھنجلا کر آنکھوں کی پٹی اتار دیتا تو وہ مجھے کسی کونے میں کھڑی دبی دبی ہنسی کے ساتھ پلکیں جھپکاتی مل جاتی۔ میں فوراً اپنی آنکھوں پر ہاتھ باندھتا کہ شاید میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں، پٹی اترتے ہی وہ نظر آ جائے گی مگر نہیں۔۔۔ میں نے ایسا بیسیوں مرتبہ کر دیکھا وہ کہیں نظر نہ آئی۔

رفتہ رفتہ میں بے خود ہوتا گیا، بھوک ختم ہو گئی، کئی کئی دن گزر جاتے پانی کا ایک گھونٹ تک حلق

سے نیچے نہ اترتا۔ پھر میں فراموش ہوتا چلا گیا۔ میں کون ہوں، کیا کر رہا ہوں۔ اپنی بدحالی کا بھی مجھے کوئی احساس نہ رہا کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک دن ایسا آیا کہ مجھے سب کچھ بھول گیا اور گرتی ہوئی صحت کی فکر ہوئی۔ میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اس نے پوری طرح میرا معائنہ کیا میری آنکھیں دیکھیں، میری ذہنی حالت کا معائنہ کا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تو میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یار! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ خوامخواہ پریشان کیا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید کوئی بڑی بات ہوگئی ہے۔''

''تو کیا کوئی خاص بات نہیں ہے؟''

''ہاں، کوئی خاص بات نہیں ہے ،بس تم میں خون کی کمی ہوتی جارہی ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ۔''

''تو اس کا کیا علاج کرنا چاہیے؟''

''علاج، اب میں تمہیں یہاں سے ملنے نہ دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے نرس کو آواز دی۔ ایک دبلی پتلی مگر صحت مند سی لڑکی بھاگتی چلی آئی۔

''یس، ڈاکٹر۔'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں میرے پرائیویٹ روم میں لے جاؤ اور ہاں یہ خصوصی حفاظت میں رہیں گے اور انہیں کمرے سے باہر بھی نکلنے نہ دینا۔'' نرس شاید اپنے کام میں پوری طرح ماہر تھی۔ اس نے ایک خاص انداز سے میری کلائی پکڑی تو میں خود بخود اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے میری کلائی چھوڑ دی اور آگے بڑھ گئی میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ ایک دو برآمدے گزر کر وہ ایک الگ تھلگ کمرے کے پاس آکر رک گئی۔ اس نے تالا کھولا اور مجھے لے کر اندر آگئی۔ میں کمرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کسی عشرت کدے میں ہوں۔ انتہائی نفیس بیڈ اور مختصر فرنیچر، لیکن اس کے ساتھ ہی اسپتال کی ضروریات اور دواؤں وغیرہ کا بھی مکمل بندوبست تھا۔ میں پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھنے لگا۔

میری محویت دیکھ کر نرس نے ہولے سے کھانس کر مجھے متوجہ کیا اور بیڈ پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور بیڈ پر دراز ہوگیا۔ پتا نہیں یہ میری کمزوری کا سبب تھا یا بیڈ ہی اتنا آرام دہ تھا کہ مجھے فوراً ہی نیند آنے لگی اور اس کے بعد میری سماعت بھی معدوم ہوتی چلی گئی۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا کہ میں سوتا ہی رہا۔ پھر کسی نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے جگانا شروع کردیا۔

''دلارے! اٹھو نا۔ بہت دیر ہوگئی، کیا اب دن چڑھے بھی سوتے رہو گے۔''

میں نے آنکھیں کھولیں۔ دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ وہ مجھے اپنے پہلو میں لٹائے بیٹھی تھی۔ میرے بالوں میں اس کی مخروطی انگلیاں گردش کر رہی تھیں۔ میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں مگر چاروں طرف اندھیرا تھا۔

''تم کہہ رہی تھیں کہ دن چڑھ آیا ہے مگر ہر طرف اندھیرا ہے۔'' میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں دلارے! ابھی تو اندھیرا ہے مگر صبح ہونے والی ہے، تھوڑی دیر بعد سپیدہ سحر نمودار ہونے والا ہے۔ میں تو آج یہ سوچ کر آئی تھی کہ تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی مگر گھاس پر لیٹتے ہی تمہیں نیند آگئی۔ میں نے سوچا تم دن بھر انتظار کی کوفت جھیلنے کے بعد میری قربت کے سکون سے ہمکنار ہوئے ہو، اس لیے میں نے تمہیں نہیں جگانا۔ اب طبیعت کیسی ہے؟''

میں عجیب طرح سے اسے دیکھنے لگا۔ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا، ابھی میں نے ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ قدم قدم پر ایک سانحہ میرا منتظر تھا اب یہ منظر کیا ہے۔ میں فوری طور پر کچھ طے نہ کرسکا۔ ذہن پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ میں نے جھنجلا کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور ایک لمبی سانس لی۔ خوشبوؤں کا طوفان میرے اندر امڈ آیا، میں نے گھبرا کر فوراً آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بات ہے دلارے؟ تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ یوں لگتا ہے مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔''

''نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا لیکن چہرے پر چھائے ہوئے کبیدگی کے آثار دور نہ کر سکا۔

جونہی سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا اس نے اپنا لبادہ سمیٹا، سر کے ایک جھٹکے سے اپنی دراز ریشمی زلفوں کی شال کاندھوں پر پھیلائی اور الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

اس کے بعد وہی بے زار کن دن تھا۔ سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ مجھے اب اس کی قربت سے کوئی لطف اور سکون حاصل نہیں ہوا تھا، ذہن پر ایک عجیب سا بوجھ طاری تھا۔ شاید میں پاگل ہوگیا تھا، لیکن چھائی دھند کے پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے مختلف ہیولے ناچتے رہتے۔ بعض تو مجھ سے بات بھی کرنے کی کوشش کرتے مگر میں ان کی آواز نہ سن پاتا۔ یوں لگتا جیسے وہ کسی کنوئیں کی تہہ سے بول رہے ہوں۔ میرے ذہن پر ہتھوڑے برسنے کا عمل اب ایک تسلسل اختیار کر گیا تھا۔ سارا دن شش و پنج میں مبتلا رہتا اور شام ہوتے ہی اس کا انتظار شروع ہو جاتا۔ لیکن اب اسے شاید یہ رستہ بھول گیا تھا۔ میرے انتظار میں بھی پہلے جیسی بے چینی نہیں رہی تھی لیکن دو تین دن گزرنے کے بعد ہی میرا دل ہولنے لگا۔ اس کا سراپا میرے سامنے رقص کرنے لگا۔ ذہن پر چھایا ہوا غبار چھٹنے لگا اور میرا دل اس کے لیے بے تاب ہوگیا۔ نگاہوں میں انتظار کے دیپ جلنے لگے اور میں سارا دن اس کا انتظار کرتا رہا۔ یہ شاید میری سوچ اور اضطراب کا اثر تھا کہ سر شام ہی مجھے ہوا میں اس کی خوشبو محسوس ہونے لگی، میں نے بے تابی سے چاروں طرف غور سے دیکھا اور پھر بھاگتا ہوا لان کی طرف گیا مگر وہ نہیں آئی۔ پھر رات بھیگنے لگی تو مجھے اس کی مدھر کنگناہٹ سنائی دی اور وہ خوشبوؤں کے ہجوم میں مجھ سے ملنے چلی آئی۔ لیکن اب میرے اندر پہلے جیسا والہانہ پن نہیں تھا۔ وہ میرے اس رویے پر بہت حیران ہوئی۔

''دلارے! کیا میں تمہیں یاد نہیں آئی؟''

''نہیں۔'' میں نے صرف ایک لفظ میں جواب دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی پہلے تھی حالانکہ میں سارا دن اسی کا منتظر تھا مگر اب اس انتظار میں وہ کرب اور اضطراب نہیں رہا تھا۔

''دلارے! مجھ سے ناراض ہو کیا۔'' اس کی آواز میں بے پناہ کرب سمیٹ آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔ میرے ساتھ سر ٹکرا کر پھوڑے گی۔ اپنی بے تابیوں کا ماتم کرے گی۔

''میں تم سے ناراض کیوں ہوں گا؟ میرا تم سے کیا ناتا ہے؟''

''ناتا۔۔۔ تم ناتے کی بات کرتے ہو۔'' اس کی آواز میں ایک دم ایک عجیب سا تناؤ اور غصہ آ گیا تھا۔ ''چلو میرے ساتھ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ابھی تمہیں پتا چل جائے گا کہ میرا تم سے کیا ناتا ہے۔''

پھر وہ رفتہ رفتہ ہوا میں بلند ہونے لگی حتیٰ کہ ہم ہوا سے بھی اوپر چلے گئے۔ نیچے زمین کی چیزیں بہت چھوٹی دکھائی دینے لگیں مگر وہ شاید نیچی پرواز بھول گئی تھی، بس اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھی۔ زمین رفتہ رفتہ سمٹنے لگی اور بالآخر وہ ایک فٹ بال کے برابر نظر آنے لگی۔ یہاں پہنچ کر وہ رک گئی۔

''نیچے دیکھو۔۔۔ زمین کتنی دور رہ گئی ہے۔''

میں نے دوبارہ نیچے دیکھا، زمین اب فٹ بال سے بھی قدرے چھوٹی لگ رہی تھی۔ میں اپنے انہماک میں تھا کہ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں سیدھا سر کے بل آنے لگا۔ میری نیچے گرنے کی رفتار میں ایک دم اضافہ ہوگیا اور یہ اضافہ بتدریج بڑھتا

جارہا تھا حتیٰ کہ مجھے اپنا جسم ایک معمولی سا ذرہ محسوس ہونے لگا جو ہوا میں اڑتا چلا جارہا ہو، اب زمین کی چیزیں واضح دکھائی دینے لگی تھیں، پہاڑ، جنگل، صحرا، میدان سب ایک ایک کرکے واضح ہوتے چلے جارہے تھے۔ میں رفتہ رفتہ زمین کے قریب آرہا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا دل کانپ گیا کہ نیچے تو سمندر ہے۔ میں کسی سمندر میں گرنے لگا تھا۔ مجھے جھرجھری سی آگئی۔ اگر میں سمندر میں گرا تو سیدھا تہہ میں دھنس جاؤں گا۔ ویسے اگر میں کسی صحرا یا میدان میں بھی گرتا تو جب بھی یہی نتیجہ ہوتا۔ سمندر کی سطح رفتہ رفتہ نزدیک آرہی تھی اور پھر ایک دم میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں اس ہولناک اندھیرے میں گم ہوگیا۔

شور کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے چاروں طرف سفید لبادوں میں ملبوس کچھ لوگ کھڑے تھے مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر ان کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور پھر وہ فوراً کمرے سے باہر چلے گئے۔ کمرے سے باہر مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ بلاشبہ میں بالکل تندرست تھا کیونکہ میرے ذہن میں لاتعداد سوال اٹھ رہے تھے اور ان کا جواب بھی مل رہا تھا۔ پھر میری نظریں ان سب لوگوں کا جائزہ لینے لگی، میں خصوصاً عورتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک ایک چہرہ میرا جانا پہچانا تھا اور پھر حیران رہ گیا۔ دائیں کونے میں ایک لڑکی کھڑی تھی مگر اس کا چہرہ مخالف سمت میں تھا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی پشت میری جانی پہچانی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اس لڑکی کو کہیں دیکھ چکا ہوں مگر کب، کہاں، کیسے؟ اس سوال کا جواب میرا ذہن دینے سے قاصر تھا۔ یک دم نامعلوم کیا بات ہوئی کہ وہ لڑکی پیچھے پلٹ پڑی اور میری نگاہوں کے سامنے ستارے ناچ گئے۔ ذہن پر زور سے گھونسا پڑا اور دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی، سانس حلق میں اٹک سی گئی۔ وہ، وہی تھی، وہ جانِ دل بہار جو مجھے آسمانوں کی سیر کرائی رہی۔ مجھے اپنی قربت کی خوشبو سے مدہوش کرتی رہی مگر اب تو وہ یوں انجان اور لاتعلق سی کھڑی تھی جیسے میرا اس کا کوئی ناتا نہ ہو۔ پھر وہ دھیرے دھیرے ایک ایک قدم میرے دل کی دھڑکنوں پر رکھتی ہوئی مجھ تک آپہنچی۔ میں حیرانی سے پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتا گیا۔

''کیا دیکھتے ہو بیٹا! تمہاری منگیتر ہے۔'' کسی عورت نے مجھے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر وضاحت کی۔

اور پھر میرے ذہن کی کرچیاں سمٹنے لگیں۔ دھند غائب ہوگئی۔ سارا غبار دھل گیا اور وہ خوشبوؤں کی ملکہ میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

''نئی زندگی مبارک ہو، آپ کو۔'' اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے میرے ماتھے کو چھوا اور پھر شرما کر کمرے سے باہر دوڑ گئی۔

بعد میں مجھے گھر والوں نے بتایا کہ ہم دونوں سمندر کے کنارے چہل قدمی کررہے تھے کہ ایک بڑی سی لہر ہم دونوں کو بہا کر لے گئی۔ وہ اتفاق سے بچ گئی مگر میں زندہ رہنے کے باوجود بے ہوش تھا۔ میری بے ہوشی ڈاکٹروں کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی، ان کا کہنا تھا کہ کوئی معجزہ ہی مجھے زندگی عطا کرسکتا ہے۔ بس اس ایک معجزے کے انتظار سے ان کی امید وابستہ تھی۔ میری نبض کبھی ڈوبتیں اور پھر سانس کی ڈور ٹوٹنے سے قبل ہی ابھر آتیں۔ پورے پندرہ روز موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد آج میری سانس بحال ہوگئی۔

''میں زندہ بچ جانے پر اتنا خوش نہیں تھا جتنا اس کے مل جانے پر۔ وہ میری زندگی کی ساتھی تو تھی ہی لیکن اس نے موت کی کشمکش میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر جب اس نے میرا ہاتھ چھوڑا تو بھی زندگی سے ہمکنار کردیا۔ بلاشبہ وہ میری زندگی تھی۔''

شاطر

حسن علی

کار کی پہلے پچھلی سیٹ سے دنوں آدمی اترے اور ایک نے آگے بڑھ کر سہیل کی طرف کا دروازہ کھولا۔ دوسرے آدمی کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی گرفت پستول پر ہے۔ سہیل اطمینان سے نیچے اترا اور سوالیہ نظروں سے ڈرائیو کرنے والے غیر ملکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر وہ سب بلڈنگ میں داخل ہو گئے۔

اس شمارے کی جاسوسی کہانی

محکمہ خارجہ کے ہیڈ کلرک رشید نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تھکن سے بھرپور انگڑائی لی اور اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل بند کر کے قریب پڑے ہوئے بیگ میں رکھ لی آفس بالکل خالی ہو چکا تھا۔ چھٹی کے وقت جب اس کے ساتھیوں نے اس سے چلنے کو کہا تھا تو اس نے کام کی زیادتی کا بہانہ بنا دیا تھا۔ اس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر راہداری میں نکل آیا۔ راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا جس میں سیکورٹی آفیسر بیٹھا کرتا تھا۔ ہر شخص کو باہر جانے سے پہلے اس کمرے میں سے گزرنا پڑتا تھا۔

''مسٹر رشید! کیا میں یہ بیگ دیکھ سکتا ہوں۔'' سیکورٹی آفیسر نے کہا۔

''ضرور کیوں نہیں.....'' رشید نے بیگ آفیسر کی طرف بڑھایا۔

آفیسر نے کھڑے ہو کر بیگ لیا اور کھول کر

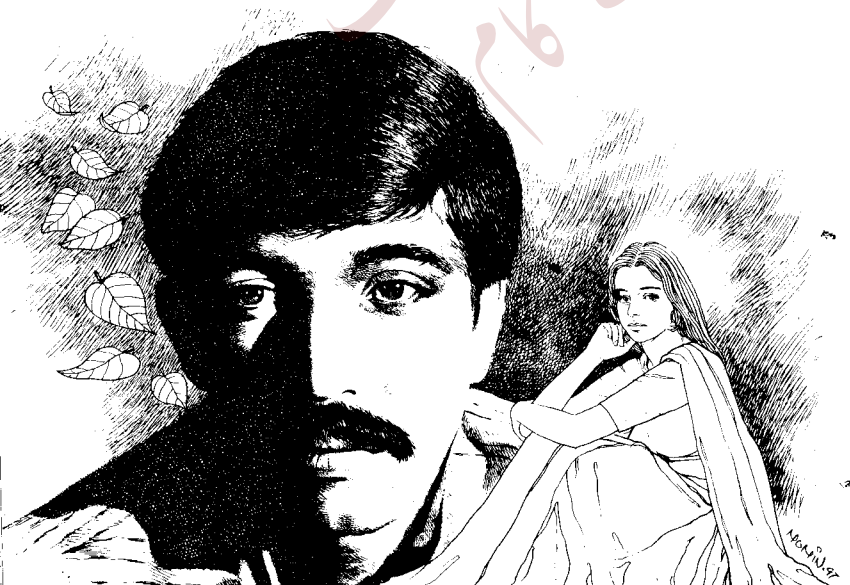

... ہوئے سوال کیا۔ ”مسٹر رشید! آپ کے ... ہیں یہ فائل کیسی ہے۔“

اچانک رشید نے اس کی طرف چھلانگ لگائی اور اس کو ساتھ لیتا ہوا فرش پر گرا۔ گرتے گرتے اس نے سیکورٹی آفیسر کی گردن پر اپنی انگلیاں جما دیں اور گرفت کو سخت کرتا چلا گیا۔ سیکورٹی آفیسر نے اس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ مگر رشید پر کچھ ایسی جنونی کیفیت طاری تھی کہ آفیسر کی گردن کو مرنے کے بعد ہی چھٹکارا ملا۔ رشید نے اسے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اپنے کپڑے ٹھیک کیے۔ میز پر سے بیگ اٹھا کر بند کیا اور اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

سہیل اور رشید گہرے دوست تھے اور مدت سے ایک ہی فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ دونوں ہی اکیلے تھے۔ قریبی رشتہ داروں میں سے بھی کوئی موجود نہیں تھا۔

سہیل کسرتی جسم کا خوب صورت قد آور جوان تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں اس نے خاصی ترقی کی تھی۔ اس نے کئی دفعہ رشید کو اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی مگر نہ جانے کیوں رشید نے ہر دفعہ اسے ٹھکرا دیا...... دونوں شطرنج کے دھنی تھے اور خالی اوقات میں شطرنج ہی کھیلا کرتے تھے۔ کمرے میں ہر وقت ایک بساط بچھی رہتی اور مہرے سجے رہتے۔ کبھی کبھی تو ایک بازی کئی دن چلتی رشید کا دوسرا شوق جوئے کا تھا اور جوئے میں ہارنا اس کا مقدر تھا۔ مگر وہ کھیلنے سے باز نہیں آتا تھا۔

سہیل صوفے پر لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ کہانی خاصی دلچسپ تھی مگر اس کا دل پڑھنے میں قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مستقل رشید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا اور وہ غائب تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ جس دن رشید غائب ہوا اسی دن اس کے آفس کا سیکورٹی آفیسر بھی قتل ہو گیا اور ایک انتہائی اہم فائل بھی آفس سے غائب تھی۔ آفیسر کا قتل اور فائل کی چوری دونوں رشید ہی سے منسوب کیے جا رہے تھے۔

سہیل نے اس کو ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کر لی تھی اور وہ ناکام رہا تھا۔

اس وقت وہ کتاب پڑھتے پڑھتے اچانک اچھل پڑا۔ سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ دراصل اس کے زیر مطالعہ کہانی روحوں سے متعلق تھی۔ مگر جب اسے احساس ہوا کہ وہ آواز ٹیلی فون کی گھنٹی کی تھی تو خود ہی جھینپ گیا۔

”سہیل۔“ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”میں شہلا بول رہی ہوں...... کیا بات ہے تم کئی دن...... سے دفتر میں نہیں آئے اور گھر پر بھی نہیں ملے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ایسا ہی ضروری کام تھا کہ میں تم سے بھی نہیں مل سکا۔“

”ایسا کون سا کام ہو سکتا ہے کہ تم مجھے بھی فراموش کر دو۔“

”میں تمہارے پاس آ رہا ہوں وہیں بتاؤں گا۔“ سہیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تو پھر جلدی آؤ...... میں انتظار کر رہی ہوں۔“ شہلا نے ریسیور رکھ دیا۔

سہیل نے بھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ کال بیل کی آواز گونجی۔

”یہ کون آ مرا۔“ سہیل نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا...... اور جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کے سامنے رشید کھڑا تھا اپنی منفرد مسکراہٹ کے ساتھ۔

”تم......!“ سہیل کو جھٹکا لگا۔

”کیوں...... تعجب ہوا مجھے دیکھ کر......“ رشید نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔...... آخر تم اتنے

ان کہاں غائب رہے اور یہ فائل اور قتل وغیرہ کا
یا چکر ہے۔'' سہیل نے لگاتار سوال داغے۔
''دھیرج..... دھیرج میرے بھائی.....
ب کچھ بتادوں گا مگر ابھی نہیں..... ابھی تو مجھے دو
یک کام اور نمٹانا ہیں۔'' سہیل نے ایک لمحے کے
لیے کچھ سوچا اور پھر گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔
''تمہاری یہ غیر متوقع آمد میرے لیے اتنی
سنسنی خیز ہے کہ اگر میں نے شہلا سے ملاقات کا
عدہ نہ کرلیا ہوتا تو تمہاری کہانی سننے کو ضرور رکتا۔
بہر حال میں جلد ہی لوٹنے کی کوشش کروں گا۔''
''نہیں تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ..... بہت
تھکے ہوئے نظر آتے ہو۔''
''ہاتھ تھکا ہوا تو ہوں لیکن ایک کام بیحد
ضروری ہے۔ تم نے ملنے کے لیے اتنا بیتاب تھا
کہ بھول گیا۔ خیر اب میں تمہارے ساتھ ہی چلتا
ہوں۔ راستے میں اتر جاؤں گا۔ اچھا وہ کام اسی
وقت ہو جائے گا۔''
''ٹھیک ہے تم بیٹھو میں کپڑے تبدیل کر کے
آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سہیل اندرونی کمرے کی
طرف مڑ گیا۔
خوب صورت شہلا سہیل کی سیکرٹری تھی اور
یک اوسط درجہ کی بلڈنگ میں اکیلی رہ رہی تھی۔
س کی بیمار ماں سینی ٹوریم میں داخل تھی کوئی قریبی
عزیز نہ تھا اور چوتھے اس مشکل وقت میں پیٹھ دکھا
گئے تھے..... ماں کی بیماری ہی نے شہلا کو سڑکوں
کی خاک چھنوائی تھی..... اسی گردش دوراں میں
وہ سہیل سے ٹکرا گئی..... سہیل نے اس کے حالات
سے متاثر ہو کر اسے اپنی سیکرٹری بنالیا تھا..... پہلے
تو وہ اس سے صرف متاثر ہی ہوا تھا لیکن پھر اس
کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے جو
بالآخر گہری محبت میں تبدیل ہو گئے اور اب ان
دونوں کو ماں کے تندرست ہونے کا انتظار تھا۔
''تو پھر رشید تمہیں نہیں ملا۔'' شہلا نے کافی
کا کپ سہیل کی طرف بڑھایا۔
''ملا تھا..... جب میں یہاں آ رہا تھا اسی
وقت وہ بھی آ گیا۔ ہم دونوں گھر سے ساتھ ہی
چلے تھے مگر وہ راستے میں اتر گیا۔ میں نے اس
سے بہت پوچھا کہ اس دوران اس پر کیا گزری مگر
اس نے کچھ نہیں بتایا کہنے لگا' انتظار کرو بعد میں
بتاؤں گا۔''
''تو پھر کل سے تو دفتر آؤ گے نا۔'' شہلا نے
پوچھا۔ ''بہت کام جمع ہو گیا ہے۔''
''اوں' نہہ! دفتر کی باتیں دفتر میں..... اور
یہ تم وہاں کہاں بیٹھی ہوں' یہاں قریب آ کر
بیٹھو۔'' سہیل کے لہجے میں شوخی آ گئی۔
شہلا نے مسکرا کر انکار میں سر ہلا دیا۔ سہیل
نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کر خود ہی
اس کے پاس جا بیٹھا۔ ایک ہاتھ اس کے شانے پر
پھیلایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا کندھا پکڑ کر
اپنی طرف کھینچا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سہیل کے
سینے سے لگ گئی اور اپنے ہاتھ..... اس کی پیٹھ پر
پھیلا دیے..... سہیل نے اس کو اپنے سینے سے اور
قریب کرلیا۔
ابھی انہیں راز و نیاز کرتے کچھ ہی دیر ہوئی
تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔
''یہ کباب میں ہڈی کہاں سے آ گئی۔''
سہیل نے برا سا منہ بنایا۔
''پتا نہیں کون ہے۔'' شہلا نے سہیل کی
گرفت سے نکلتے ہوئے کہا۔
''تم بیٹھو میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سہیل
دروازے کی طرف بڑھا' ابھی اس نے دروازہ
پوری طرح کھولا بھی نہیں تھا کہ رشید اسے دھکا دیتا
ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے داہنے ہاتھ سے اپنا
پہلو دبا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے خون میں
تر تھے۔
''یہ کیا ہوا.....'' سہیل نے گھبرائی ہوئی
آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے رشید کو سہارا
دے کر کوچ پر لٹا دیا۔

''انہوں نے مجھے گولی ماردی۔'' رشید کمزور آواز میں بولا۔

''میں ڈاکٹر شاہد کو لے کر آتی ہوں۔ وہ یہیں قریب ہی رہتے ہیں۔'' شہلا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور باہر کی طرف دوڑی۔

''ڈاکٹر کچھ نہیں کرسکتا سہیل! خون بہت بہہ چکا ہے۔ تم میری بات غور سے سن لو۔'' رشید نے کہا۔

''تم بولو نہیں۔ بولنے سے کمزوری اور بڑھ جائے گی۔'' سہیل نے سمجھایا۔

''میری بات سنو سہیل کیونکہ پھر میں کبھی نہ بول سکوں گا۔ پوری بات سن لو بیچ میں مت بولنا۔'' رشید کی آواز ہلکی ہوگئی اور سانس پھولنے لگی۔

سہیل نے اضطراب کے عالم میں پہلو بدلا اور کچھ بولتے بولتے رک گیا۔ شاید اس نے بھی یہی سوچا ہو کہ رشید کا بیان سن لینا چاہیے۔ رشید نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم جانتے ہو جوئے کی لت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ روپے کی ضرورت رہی ہے۔ میری تنخواہ سے وہ ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں محکمے کے راز ایک دیسی عیسائی رابرٹ کے ہاتھ فروخت کیا کرتا تھا۔ اس سے مجھے اتنی آمدنی ہو جایا کرتی تھی کہ میں بے فکری سے جوا کھیلا کرتا تھا۔ اب سے کچھ دن پہلے رابرٹ نے ایک خاص فائل کا مطالبہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس فائل میں کیا ہے۔ یہ فائل محکمہ خارجہ کے سیکرٹری کے پاس رہا کرتی تھی۔ میں نے اسے وہیں دیکھا تھا۔ اس فائل کا معاوضہ مجھے امریکی کرنسی میں ملک سے باہر پچاس ہزار ڈالرمل رہا تھا۔ کافی بڑی رقم تھی میں للچا گیا اور فائل پہنچانے کی حامی بھرلی۔ دوپہر کو جب لنچ کا وقفہ ہوا اور سیکرٹری صاحب کھانا کھانے اپنے گھر گئے تو میں نے وہ فائل ان کے دفتر سے نکال لی۔ میں نے سیکورٹی آفیسر کو مارنے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا مگر پچویشن ایسی پیدا ہوگئی کہ مجھے اس پر حملہ کرنا پڑا۔ پھر بھی میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہوگیا ہے بہرحال فائل مجھے دوبئی میں رابرٹ کے پاس دو روز نیف کو پہنچانی تھی۔ وہیں مجھے معاوضہ ملتا۔ ساری باتیں پہلے ہی طے ہوگئی تھیں۔'' رشید خاموش ہوکر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

اس کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی لیکن وہ اپنی مضبوط قوت ارادی کے بل پر سب کچھ بتاتا چلا جارہا تھا۔ کئی لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

''رات کو مجھے دوبئی روانہ ہونا تھا۔ میں پہلے گھر گیا تھا مگر تم موجود نہیں تھے۔ گھر پر مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال آیا کہ شاید یہ فائل بہت ہی اہم ہو اور اس کے غیر ملکی ہاتھوں میں پہنچنے سے کوئی بڑا قومی نقصان ہو جائے..... میں اس خیال کی وجہ نہیں بتا سکتا۔ ظاہر ہے میں محب وطن تو تھا نہیں۔ پہلے بھی غداری ہی کرتا رہا تھا۔ جب اس خیال کی یورش بڑھی تو میں نے فائل میں سے اصلی کاغذات نکال لیے اور دوسرے کاغذات جو میں نے پہلے پائے تھے اس میں لگا دیئے۔ دوبئی میں میں نے نقلی فائل دوفسکی کے حوالے کی اور!..... مجھے پانی دو حلق خشک ہو رہا ہے۔'' رشید بولتے بولتے چپ ہوگیا اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور بدن پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ زبان میں لکنت پیدا ہوگئی تھی۔

''باقی باتیں پھر کر لینا۔'' سہیل نے پانی پلاتے ہوئے کہا۔

''پوری بات تو سن لو..... وقت بہت کم رہ گیا ہے اس نے پانی پی کر گہری سانس لی۔ ''میں نے دوفسکی سے رقم لے کر انہیں اصلی کاغذات سمیت دوبئی کے قومی بینک کے لاکر میں رکھ دیا۔ لاکر کا نمبر ایک سو ستر ہے اور وہ رشید عاقل کے نام سے لیا گیا ہے۔ لاکر کی چابی گھر میں شطرنج پر 'سیاہ بادشاہ' میں رکھی ہے تمہیں معلوم ہے! یہ مہرے

میں ہی خرید کر لایا تھا۔ سارے مہرے کھوکھلے ہیں اور شیشی کی طرح کھل جائے ہیں۔ جب تم یہاں آنے کے لیے کپڑے بدلنے گئے تھے تو میں نے وہ چابی بادشاہ میں رکھ دی تھی پھر میں راستے میں تمہاری گاڑی سے اس لیے اتر گیا تھا کہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا' ہوسکتا تھا تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا۔ دراصل دوفسکی کے آدمی میرے تعاقب میں تھے۔ وہ دبئی میں بھی سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہے تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے جو فائل انہیں دی ہے نقلی ہے اور اصلی فائل میں نے لاکر میں رکھ دی ہے۔ میں اپنی دانست میں ان کو غچہ دے کر یہاں آرہا تھا۔ جب میں یہاں کی گلی میں مڑا تو سامنے رابرٹ کھڑا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ مگر وہ پستول چلا چکا تھا۔ گولی لگتے ہی میں زمین پر گر گیا۔ اسے چابی کی تلاش تھی۔ مگر وہ ہوتی تو ملتی۔ پھر وہ مجھے ٹھوکر مارتا ہوا بھاگ گیا۔ کیونکہ فائر کی آواز کے باعث اسے خدشہ ہوگا کہ کچھ لوگ وہاں آنکلیں گے۔ وہاں سے میں' بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا۔'' یہ کہہ کر رشید خاموش ہوگیا اور نقاہت سے آنکھیں بند کرلیں۔

سہیل نے بھی ایسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا..... شہلا ابھی تک نہیں آئی تھی..... اچانک رشید کے جسم نے جھرجھری سی لی اور بالکل ساکت ہوگیا۔ سہیل گم صم بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور شہلا ڈاکٹر کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ سہیل نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر! تم نے بہت دیر کر دی۔ رشید تو بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اس کی ہر تکلیف ختم ہوگئی ہے۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''آئی ایم ساری مسٹر..... مس شہلا جب میرے گھر پہنچیں تو میں دوسرے مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا اسی لیے دیر ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں..... جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔'' سہیل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''پولیس کو فون پر اس کی اطلاع دینا ضروری ہے۔'' شہلا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

اس نے جیسے ہی اپنے فلیٹ کے سامنے کار روکی ایک پستول کی نال کھڑکی میں گھس آئی۔

''مسٹر سہیل! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ برابر والی سیٹ پر چلے جائیں.....'' کسی نے انگریزی میں کہا۔

سہیل نے گردن گھما کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی سفید فام تھا اور لہجے سے امریکی معلوم ہو رہا تھا۔ سہیل نے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر جیسے ہی سیٹ بدلی تو دو آدمی جو نہ جانے کہاں چھپے ہوئے تھے پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ یہ دونوں بھی غیر ملکی ہی تھے پستول والے شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد کار شہر کے ایک بارونق علاقے میں ایک بلڈنگ کے سامنے رکی۔ پہلے پچھلی سیٹ سے دونوں آدمی اترے اور ایک نے آگے بڑھ کر سہیل کی طرف کا دروازہ کھولا۔ دوسرے آدمی کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی گرفت پستول پر ہے۔ سہیل اطمینان سے نیچے اترا اور سوالیہ نظروں سے..... ڈرائیو کرنے والے غیر ملکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے سہیل کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سب بلڈنگ میں داخل ہوگئے۔ تیسری منزل پر ایک امریکن ٹائپ رائٹر کمپنی تھی..... اس کے ڈائرکٹر کے دروازے پر پہنچ کر آگے والے آدمی نے دستک دی اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے باقی لوگ سہیل کو گھیرے میں لیے ہوئے داخل ہوئے۔

کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی میز تھی جس کے گرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میز کے پیچھے ایک جسیم اور قد آور غیر ملکی کھڑا تھا۔

''خوش آمدید مسٹر سہیل۔'' غیر ملکی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں گراہم ہوں پیٹر گراہم ایف بی آئی کے ایشین ونگ کا انچارج۔''

سہیل نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ''یہ سارا کھیل میری سمجھ میں نہیں آیا مسٹر گراہم۔''

''ہمیں علم ہے کہ آپ کے دوست رشید نے جو فائل محکمہ خارجہ سے چرائی تھی' وہ دبئی بینک کے لاکر میں ہے۔ روسی ایجنٹ نے رشید کو جس وقت گولی ماری تھی اور اس کی تلاشی لی تھی' میرے آدمی اس کے قریب ہی تھے پھر میرے آدمیوں کے مشاہدے میں یہ بھی آیا کہ رشید زخمی حالت میں آپ تک پہنچا تھا' مرتے وقت رشید کے پاس صرف آپ ہی تھے کیونکہ وہ گولی لگنے کے کافی بعد تک زندہ رہا تھا اس لیے یقیناً اس نے آپ کو چابی کے بارے میں بتایا ہوگا ہمارا اندازہ ہے کہ چابی آپ کے فلیٹ میں کسی جگہ ہے۔''

''آپ خواہ مخواہ تقریر کر رہے ہیں مسٹر گراہم۔'' سہیل نے درمیان سے بات کاٹی۔ ''مجھے کسی چابی کا علم نہیں ہے۔''

''بہتر ہوگا مسٹر سہیل کہ آپ خود ہی چابی کا پتا بتا دیں۔ اس میں آپ کا فائدہ ہے۔''

''جب مجھے کسی چابی کا علم ہی نہیں تو پتا کیا بتا سکتا ہوں۔'' سہیل نے حجت کی۔

''آپ کو اس چابی کے پچیس ہزار ڈالر مل سکتے ہیں مسٹر سہیل۔'' گراہم نے پیش کش کی۔

اچانک سہیل نے سوچا کہ اس جھگڑے میں پڑنے سے بہتر ہے کہ قصہ ختم کرے اور چابی گراہم کو دیدے۔ لیکن پھر اس کو خیال آیا کہ..... اس لاکر میں کاغذات بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ اہم بھی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے گراہم کے پاس ان کا پہنچنا ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ لہٰذا بہتر یہ ہی ہوگا کہ کسی طرح ان غیر ملکیوں سے جان بچا کر دوبئی پہنچا جائے۔ لاکر سے رقم نکال کر اپنے قبضے میں کی جائے اور کاغذات لاکر اپنی حکومت کے حوالے کر دیے جائیں۔

یہ سب کچھ سوچ کر اس نے گراہم سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی چابی نہیں ہے۔''

''اچھی بات ہے مسٹر سہیل! آپ کل تک اچھی طرح سوچ لیں۔'' گراہم نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''لیکن بہرحال آپ کو مثبت فیصلہ ہی کرنا پڑے گا ورنہ چابی دوسری طرح حاصل کرلیں گے جو ظاہر ہے بہتر صورت نہیں ہو گی..... اب آپ جاسکتے ہیں۔'' گراہم نے گفتگو ختم کی اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

سہیل نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور وہ باہر نکل گیا۔ کھلے آسمان کے نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے گلوخلاصی ہو سکے گی۔

☆

سہیل نے گھر پہنچ کر دروازے کے آہنی قفل میں چابی گھمائی تو محسوس کیا کہ تالا کھلا ہوا ہے۔ اس نے تالے کا لٹو گھمایا اور آہستہ آہستہ دروازہ کھولا کمرے میں بالکل تاریکی تھی وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا ایک دم روشنی ہوگئی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں چند لمحوں کے بعد جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر ایک غیر ملکی ریوالور تانے بیٹھا ہے۔ دائیں بائیں دو مقامی آدمی ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور چہرے ہی سے غیر مہذب معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ایک طائرانہ نظر چاروں طرف ڈالی..... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زلزلہ آیا

ہو' کمرے کی کوئی ایک چیز بھی اپنی جگہ پر نہیں تھی اور یہی حالت سامنے والے کمرے کی تھی اس نے گھبرا کر کونے میں شطرنج کی میز کی طرف دیکھا۔ میز الٹی پڑی تھی اور مہرے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

''تم چابی کے بارے میں بتانا پسند کرو گے مسٹر سہیل۔'' غیر ملکی نے خاموشی کو توڑا۔

سہیل نے اطمینان کی سانس لی! اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں ابھی چابی نہیں ملی۔ سہیل نے غیر ملکی کے لہجے پر غور کیا۔ غالباً وہ کوئی روسی تھا۔

''عجیب بات ہے! چابی نہ ہوگئی مصیبت ہو گئی۔ سارا زمانہ ہی پیچھے پڑ گیا ہے۔ ابھی ایک کو بھگت کر آ رہا ہوں اب آپ سے نبٹوں۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''میں نہیں جانتا چابی کہاں اور کس کے پاس ہے۔''

''بہت خوب اچھی ایکٹنگ کر لیتے ہو۔'' غیر ملکی نے مسکرا کر کہا۔

''لیکن ابھی خود ہی بتا دو گے کہ چابی کہاں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے سہیل کے دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا..... وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور سہیل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ایک تو اس کی..... جسامت بھی کافی تھی اور دوسرے وہ کھڑا بھی اس طرح ہوا تھا کہ صوفے پر بیٹھا ہوا غیر ملکی اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

''بتا دو مسٹر سہیل! چابی کہاں ہے۔'' وہ غرایا۔

سہیل نے لاپروائی سے شانے اچکائے تو وہ ایک دم آگے بڑھا اور سہیل کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ سہیل اچھل کر پیچھے ہٹا مگر پھر بھی گھونسہ لگ ہی گیا۔ اس طرح لگنے والا گھونسہ بھی کئی میگاٹن طاقت کا تھا۔ سہیل دہرا ہو گیا۔ اس کے حواس منتشر ہو گئے تھے لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کر آہستہ آہستہ سیدھا ہوا..... اس نے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو گھور کر دیکھا اور پھر برق رفتار سرعت سے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر جوابی مکہ رسید کیا۔ یہ حملہ کچھ اتنا ہی اچانک تھا کہ دیو ہیکل شخص اپنا توازن کھو بیٹھا اور لڑکھڑا کر پیچھے بیٹھے ہوئے غیر ملکی پر اس طرح جا گرا کہ صوفہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ یہ دیکھ کر سہیل کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے پستول نکالا اور نالی کی طرف سے پکڑ کے دستہ اس کے سر پر رسید کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے سہیل بغیر کسی طرف دیکھے ڈھیر ہو گیا۔

ادھر دیو ہیکل شخص بڑی مشکل سے اٹھا اور پھر اس نے ہاتھ پکڑ کر غیر ملکی کو کھڑا کیا..... غیر ملکی نے جو سہیل کو زمین پر پڑے دیکھا تو اس آدمی کی طرف مڑا جس نے سہیل کو بے ہوش کیا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا رابرٹ۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔

''میں نے سوچا مسٹر سالیخوف کہ چابی رشید کے پاس بھی نہیں تھی اور یہاں گھر میں بھی نہیں ملی تو یقیناً اس کے پاس ہی ہو گی اور بے ہوشی کی حالت میں اس کی تلاشی آسانی سے لی جا سکے گی اور پھر یہ تکلیف وہ بھی ہوتا جاتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ پاس کھڑے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف مڑا۔

''اس کی تلاشی لو اچھی طرح بلکہ کپڑے اتار کر۔''

وہ آدمی نیچے جھکا اور ایک ایک کر کے سہیل کے تمام کپڑے اتار دیئے' کوٹ رابرٹ نے اٹھا لیا اور اس کی ایک ایک سلائی ادھیڑ دی مگر چابی کو ملنا تھا نہ ملی دوسری طرف باقی کپڑوں کا پوسٹ مارٹم بھی مکمل ہو چکا تھا اور وہاں بھی مایوسی ان کا مقدر بنی تھی۔

''لعنت ہو اس پر! پتا نہیں چابی کہاں چھپائی ہے۔'' رابرٹ نے زمین پر پڑے ہوئے سہیل کو ٹھوکر ماری۔ ''میرا خیال ہے سر! اب ہم چلیں' اسے پھر دیکھیں گے کیونکہ ہو سکتا ہے کوئی اور ٹپک

پڑے۔'' اس نے سالنجوف سے کہا۔

''ہوں! چلو مگر ایک آدمی باہر چھوڑ دو جو یہاں کی نگرانی کرتا رہے۔'' سالنجوف دروازے کی طرف بڑھا پھر اچانک رک گیا۔

''میرا خیال ہے رابرٹ تم خود ہی نگرانی کرو..... اور ہاں! آخری دفعہ یہاں کی تلاشی اور لے لو۔''

کافی رات گزر چکی تھی جب سہیل کی آنکھ کھلی اس نے فوراً اپنا سرٹٹول کر دیکھا سلامت تھا' وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیتابی سے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن سیاہ بادشاہ کہیں دکھائی نہیں دیا اسے اپنی برہنگی کا قطعی احساس نہیں تھا وہ تو پاگلوں کی طرح کمرے میں دوڑتا پھر رہا تھا ایک ایک چیز اٹھا کر پھینک رہا تھا کہ شاید کہیں بادشاہ مل جائے۔ مگر تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس نے سمجھ لیا کہ ان لوگوں کو چابی مل گئی تھی اور وہ لے گئے وہ تھک کر فرش ہی پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ برہنہ ہے۔ اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی پھر اپنے کپڑوں کو دیکھا جو فرش پر پڑے تھے لیکن وہ قطعی طور پر اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ..... پہنے جا سکتے..... وہ کاہلی سے اٹھا اور دوسرے کپڑے نکالنے کے لیے اندرونی کمرے میں داخل ہوا..... ابھی اس نے الماری کھولی ہی تھی کہ اس کی نظریں دروازے کے پٹ کے پیچھے پڑی ہوئی ایک سیاہ سی چیز پر پڑی وہ تیزی سے بڑھا اور اس کو اٹھا لیا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس بادشاہ کا سر الگ کیا۔ اندر خول میں ایک چابی جگمگا رہی تھی' اس نے مہرے کو ویسے ہی بند کر کے دروازے کے پیچھے ڈال دیا۔

دن کے گیارہ بجے ہوں گے جب وہ بستر سے اٹھا..... اٹھتے ہی اس نے دروازے کے پیچھے نظر ڈالی..... بادشاہ بدستور وہیں پڑا تھا..... غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بادشاہ کو اٹھایا اور اس میں سے چابی نکال لی..... پھر غسل خانے میں سے روئی اور چپکنے والے ٹیپ کے رول نکال لایا۔ رول میں سے تھوڑی سی روئی کاٹی اور اس میں چابی کو لپیٹا پھر مزید روئی رکھ کر بائیں بازو کے نیچے پسلیوں پر اس کو ٹیپ سے چپکا لیا۔ بظاہر دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زخم ہوگا جس پر ٹیپ چپکا ہوا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ کار میں بیٹھ کر چل دیا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

رابرٹ کچھ اتنی ہی احتیاط سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سہیل کی کار ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جہاں کوئی شریف آدمی داخلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس علاقے کی دنیا ہی الگ تھی۔ پورے شہر کے جرائم پیشہ شخص یہاں ملتے تھے۔ عجیب لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل تک ہو جاتے تھے۔ مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کچھ بول سکتا یہاں پر ایک عدد تھانہ بھی موجود تھا مگر پولیس کو کبھی تھانے سے باہر نہیں دیکھا گیا۔ خدا جانے اس کی کیا وجہ تھی وہ بھی غنڈوں سے ڈرتے تھے یا پھر.....

اسی علاقے میں پیڈرو کا ہوٹل بھی تھا پیڈرو اور سہیل کی ملاقات کاروبار کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ پیڈرو باہر سے شراب وغیرہ منگاتا تھا جو سہیل ہی کے توسط سے آتی تھی۔

ہوٹل اس وقت تقریباً خالی پڑا تھا۔ لیکن پیڈرو اپنے آفس میں موجود تھا۔

''اوہ! سہیل صاحب۔'' پیڈرو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کیوں تکلیف کی مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''تم سے ایک بہت ہی ضروری کام تھا..... اور میں انتظار قطعی نہیں کر سکتا تھا اس لیے خود ہی چلا آیا۔'' سہیل نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم وہ کام کر سکو گے۔''

''اگر پیڈرو کے بس میں ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ نہ ہو سکے۔''

''میں غیر قانونی طور پر دبئی جانا چاہتا ہوں..... وہاں مجھے ایک کام ہے جو انتہائی اہم نوعیت کا ہے..... کام مکمل ہونے پر مجھے واپس بھی آنا ہے اب تم بتاؤ میری کیا مدد کر سکتے ہو۔''

''بس اتنی سی بات..... آپ پیڈرو کے پاس آئے ہیں اور پیڈرو کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اٹھایا۔ نمبر ملا کر کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر ایک علاقائی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ یہ ساری گفتگو سہیل کے سر پر سے گزر گئی۔ بات ختم کر کے پیڈرو نے ریسیور رکھ دیا اور سہیل کی طرف مڑا۔

''آج شام چار بجے ایس ایس نندنی دوبئی جا رہا ہے۔ اس جہاز کا کیپٹن میرا دوست ہے اور پہلے بھی ایسے کام کرتا رہا ہے۔'' پیڈرو نے تفصیل سے سمجھایا۔ ''آپ چار بجے سے پہلے اس کے پاس پہنچ جائیے گا۔ یہ جہاز دو دن دوبئی رکے گا اور پھر یہیں واپس آئیگا۔ آپ اسی جہاز سے واپس بھی آ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے دو دن میرے کام کے لیے کافی ہیں۔''

''آپ ٹھیک وقت پر بندرگاہ پہنچ جائیے گا باقی تفصیلات کیپٹن دارا بتا دے گا..... رہا خرچے کا حساب کتاب تو وہ بعد میں ہو جائے گا میں خود بھی کیپٹن سے مل لوں گا۔''

''ایک بات اور!'' سہیل نے اچانک کہا۔ ''کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں' میں نہیں چاہتا کہ ان کو پتا چلے کہ میں دوبئی جا رہا ہوں۔''

''آپ ایسا کیجئے کہ پہلے یہاں آ جائیے۔'' پیڈرو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر مڑ کر اپنے پیچھے لگی ہوئی الماری کھولی اس میں کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں جن پر کوٹ اور جیکٹ ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے درمیان والی کھونٹی کو اوپر کی طرف اٹھایا۔ الماری کا پچھلا حصہ درمیان میں سے گھوم گیا۔ یہ دروازہ ایک سنسان گلی میں کھلتا تھا۔

''اس گلی میں آپ کو ایک کار تیار ملے گی..... آپ اس پر بندرگاہ جا سکتے ہیں۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ پیڈرو۔'' سہیل کا لہجہ تشکر سے بھرپور تھا۔ ''تم نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی۔''

''ہم تو آپ کے خادم ہیں صاحب آج آپ نے پہلی بار تو کسی کام کو کہا اور ہم وہ بھی نہ کرتے! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

☆☆☆

''باس! آج دن میں سہیل اپنے گھر سے ایک بدمعاش پیڈرو کے پاس گیا تھا۔'' رابرٹ نے ٹیلی فون پر سالیخوف کو رپورٹ دی۔ ''پیڈرو مڈل ایسٹ کے لیے آدمی اسمگل کرتا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا۔'' سالیخوف کی آواز آئی۔

''میرا خیال ہے کہ سہیل اب دوبئی جانا

مسکراہٹیں

مچھلی کے دو شکاری جھیل میں بنسیاں ڈالے بیٹھے تھے' ایک کی قسمت خوب یاوری کر رہی تھی' اس نے بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کر ڈور نکالی تو تقریباً آٹھ کلو کی مچھلی پھڑپھڑا رہی تھی' اس نے اس کا جائزہ لیا اور واپس جھیل میں چھوڑ دیا۔ اس نے دوبارہ ڈور ڈالی تو اس سے بھی بڑی مچھلی پھنس گئی' اس نے اسے بھی واپس پانی میں چھوڑ دیا۔

تیسری مرتبہ جو مچھلی پھنسی وہ بہ مشکل ایک بالشت کی تھی' شکاری نے تھیلے میں رکھ لیا' دوسرا شکاری پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔

''اصل میں ہمارے گھر میں بڑی دیگچی نہیں ہے۔'' پہلے شکاری نے جواب دیا۔

چاہتا ہے اور اسی لیے پیڈرو سے ملا تھا۔ میں بندرگاہ بھی گیا تھا وہاں پتا چلا کہ آج شام چار بجے ایک جہاز دبئی جا رہا ہے..... جہاز کا کیپٹن پیڈرو کا دوست ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سہیل اسی جہاز سے دوبئی جا رہا ہے۔''

''جی ہاں یقیناً یہی بات ہے۔''

''جہاز کا نام کیا ہے۔''

''ایس ایس نندنی۔''

''ٹھیک ہے تم نگرانی جاری رکھو میں ان سب باتوں کی اطلاع دوفسکی کو دے دیتا ہوں وہ جو مناسب سمجھے گا کرے گا۔'' یہ کہہ کر سالیخوف نے ریسیور رکھ دیا۔

رابرٹ بوتھ سے نکلا اور سہیل کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

سہیل نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے شہلا کو فون کیا اور اس سے فوراً پہنچنے کو کہا۔ اس کے بعد اپنا پستول نکالا اور کھول کر صاف کیا۔ پھر گولیاں بھر دیں۔ اپنا کوٹ اتار کر چمڑے کی جیکٹ پہنی اور اس کی اندر کی جیب میں کچھ فالتو راؤنڈ رکھ لیے۔ پھر الماری کھول کر نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور انہیں کھول کر تھوڑے تھوڑے نوٹ مختلف جیبوں میں رکھ لیے..... مسہری کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا اور الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر اس میں رکھنے لگا۔

ابھی اس نے سوٹ کیس بند ہی کیا تھا کہ کال بیل بجی اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا شہلا تھی۔

''کیوں کیا بات ہے۔ کچھ پریشان نظر آتے ہو۔'' اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''میں دوبئی جا رہا ہوں آج ہی۔''

''کیا مطلب۔''

''میں آج شام دوبئی جا رہا ہوں..... اس کام کو پورا کرنے جو رشید ادھورا چھوڑ گیا ہے۔''

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔'' شہلا نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''میری بات اطمینان سے سنو۔'' سہیل نے شہلا کو کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ ''میرا دوبئی جانا بہت ضروری ہے۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا اگر میں کسی وجہ سے واپس نہ آ سکا۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔'' شہلا روہانسی ہو گئی۔

''بھئی فرض کرو ایسی بات ہو ہی جائے تو..... اسی لیے میں نے یہ چیک بک سائن کر دی ہے۔ یہ سارے چیک سادے اور بیرر ہیں۔ یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔''

''مجھے نہیں چاہیے۔'' دولت اس کو تم ساتھ ہی لے جاؤ۔'' شہلا کو غصہ آ گیا۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ آخر میری غیر موجودگی میں آفس یا کسی اور کام کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑ ہی سکتی ہے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گی بہت سے بل وغیرہ بھی دینا ہیں یہ سب کون کرے گا! کیسے ہوگا چلو اچھے بچوں کی طرح چیک بک رکھ لو شاباش۔'' سہیل نے اس کا گال تھپتھپایا شہلا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بیٹھی رہی۔

سہیل کھڑکی کے قریب گیا اور پردہ ہٹا کر سڑک پر نظر ڈالی۔ دو آدمی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے مستقل طور پر بلڈنگ کے دروازے کی طرف گھور رہے تھے ان میں ایک تو گراہم کے ساتھی تھا اور دوسرا وہی شخص جس نے سہیل کو کمرے میں بیہوش کیا تھا۔

''ابھی میں ایک ہنگامہ کرنے والا ہوں' تم گھبرانا نہیں۔'' سہیل نے کہا۔

''کیا کسی قیمت پر یہ نہیں ہوسکتا کہ تم نہ جاؤ۔'' شہلا نے بات کاٹی۔

''ہاں اب ایسا نہیں ہوسکتا۔'' سہیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور بڑھ کر شہلا کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ ''دیکھو میرا انتظار کرنا میں ضرور آؤں گا۔''

شہلا نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اقرار میں گردن ہلائی کافی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے پھر سہیل نے خود کو الگ کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے پستول نکالا اور نال سامنے کی طرف اٹھائی اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

☆☆☆

باہر کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں نے اچانک سہیل کے فلیٹ سے دو فائروں کی آوازیں سنیں اور ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اندر کی طرف دوڑے..... دونوں ساتھ ہی دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوئے مگر یہاں بالکل سکون تھا' شہلا ایک صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

''وہ کہاں ہے۔'' رابرٹ نے پوچھا۔

شہلا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اس کی سرخ آنکھیں اب بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''وہ تو گیا۔''

اچانک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی..... رابرٹ اور دوسرا آدمی کھڑکی کی طرف لپکے۔ سہیل اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو چکا تھا رابرٹ تیزی سے باہر کی سمت بھاگا دوسرا آدمی جو غیر ملکی تھا شہلا کی طرف مڑا۔

''میرا نام کوپر ہے مس.....''

''شہلا.....'' شہلا کے منہ سے اچانک نکلا۔

''تو مس شہلا آپ بتائیں گی کہ مسٹر سہیل کہاں گئے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''اگر آپ ان کا پتا بتا دیں گی تو یہ ان کے حق میں اچھا ہوگا۔''

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' شہلا کا انداز معصومیت سے بھرپور تھا۔

''تو پھر آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''وہ کیوں۔''

''میں آپ کو اپنے باس کے پاس لیے چلتا ہوں..... وہی آپ سے سچ بات اگلوائیں گے۔''

''مگر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' شہلا نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

''ضد نہ کریں ورنہ مجبوراً مجھے سختی کرنی پڑے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے پستول نکال لیا۔

شہلا نے کوئی اور راہ نہ پاتے ہوئے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''اچھا..... چلو۔''

جب یہ دونوں گراہم کے آفس پہنچے تو وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا ان کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کیا بات ہے مسٹر کوپر.....! یہ کون ہے۔'' اس نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔

''سر! سہیل ہمیں دھوکہ دے کر فرار ہو گیا اور یہ اس کی محبوبہ شہلا ہیں..... مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور جانتی ہیں کہ سہیل کہاں گیا ہے۔''

''کیوں مس شہلا! آپ کو معلوم ہے سہیل کہاں گیا ہے۔'' گراہم اس کی طرف مڑا۔

''نہیں اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔'' شہلا نے انکار میں گردن ہلائی۔

''فکر نہ کریں مس شہلا..... سہیل کی زندگی خطرے میں ہے اور ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' گراہم نے شہلا کو سمجھایا۔ ''دیکھئے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔''

☆☆☆

جس وقت گراہم اور اس کے ساتھی بندرگاہ پہنچے تو کیپٹن دارا کا جہاز ساحل چھوڑ چکا تھا..... گراہم نے مایوسی سے اپنے ہاتھوں کو ملا اور واپس کار کی طرف مڑ گیا۔

ادھر رابرٹ فون پر سالیخوف کو بتا رہا تھا۔

''سر سہیل جہاز پر سوار ہو گیا ہے اور جہاز اب ساحل چھوڑ چکا ہے۔ اب بتائیے کیا کیا جائے۔''

''تم واپس آ جاؤ..... تمہارا کام اب ختم ہو چکا ہے۔ جہاز پر ہمارا آدمی موجود ہے وہ خود سہیل سے چابی وصول کر لے گا.....'' سالیخوف نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

جہاز پر پہنچ کر سب سے پہلے سہیل کی ملاقات جس شخص سے ہوئی وہ تھرڈ آفیسر تنویر تھا جس نے بتایا کہ کیپٹن دارا اس وقت مصروف ہے اور بعد میں اس سے ملاقات کرے گا۔ پھر وہ کیبن تک اس کے ساتھ آیا اور کیبن کو باہر سے بند کر کے چلا گیا۔ سہیل نے بہت کوشش کی کہ دروازہ کسی طرح کھل جائے۔ مگر وہ نہ کھلا۔ آخر تھک کر وہ کونے میں پڑے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا اور کیبن کا جائزہ لینے لگا۔ بڑا مختصر سا کیبن تھا۔ ایک بستر ایک چھوٹی میز اور ایک آرام کرسی' بس یہ تھی کل کائنات..... سہیل بستر پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھ لیے۔ وہ شدید الجھن میں تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ اس کے کیبن کو کیوں مقفل کیا گیا تھا۔

سات بجے کے قریب دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ سہیل نے گردن موڑ کر دیکھا یہ تنویر تھا۔

''آپ کو کیپٹن نے بلایا ہے۔''

سہیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ کیپٹن اپنے کیبن میں اکیلا تھا..... تنویر اسے وہاں پہنچا کر واپس چلا گیا۔

''مسٹر سہیل! مجھے یقین ہے کہ آپ کو جہاز پر کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہو گی۔'' اس نے پوچھا۔

''تکلیف تو نہیں' ہاں الجھن ضرور ہوئی۔'' سہیل نے جواب دیا۔ ''آخر میں قید میں کیوں ہوں۔''

''آپ قید نہیں ہیں بلکہ احتیاط ایسا کیا گیا ہے..... آپ غیر قانونی طور پر دوبئی جا رہے ہیں آپ کا آزادی سے جہاز پر گھومنا اور چلنا پھرنا آپ کے لیے اور پھر ہمارے لیے بھی بہتر نہیں ہے میں آپ سے فوراً نہیں مل سکا تھا آپ کو یہ بات سمجھا تا اس لیے آپ کو کیبن میں بند کر دیا گیا تھا۔''

''خیر..... ٹھیک ہے۔''

''دوسری بات دوبئی میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔'' کیپٹن نے بتایا۔ ''یہ پتا ہے۔'' اس نے ایک کارڈ سہیل کی طرف بڑھایا۔ ''اس پتا پر آپ کو ایک لڑکی سمیعہ ملے گی۔ اس کے پاس ایک ہی کمرہ ہے اور آپ کو اس کے ساتھ ہی ٹھہرنا ہو گا اس کو آپ کے پہنچنے کی اطلاع دیدی گئی ہے۔''

سہیل نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لیا اور پتا دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر سہیل اب آپ جا سکتے ہیں..... اور ہاں اپنے کیبن سے باہر مت نکلیے گا اب آپ کو بند نہیں کیا جائے گا۔''

رات کا کھانا کیبن میں ہی آ گیا تھا۔ سہیل نے کھانا ختم کیا ہی تھا کہ تنویر پہنچ گیا' اس کے ہاتھ میں تاش کی ایک گڈی تھی۔ جسے وہ مسلسل پھینٹ رہا تھا۔

''تاش کھیلیں گے سہیل صاحب۔''

''نہیں! اس وقت میرا ذہن اس قابل نہیں کہ تاش کھیل سکوں..... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

''مسٹر سہیل میں نے سنا ہے کہ آپ پیسے کے چکر میں دوبئی جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب۔''

''آپ خود سمجھ دار ہیں..... ویسے آپ کے پاس کوخزانے کی چابی ہے اگر وہ مجھے دیدیں تو کیسا رہے۔'' تنویر کھڑا ہوا مسلسل تاش پھینٹ رہا تھا۔

سہیل چونک پڑا اور جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''کیسا خزانہ۔''

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ کے پاس دوبئی بینک کے لاکر کی چابی ہے اس لاکر میں خاصی بڑی رقم اور قیمتی معلومات ہیں اطلاع دینے والے نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں وہ چابی ہر قیمت پر آپ سے حاصل کرلوں۔''

''یہ اطلاع تم کو کس نے دی۔''

''یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں..... وفسکی روز نیف نے۔''

''اوہ تو تم اس کے گرگے ہو۔''

''آپ کی دعا سے..... تو پھر لائیے چابی۔''

تنویر نے ہاتھ بڑھایا۔ سہیل نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ اٹھائی اور پوری طاقت سے تنویر کے پیٹ میں ماری' تنویر کیبن کے دیوار سے ٹکرایا..... سہیل اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ تنویر نے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور وہیں سے سہیل پر کھینچ مارا..... سہیل چاقو سے بچنے کے لیے ترچھا ہوا مگر پھر بھی چاقو اس کے بائیں شانے میں اتر گیا۔ درد کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی اس نے فوراً پستول نکالا اور تنویر کی طرف فائر کردیا' تنویر کی آنکھیں پھٹیں اور پھٹی ہی رہ گئیں' گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ فائر کی آواز سن کر کافی لوگ جمع ہوگئے تھے کیپٹن بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا پہلے تنویر کی طرف دیکھا مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا پھر اس نے فوراً سہیل کے کندھے سے چاقو کھینچ لیا اور بھیڑ کی طرف رخ کیا۔

''چلو تم سب لوگ یہاں سے جاؤ..... اور ڈاکٹر کو بھیج دو۔''

لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ کیپٹن نے اپنی جیب سے رومال نکال کر زخم پر رکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہوئی تھی۔''

''پانچ ہزار روپے مانگ رہا تھا جب میں نے انکار کیا تو دھمکیاں دینے لگا کہ ساحل پر اترتے ہی پکڑوا دوں گا وغیرہ وغیرہ جب میں نے برا بھلا کہا اور کہہ دیا کہ اس کی جو مرضی میں آئے کرے تو اس نے چاقو نکال لیا بلکہ مار بھی دیا میں کیا کرتا مجبوراً پستول چلانا پڑا۔''

''ہوں!'' کیپٹن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تنویر کے بارے میں پہلے بھی شکایتیں مل چکی ہیں وہ پہلے بھی مسافروں کو اسی طرح تنگ کر چکا تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔''

اتنے میں کیبن کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر بائیں ہاتھ میں بیگ..... اٹھائے اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر ان کے کندھے پر زخم ہے اسے دیکھیے۔ میں لاش اٹھوانے کا انتظام کرتا ہوں۔'' کیپٹن ڈاکٹر سے مخاطب ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر سہیل کی جیکٹ اتاری پھر قمیض بھی اتارنے لگا تھا کہ سہیل نے روک دیا۔

''ڈاکٹر قمیض نہیں اتاریئے بلکہ اوپر سے پھاڑ کر ڈریسنگ کردیجئے۔ میں بعد میں بدل لوں گا۔ اس وقت تکلیف زیادہ ہے۔ قمیض اتارنے سے اور بڑھ جائے گی۔''

ڈاکٹر نے قمیض کو شانے پر سے پھاڑا۔ زخم دھو کر ڈریسنگ کر دی اور گلے میں پٹی ڈال کر ہاتھ اس میں لٹکا دیا۔ پھر اپنے بیگ سے تین مختلف قسم کی گولیاں نکالیں اور سہیل کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ گولیاں کھا لیجئے مسٹر سہیل اور لیٹ جائیے ان سے آپ کی تکلیف بھی کم ہو جائے گی اور آپ سو بھی جائیں گے۔''

سہیل نے گولیاں کھالیں اور بستر پر لیٹ گیا اس مرتبہ صرف ایک ہی ہاتھ سر کے نیچے تھا۔

☆☆☆

اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور اب کوٹ پہن رہا تھا۔ پورے بازو میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں آخر اس نے کوٹ پہن ہی لیا۔ پستول نکال کر چیک کیا۔ جو چیمبر خالی تھا' اس میں نئی گولی ڈالی اور کوٹ کی داہنی جیب میں رکھ لیا۔

اب وہ کرسی پر بیٹھا کپتان کا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس سے کہہ کر گیا تھا کہ ہم دو گھنٹے میں پہنچنے والے ہیں۔ لہٰذا وہ تیار ہو جائے۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد کپتان آیا اور سہیل کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا..... راہداری طے کر کے یہ لوگ زینے پر پہنچے جو نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر دونوں ایک بڑے ہال میں پہنچے جو اوپر سے کھلا ہوا تھا۔ یہاں کارگو رکھا جاتا تھا لیکن اس وقت وہاں کچھ نہیں تھا۔

''مسٹر سہیل آپ یہ پیٹی دیکھ رہے ہیں۔'' کپتان نے لکڑی کی ایک قد آدم خالی پیٹی کی طرف اشارہ کیا جو ایک طرف سے کھلی ہوئی تھی۔

''آپ کو اسی پیٹی میں بند ہو کر شہر پہنچنا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ابھی آپ اس پیٹی میں بند کر دیئے جائیں گے۔ پھر کرین کے ذریعے آپ کو ساحل پر اتار دیا جائے گا۔ وہاں ایک پک اپ پر میرے آدمی آپ کو شہر پہنچا دیں گے' شہر میں ایک گودام ہے۔ وہاں آپ کو پیٹی سے نکالا جائے گا۔ پرسوں دس بجے اس گودام سے اسی طرح واپس یہاں پہنچا دیا جائے گا آپ کو ہر حالت میں دس بجے تک وہاں پہنچ جانا ہے کیونکہ اس کے بعد میرا کوئی آدمی وہاں نہیں رہے گا اور گیارہ بجے جہاز بھی ساحل چھوڑ دے گا۔''

''ٹھیک ہے..... دو دن میرے کام کے لیے کافی ہیں۔'' سہیل نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''چلیے تو پھر پیٹی میں کھڑے ہو جائیے۔''

سہیل آگے بڑھا اور پیٹی میں داخل ہو گیا پیٹی اس کے قد سے بڑی تھی' اس لیے وہ آرام سے کھڑا ہو گیا۔ پیٹی میں ہک بھی لگے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی گئی ہو اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دو آدمیوں نے ایک تختہ اٹھایا اور اس کو پیٹی کے کھلے ہوئے حصے پر رکھ کر کیلوں سے جڑ دیا..... پیٹی پر چاروں طرف' مجھے سیدھا رکھیے اور احتیاط سے اٹھائیے' لکھا ہوا تھا۔ تختے کی جڑائی کے بعد کپتان نے اشارہ کیا اور کرین نے پیٹی اٹھانی شروع کر دی۔

ساحل پر ایک کھلی ہوئی پک اپ تیار کھڑی تھی جس کے قریب تین آدمی موجود تھے پیٹی کو جیسے ہی گاڑی پر بار کیا گیا وہ تینوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

پیٹی کے تختوں کے درمیان کافی جگہ تھی جس کی وجہ سے سہیل کو ہوا بھی مل رہی تھی اور وہ چاروں طرف آسانی سے دیکھ بھی سکتا تھا۔

گاڑی کو چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تھی مگر شہر کا کوئی پتا نہ تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی نے پکی سڑک بھی چھوڑ دی اور کچے میں مڑ گئی۔ سہیل کو مسلسل دھچکے لگ رہے تھے۔ پھر اچانک گاڑی رک گئی۔ سہیل الجھن میں پڑ گیا۔ یہ تو ریت کے ٹیلوں سے ڈھکا ہوا کوئی ویرانہ تھا ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے سوچا اور پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر کچھ اس قسم کی آواز آئی جیسے کوئی کیلیں نکال رہا ہو جلد ہی تختہ الگ ہو گیا۔

''ہینڈز اپ!'' سہیل نے بڑی پھرتی سے پستول کا رخ اپنے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف کر دیا اور بولا۔ ''چلو ایک طرف ہٹو۔'' پھر وہ پک اپ سے نیچے کود گیا لیکن جیسے ہی اس کے پیر زمین سے لگے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا انجانے میں چوٹ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے زمین بوس ہوتے ہی وہ تینوں اس کی طرف جھپٹے۔ جیب میں جتنی بھی نقدی موجود تھی نکال لی اور ایک پک اپ میں بیٹھ کر یہ جا' وہ جا۔

کافی دیر بعد اس کو ہوش آیا اس نے گھبرا کر اپنی پسلی ٹٹولی' چابی اپنی جگہ موجود تھی پھر اس نے پستول ڈھونڈا وہ بھی ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے اس نے دانت پر

دانت جمالئے۔ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا جھک کر پستول اٹھایا اور ایک طرف چل دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ان تینوں آدمیوں نے اس کے ساتھ یہ حرکت کیوں کی۔ وہ تھے تو جہاز ہی کے آدمی ان کا تعلق دشمن سے ہرگز نہیں ہوسکتا اگر ایسا ہوتا تو وہ چابی تلاش کرتے مگر انہوں نے صرف نقدی اڑا لینے پر اکتفا کیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس قسم کی حرکتیں ان لوگوں کے ساتھ کرتے ہوں جو غیر قانونی طور پر دوبئی آئیں ظاہر ہے ایسے لوگ فریاد کے لیے پولیس کے پاس نہیں جاسکتے وہ سوچتا رہا اور چلتا رہا جیسے ہی وہ ایک موڑ پر گھوما اسے اپنے سامنے شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

☆☆☆

''اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوئی۔'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں اپنے آپ سے کہا۔ ''پہلے بھی دادا نے لوگ بھیجے تھے مگر وہ تو ہمیشہ وقت پر پہنچ گئے اس مرتبہ نہ جانے کیا بات ہو گئی۔''

سمیعہ بھی غضب تھی.....! سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں پھر اس پر جسم ایسا متناسب کہ نظر پڑے تو اس وقت تک نہ ہٹے جب تک کوئی دوسرا ٹھوکا نہ دے لباس کے معاملے میں بھی کافی باسلیقہ تھی۔ ہمیشہ چست ترین لباس پہنتی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہن کر سلوایا ہو خاصا وسیع کاروبار تھا۔ کیپٹن دارا کی کمیشن ایجنٹ تھی۔ اس کے بھیجے ہوئے لوگ پہلی رات اسی کے ہاں گزارتے تھے۔ اس طرح اس کا معاوضہ دوگنا ہو جایا کرتا تھا۔ کمیشن کے ساتھ ساتھ رات کا ایڈوانس الگ پھر خالی اوقات میں شہر..... بڑے حلقوں میں وہ کافی پسند کی جاتی تھی۔

اس نے بیٹھے بیٹھے برابر کی میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا ابھی پیکٹ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر کھڑے ہوئے نوجوان کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''اف! ایسا شاندار نوجوان تو برسوں ہی میں آتا ہے۔'' اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''اور یہاں کے شیخ..... ان میں تو بس بھوسا ہی بھرا ہوتا ہے۔''

اس نے پہلے سے زیادہ گہری نظروں سے نوجوان کا جائزہ لیا اور محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ نوجوان کچھ پریشان تھا۔ چہرے پر سفید پھیلی ہوئی تھی اور جسم کانپ رہا تھا۔

''میں..... میں سہیل ہوں اور مجھے کیپٹن دارا نے بھیجا ہے۔'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور الفاظ بڑی مشکل سے نکل رہے تھے۔

''آؤ! اندر آجاؤ..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' پھر اچانک اس کی نظر سہیل کی قمیض پر پڑی جو خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہو کر بولی۔ ''تم تو زخمی معلوم ہوتے ہو۔''

''ہاں..... چاقو کا زخم ہے راستے میں لٹیرے مل گئے تھے۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا سمیعہ نے فوراً اسے سہارا دیا۔ اپنا بایاں ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈالا اور اس کا ہاتھ اپنے شانوں پر پھیلا کر سہارے سے مسہری تک لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد سہیل کی سانسیں کچھ درست ہوئیں تو اس نے کہا۔

''میں اپنا زخم دھونا چاہتا ہوں۔''

''میں یہیں دھو دیتی ہوں۔'' سمیعہ کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور تھا۔

''نہیں نہیں میری حالت اتنی خراب نہیں کہ تمہیں تکلیف دوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی ایک کونے میں واش بیسن لگا ہوا تھا۔ ابھی اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور اس کا انجام۔ ایک دھماکہ جو اس نے گرنے سے ہوا تھا سمیعہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ پہلے ہیٹر آن

کر کے پانی رکھا پھر سہیل کے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے تھوڑا سا اٹھایا اور گھسیٹتی ہوئی کرسی تک لے گئی۔ اتنے بھاری آدمی کو اور وہ بھی بے ہوشی کی حالت میں کرسی پر ڈالنا اچھا خاصا مسئلہ تھا لیکن اس نے یہ مرحلہ بھی طے کر ہی لیا اور کسی نہ کسی طرح سہیل کو کرسی پر بٹھا دیا اس کھینچا تانی میں زخم سے خون پھر جاری ہو گیا تھا اس نے پہلے سہیل کا کوٹ پیچھے کیا پھر قینچی سے قمیض شانے پر سے کاٹ دی' پانی گرم ہو چکا تھا اس نے زخم دھو کر ڈریسنگ کر دی۔

تھوڑی دیر بعد سہیل نے آنکھیں کھولیں۔ سمیعہ مسہری پر نیم دراز اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا حال ہے۔'' سمیعہ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہاں مسہری پر آ جاؤ۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اٹھا نہیں جا رہا ہے۔''۔ سہیل کی آواز سے نقاہت کا احساس ہوتا تھا۔

سمیعہ مسہری سے اتری۔ ''لاؤ اپنا ہاتھ مجھے دو۔'' یہ کہہ کر وہ جھکی اور سہیل کا بازو اپنے شانوں پر پھیلا لیا۔ ''اب اٹھو۔''

سہیل نے کھڑے ہونے کی کوشش کی..... سمیعہ نے اسے اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ آخر وہ کھڑا ہو گیا..... سمیعہ اس سے بالکل لپٹی ہوئی تھی' اس کے بدن کی خوشبوئیں سہیل کو معطر کر رہی تھیں مگر اسے تو اپنا ہی ہوش نہیں تھا کوئی اور ہوتا تو کیا کچھ نہ کر بیٹھتا..... وہ مسہری پر پہنچ کر گر گیا سمیعہ نے اسے سیدھا کیا اور چادر گردن تک اڑھا دی پھر اپنے پرس میں سے دو گولیاں نکالیں اور اس کو کھلا دیں۔

سہیل کو ہلکا ہلکا بخار ہو گیا تھا۔ رات میں بخار اور تیز ہو گیا ساتھ ہی ساتھ سرسامی کیفیت بھی طاری ہوتی گئی۔ جیسے جیسے بخار کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا ہذیان بکنے کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ سمیعہ سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی خاموشی سے سنتی اور سگریٹ کا دھواں اڑاتی رہی۔ سہیل نے رشید کی موت سے اسٹارٹ لیا اور اب تک کے تمام واقعات دہراتا چلا گیا۔

سہیل کی آنکھ کھلی تو سمیعہ سامنے کرسی پر پڑی سو رہی تھی۔ اس کے سونے کا انداز کچھ اتنا پرکشش تھا کہ سہیل بےخود ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اچانک اس کی چیخ نکل گئی..... بازو میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی..... شاید اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی تھی..... چیخ سے سمیعہ کی آنکھ کھل گئی..... اس نے اپنی خمار آلود نگاہیں اوپر اٹھائیں اور سہیل مسحور ہو گیا اسے اپنی تکلیف کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا ہوا.....۔'' جلترنگ سا بجا۔

''کچھ نہیں..... ہاتھ دب گیا تھا۔'' وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا بولا۔

''اب کیسی طبیعت ہے۔'' سمیعہ نے کھڑے ہوتے ہوئے بجلی گرائی۔ اس کی انگڑائی کچھ ایسی ہی قیامت خیز تھی۔

''ٹھیک ہے بخار بھی اتر گیا اور اب درد بھی کم ہے۔''

''بینک کب جاؤ گے۔'' اس نے چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا بینک۔'' سہیل چونک پڑا۔

''وہی جس میں پچاس ہزار ڈالر رکھے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' سہیل کے منہ سے بےساختہ نکلا۔

''خود ہی پوری کہانی سنائی اور اب پوچھتے ہو کیسے معلوم ہوا۔''

سہیل چند لمحے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آہستہ سے کہا۔ ''گیارہ بجے جاؤں گا۔''

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد سہیل پھر لیٹ گیا۔ سمیعہ اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔

''بینک سے واپس کب آؤ گے۔ میں انتظار کروں گی۔'' سمیعہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''بس کام ختم ہوتے ہی آ جاؤں گا..... اور ہاں! ایک قمیض اور ایک کوٹ کی ضرورت ہے۔''

''قمیض تو ہے لیکن کوٹ نہیں ہے..... ہاں ایک جیکٹ ہے بعض لوگ اپنے کپڑے بھول جاتے ہیں۔''

''چلے گی بس تم جلدی سے نکال لاؤ۔''

''تھوڑی دیر اپنے پاس بیٹھنے تو دو۔'' سمیعہ نے منہ بنایا۔

''بعد میں! پہلے کام ہو جائے۔''

گیارہ بجے سے پہلے ہی سہیل تیار ہو گیا۔ قمیض تو اس کے جسم پر ٹھیک آ گئی مگر جیکٹ کچھ چھوٹی تھی اس لیے بٹن نہیں لگ سکے۔ اس کا ہاتھ گلے میں ایک پٹی کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کی انگلی میں بھی پٹی بندھوالی تھی۔ سمیعہ نے جب اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ بینک میں دستخط کرنے پڑتے ہیں لہٰذا اگر زخمی ہاتھ سے گڑبڑ بھی ہو جائے تو چلے گی' اس نے پستول جیکٹ کی جیب میں رکھا اور روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''احتیاط سے..... ہاں!'' سمیعہ نے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالیں اور سہیل نے گردن جھکا کر اس کے مرطوب ہونٹوں کی گرمی اپنے ہونٹوں میں جذب کر لی۔

وہ جس وقت دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کی نظریں کونے میں کھڑے گراہم کے ساتھی پر پڑیں..... وہ چونک پڑا مگر اس نے خود کو سنبھالنے میں بمشکل چند لمحے صرف کیے اور اطمینان سے اس کی طرف بڑھا اس نے سہیل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو خود بھی اس کی طرف بڑھا' سہیل اس کے قریب پہنچا اور بغیر کچھ کہے سیدھے ہاتھ کا گھونسہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا..... وہ بغیر کوئی آواز نکالے ڈھیر ہو گیا دروازے میں کھڑی ہوئی سمیعہ نے یہ منظر دیکھ کر تالیاں بجائیں..... سہیل نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

لاکر روم بینک کے تہہ خانے میں بنا ہوا تھا۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک لوہے کا جنگلا تھا بالکل حوالات کی طرح! جنگلے کے پیچھے ایک ڈیسک کلرک بیٹھا تھا جس کے برابر میں ایک رائفل بردار چوکیدار کھڑا تھا۔

''میں اپنے لاکر میں سامان نکالنا چاہتا ہوں۔'' سہیل نے کلرک سے کہا۔

''نام اور نمبر بتائیے۔''

''ایک سو سترہ..... رشید عاقل۔''

کلرک نے قریب رکھے ہوئے کارڈ کیبنٹ سے ایک کارڈ نکالا اسے دیکھا اور چوکیدار کو اشارہ کیا۔ اس نے جنگلے کا دروازہ کھول کر سہیل کو اندر بلا لیا کلرک نے سہیل کا نیچے سے اوپر تک جائزہ لیا۔

''آپ کچھ زخمی معلوم ہوتے ہیں..... سیدی رشید۔''

''ہاں! کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

''اوہ.....! مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔ آپ کا ہاتھ زخمی ہے لیکن اس کارڈ پر آپ کے دستخط بہت ضروری ہیں۔''

سہیل نے غور سے کارڈ کو دیکھا۔ اس پر رشید کے دستخط پہلے سے موجود تھے۔ اس نے ڈیسک سے قلم اٹھایا اور اوپر والے دستخط دیکھتے ہوئے تقریباً ویسے ہی دستخط نیچے کر دیے۔ کلرک نے کارڈ اٹھا کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے رکھ لیا۔

''آیئے۔'' اس نے میز کی دراز سے ایک چابی نکالی۔

میز کے پیچھے ایک اور سلاخوں والا دروازہ تھا اسے کھول کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے..... کمرے میں ایک طرف والٹ کا دروازہ تھا جس پر نمبروں والا تالا لگا ہوا تھا۔

کلرک نے آگے بڑھ کر نمبر ملائے پھر دروازے کے برابر دیوار پر لگا ہوا لوہے کا پہیہ گھمایا۔ جس سے دروازہ کھل گیا۔ اندر کمرے میں ایک طرف بہت سے کیبن بنے ہوئے تھے اور باقی تین اطراف میں لاکرز پھیلے ہوئے تھے۔ کلرک ایک لاکر کے قریب پہنچا اور چابی لگا کر گھمائی لاکر کھل گیا اس میں ایک ٹین کا بکس رکھا تھا سہیل نے وہ بکس نکال لیا۔

''یہ سامنے کیبن بنے ہوئے ہیں آپ وہاں جا کر اپنی چیزیں بکس میں سے نکال لیں۔'' کلرک نے لاکر بند کرتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ کام مکمل کر چکیں تو یہ بٹن دبا دیجئے گا۔'' اس نے دروازے کے پاس لگے ہوئے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں دروازہ کھول دوں گا۔''

سہیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کلرک نے والٹ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر بند کر دیا۔ سہیل نے ایک کیبن میں جا کر بکس کھولا جو اوپر تک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

☆

دوفسکی روز نیف ساحل ہی سے سہیل کے پیچھے لگا ہوا۔ تھا اس کو سمیعہ کے گھر تک پہنچا کر وہ سیدھا بینک آ گیا تھا اور کل سے اب تک بینک کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اس نے سہیل کے اندر جانے کے بعد تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ ایک لاکر اپنے نام کرائے پر لیا اور کارڈ لے کر نیچے تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ ڈیسک کلرک نے کارڈ لے کر چابی اور لوہے کا ایک بکس اس کو دیا اور اس کے ساتھ لاکرز روم میں پہنچ کر بولا۔ ''آپ کیبن میں جا کر اپنا سامان اس بکس میں بند کر دیں۔ پھر گھنٹی بجا کر مجھے بلا لیجئے گا۔''

اس نے گھنٹی کا بٹن دکھایا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

دوفسکی نے غائر نظروں سے کیبنوں کی طرف دیکھا مگر وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ سہیل کس کیبن میں ہے۔ وہ ایک کیبن میں گھسا اور دروازے میں جھری پیدا کر کے کھڑا ہو گیا پستول اس کے ہاتھ میں تھا کچھ ہی دیر بعد ایک کیبن کا دروازہ کھلا سہیل بکس اور کاغذ کا تھیلا بغل میں دبائے باہر نکلا۔

''ٹھہرو.....!'' ذوفسکی نے باہر نکل کر اس کو ٹوکا۔ سہیل اچھل پڑا پھر پلٹ کر دیکھا۔ ''کون ہو تم..... اور یہ کیا مذاق ہے۔'' اس کا اشارہ پستول کی طرف تھا۔

''جواب نہیں معصومیت کا!..... یہ تھیلا مجھے دیدو۔'' دوفسکی نے سہیل کے بغل میں دبے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم ہو کون..... ویسے تم گولی نہیں چلا سکتے پکڑے جاؤ گے۔'' سہیل غیر محسوس انداز میں دروازے کی طرف کھسک رہا تھا۔

''میں دوفسکی ہوں دوسری بات! والٹ کسی بھی بینک کے ہوں ہمیشہ ساؤنڈ پروف ہوتے ہیں۔ اس لیے میرے پکڑے جانے کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔''

سہیل اتنی دیر میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا کرتے ہو.....'' دوفسکی چلایا اور فائر کر دیا۔ گولی لگتے ہی سہیل بغیر گھنٹی بجائے زمین پر گر پڑا۔ مگر گرتے گرتے بھی اس نے اپنا پستول نکال لیا اور دوفسکی پر فائر کر دیا۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں لگی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ زمین پر پڑے پڑے سہیل کو احساس ہوا کہ گولی تو اس کے لگی ہی نہیں وہ حیران ہو کر اٹھا۔ خود کو ٹٹول کر دیکھا صحیح سالم تھا۔ دیوار کو دیکھا وہاں بھی کوئی

نشان نہیں تھا بڑا پریشان ہوا۔ آخر گولی کہاں گئی' اس نے تھیلا اور بکس اٹھایا۔ بکس میں کوئی چیز بولی۔ اس نے بکس کو دیکھا تو اس میں ایک طرف سوراخ تھا اور دوسری طرف گڑھا پڑ گیا تھا۔ اس نے بکس کو چوم لیا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس نے بکس کو دوفسکی کی لاش پر رکھا اور لاش کو کھینچ کر کیبن میں بند کر دیا۔ بٹن دبا کر کلرک کو بلایا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

بینک کی سیڑھیاں اتر کر اس نے سواری کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں..... سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی..... اس نے سوچا کہ آگے بڑھ کر شاید کوئی سواری مل جائے..... ابھی اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اس کے دماغ میں چاند سورج' مریخ' زہرہ' پتا نہیں کیا کیا طلوع ہوئے اور غروب ہو گئے۔ سر پر پڑنے والی ضرب کچھ اتنی ہی شدید تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہسپتال میں پایا۔ سامنے کرسی پر گراہم بیٹھا ہوا تھا..... وہ سہیل کو ہوش میں دیکھ کر اس کے قریب آیا۔

''کیسے حال ہیں۔''

سہیل کچھ نہ بولا خاموشی سے اس کو گھورتا رہا۔

''تم جیسا بے وقوف آدمی میں نے نہیں دیکھا۔'' گراہم کا لہجہ غصیلا تھا۔'' وہ چابی ہمیں دیدیتے تو آرام سے اپنے گھر پر ہوتے۔''

''لیکن میں وہ کاغذات اپنی حکومت تک پہنچانا چاہتا تھا۔''

''ہم نے بھی وہ کاغذات تمہاری ہی حکومت کو پہنچائے ہیں۔ ہماری اور تمہاری حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ ان کاغذات میں اسی کی تفصیلات تھیں۔ ان تفصیلات کا وقت سے پہلے ظاہر ہونا تمہارے ملک کے لیے بہتر نہیں تھا اسی لیے ہم اور خود تمہاری حکومت ان کے حصول کے لیے بے چین تھے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ کاغذات صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئے۔'' سہیل کے لہجے میں اطمینان تھا۔

''یہ لو اپنی تھیلی..... اس میں وہ ساری رقم ہے جو تم نے بینک سے نکالی تھی ہم تمہیں پچاس ہزار بھی دے سکتے تھے تم ہم سے کہتے تو.....'' گراہم نے کاغذات کی تھیلی سہیل کی طرف بڑھائی۔

''ایک بات اور مسٹر گراہم.....! آپ کو میرے یہاں آنے کا پتا کیسے چلا۔''

''شہلا سے..... وہ اس وقت ہوٹل الفانسو میں ٹھہری ہوئی ہے اور میرے آدمی اس کی حفاظت کر رہے ہیں..... مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ذوفسکی کے آدمی اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔''

گراہم نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور سہیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔'' جب تم یہاں سے ڈسچارج ہو تو اس آدمی سے مل لینا یہ تمہیں تمہارے ملک پہنچا دے گا۔''

''ایک آخری کام اور مسٹر گراہم..... اس رقم میں سے دس ہزار ڈالر نکال کر سمیعہ کو پہنچا دیجیے..... وہی لڑکی جس کے پاس میں ٹھہرا تھا۔''

گراہم نے تھیلے سے رقم نکالی اور فرش پر رکھے ہوئے ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔'' یہ تحفہ کیپٹن دارا نے بھیجا ہے جو تم اس کے جہاز پر چھوڑ آئے تھے۔''

وہ سوٹ کیس..... کرسی پر رکھ کر خدا حافظ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سہیل نے آنکھیں بند کر لیں اور شہلا کے تصور میں گم ہو گیا۔

باحوصلہ عورت

ماریہ عرفان

صہبا اختر کا شعر....
نکلے ہو دشت میں تو کھلے آسماں کے ساتھ
یہ آندھیاں بھی اہل سفر ناگزیر ہیں
وہ بھی دشت حالات میں کھلے آسماں تلے آگئی تھی اور اس نے آندھیوں میں بھی سفر کرکے دکھا دیا کہ ہمت مرداں تو مدد خدا۔

ایک باحوصلہ عورت کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی معاشرتی کہانی

میرے گھر میں کل تین افراد تھے، ابا، اماں اور میں۔ ہمارا گھر اونچی سی ایک پہاڑی پر تھا۔ میں چونکہ اکلوتی تھی اس لیے لاڈلی بھی بہت تھی۔ گھر میں غربت تو تھی مگر ابا اور اماں کی محبت نے یہ کمی پوری کردی تھی۔ ہر طرف خوشیاں تھیں، سکون تھا۔ ان دنوں ابا تو کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے۔ ''اب تو اکیلی نہیں رہے گی۔ ہمارے گھر میں ایک ننھا مہمان آنے والا ہے۔''

پھر اچانک گھر میں گویا زلزلہ آ گیا۔ سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ آیا تو کوئی نہیں، ماں چلی گئی، ہمیشہ کے لیے۔

عزیز رشتے دار کچھ دن رسم دنیا نبھانے کو رہے، پھر ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ اب سارے گھر میں یا تو ابا ہوتے یا میں یا پھر ہمارے مویشی اور اماں کی پالی ہوئی ڈھیر ساری مرغیاں۔ میری عمر آٹھ دس سال تھی۔ کام مجھے کوئی آتا نہیں تھا۔ ابا ہی سارے کام کرتے تھے، مجھے جانور چرانے بھیج دیتے یا مرغیوں کی رکھوالی کرنا اور انہیں بند کرنا میرا کام رہ گیا تھا۔

اماں کی زندگی میں بھی ابا انڈے لے کر نیچے بستی میں بیچنے جاتے تھے۔ اب بھی وہ یہی کام کرتے تھے۔ وقت تو جیسے تیسے گزر رہا تھا مگر گھر بہت ویران سا لگنے لگا تھا۔ میں جانور چراتے ہوئے، کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر ماں کو یاد کرکے خوب روتی۔ میرا دل چاہتا کہیں سے ماں کو ڈھونڈ کر لے آؤں۔

کئی سال تک زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ میں ان دنوں تیرہ چودہ سال کی تھی۔ جب ابا مجھے لے کر رشتے داروں کے گھر شادی میں گئے۔ ان کا گاؤں کچھ میل دور تھا۔ وہاں قریب کے کسی گاؤں کی کوئی لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کچھ دن بعد وہ مرد اس لڑکی کو چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ لڑکی کسی نہ کسی طرح گاؤں واپس آ گئی۔ گھر والوں نے اسے مارا پیٹا اور گھر میں بند کردیا، ایک تو وہ تماشا بن گئی، پھر گاؤں کے لوگ انہیں طعنے دینے لگے کہ کیسے بے غیرت لوگ ہیں۔ لڑکی منہ کالا کرآئی ہے اور یہ اسے قتل کرنے کے بجائے گھر میں لیے بیٹھے ہیں۔ انہیں غیرت سے کیا مطلب۔

ابا کے رشتے دار زور دیتے رہتے تھے کہ دوسری شادی کراؤ۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر زور دیا۔ وہ اصل میں ابا کی شادی اس لڑکی سے کروانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ابا کو پوری بات نہیں بتائی، صرف اتنا کہا کہ لڑکی کا باپ بہت مجبور ہے، چپ چاپ نکاح

کر کے بیٹی کو رخصت کر دے گا۔ تم بس ہاں کر دو۔

ابا کے بہن بھائی بھی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی رشتے داروں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ دراصل وہ سب جان چھڑانا چاہتے تھے۔ لوگ انہیں طعنے دیتے تھے کہ کیسے بہن بھائی ہیں، بھائی کا گھر اجڑا مگر یہ لوگ پوچھتے بھی نہیں۔ وہ بے چارہ گھر اور باہر کے سب کام خود ہی کرتا ہے۔ ابا کو صرف یہ بتایا گیا کہ لڑکی عمر میں تم سے کافی چھوٹی ہے۔ مفت میں شادی ہو رہی ہے، ظاہر ہے بری وغیرہ تو بنانی نہیں ہے۔ ویسے کا بھی کوئی چکر نہیں ہے۔ ایسا موقع پھر کب ملے گا۔

ان کے اصرار پر آخر ابا راضی ہو گیا۔ وہیں نکاح ہوا۔ واپسی پر ہمارے ساتھ نئی اماں بھی تھیں۔ گھر آ کر میں نے اسے غور سے دیکھا، خاصی بد صورت سی تھی، میری ماں تو خوب صورت تھی۔ میں بھی شکل و صورت میں ماں پر گئی تھی۔ نئی ماں اپنا موازنہ مجھ سے کرتی تو مارے حسد کے سلگنے لگتی۔ ابا کہتے کہ اسے ماں کہا کر۔ میں اسے ماں کہتی تو وہ طوفان آتا کہ تھمنا مشکل ہو جاتا۔ نئی ماں کا نام رشیدہ تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصی بڑی تھی مگر دیدہ دلیری سے خود کو میری ہم عمر کہا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ میرا نام لیا کرو۔ میں اس کا نام لیتی تو پاس پڑوس کی عورتیں بھی مجھ ہی کو برا بھلا کہتیں۔ ابا کے سوا میرا تو کوئی پرسان حال بھی نہیں تھا۔ ایک خالہ رشیدہ گاؤں میں بیاہی تھی، دوسری کی شادی شہر میں ہوئی تھی مگر وہ دونوں تو خود دبوسی تھیں۔ ایک ماموں بھی تھا۔ وہ بیوی سے اتنا ڈرتا تھا کہ بہنوں کا نام تک نہیں لیتا تھا، ہاں وہ شہر والی خالہ کے پاس کبھی کبھار چکر لگا لیا کرتا تھا۔ شہر والے خالو کسی ایسے سرکاری محکمے میں تھے جہاں رشوت کا بازار گرم تھا۔ رشوت کی کمائی سے انہوں نے انتہائی شان دار گھر بنا لیا تھا۔ گاڑی بھی تھی، آج کل انہی لوگوں کی تو قدر ہے جن کے پاس پیسا ہو۔ خواہ وہ پیسا کسی بھی ذریعے سے آیا ہو۔ میرے لیے ان خالاؤں اور ماموں کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ بہر حال مجھے رشیدہ کے ساتھ گزارہ کرنا تھا۔ چند ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ رشیدہ کو اس شخص کی بے وفائی کا دکھ ہے جو اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، جن حالات میں اس کی شادی ابا سے ہوئی، اسے اس کا بھی دکھ تھا، پھر یہ کہ ابا اسے پسند نہیں آئے تھے۔ اسے تو ہمارا گھر بھی پسند نہیں آیا تھا۔ شاید اسے اور بھی کسی بات پر صدمہ ہو مگر وہ سب کا غصہ مجھ پر اتارتی تھی۔ یونہی مزید چار برس بیت گئے۔

پھر نہ جانے کیسے اچانک رشیدہ مجھ پر مہربان ہو گئی۔ اس وقت تک اس کے تین بچے ہو چکے تھے، مجھے اس کے بچے بھی سنبھالنا پڑتے تھے۔

ایک دن میں بچوں کو سلا کر فارغ ہوئی تھی کہ رشیدہ میرے پاس آئی اور ملائمت سے بولی۔ ''رضیہ مجھ سے دوستی کرے گی؟''

میں نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا، یہی سمجھی کہ یہ اس کی کوئی نئی چال ہے۔ ''میں۔۔۔ تمہاری۔۔۔ دوست؟''

شروع شروع میں تو مجھے یقین نہ آیا مگر جب وہ واقعی میرے ساتھ سہیلیوں کی طرح پیش آنے لگی تو مجھے یقین کرنا پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روز کی مار پیٹ، گالم گلوچ اور ڈھیر سارے کاموں سے کچھ تو جان چھوٹے گی، اس لیے وہ مجھے خود سے بڑا کہتی تو مان جاتی۔ اس نے جب دوبارہ دوستی کی بات کی تو میں خوشی خوشی مان گئی۔

''اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہماری کسی بات کا تیرے ابا کو پتا نہ چلے، ہم ہر معاملے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔'' رشیدہ نے کہا۔

مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، میں نے فوراً اس کی یہ شرط مان لی۔

رشیدہ نے کہا۔ ''مجھے اسی گھر میں رہنا ہے چار پیسے ہاتھ میں ہوں تو میں گھر کی حالت سدھاروں۔ ہماری کچھ زمین بے کار پڑی ہے۔ ایسا کرتے ہیں اس پر سبزیاں اگاتے ہیں۔ اس سے کچھ پیسے ہاتھ میں آئیں گے۔''

ہماری چار پانچ کنال زمین تھی۔ رشیدہ نے اس پر کیاریاں بنا کر سبزیاں لگا دیں۔ اس کے پاس کچھ روپے بھی تھے، ان پیسوں سے اس نے کچھ مرغیاں مزید خرید لیں۔ ابا پہلے کی طرح انڈے فروخت کرنے جایا کرتے تھے۔ زمین ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ابا کے جانے کے بعد رشیدہ دن میں کئی بار زمین پر جاتی تھی۔ کبھی پودوں کو پانی دینے، کبھی گوڈی کرنے۔ اکثر وہ گھنے درختوں کی طرف یہ کہہ کر چلی جاتی کہ دل گھبرا رہا ہے۔

ایک دن یونہی رشیدہ سبزیاں دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ میں گھر کے کام میں مصروف تھی۔ ہمارے گھر کی چار دیواری نہیں تھی۔ میں کمرے سے باہر آئی تو مجھے ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ مجھے اشارے کر رہا تھا۔ میں ڈر گئی کہ یہ چاہتا کیا ہے۔ میں اتنی وحشت زدہ ہوئی کہ گھر اور بہن بھائیوں کو یونہی چھوڑ کر بھاگی اور رشیدہ کے پاس پہنچی تو وہاں ایک نیا تماشا منتظر تھا۔ وہ کسی مرد کے ساتھ تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔ مرد بھی بوکھلا کر بھاگ گیا۔

رشیدہ نے اپنا لباس درست کیا اور خوشامد بھرے انداز میں بولی۔ ''دیکھ، ابا کو کچھ مت بتانا۔ ہم تو آپس میں دوست ہیں۔ تیرے ابا کو پتا چلے گا تو وہ نہ جانے کیا کرے۔'' وہ یونہی خوشامدیں کرتی ہوئی گھر تک آ گئی۔

میں نے اسے تسلی دی کہ گھبراؤ مت، میں ابا کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔

میری تسلی پر اس کے حواس بحال ہوئے تو میرے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے اس آدمی کے بارے میں بتایا جسے دیکھ کر میں بھاگی تھی۔ اس نے مرد کا حلیہ پوچھا، پھر ہنس کر بولی۔ ''میرے پیچھے آیا ہوگا۔ تو نظر آئی تو تجھ پر ڈورے ڈالنے لگا۔''

میں تو خاصی خوف زدہ تھی، مگر رشیدہ نے مجھے اتنی خوب صورتی سے سمجھایا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ اس نے مردوں سے دوستی کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ میں ان غلط باتوں کو درست سمجھنے لگی۔ میرا ڈر خوف نکل گیا۔۔۔ بس ایک جھجک سی رہ گئی۔

اب رشیدہ اپنے کسی دوست سے ملنے جاتی تو مجھے بتا کر جایا کرتی تھی۔ اس دوران میں کوئی آ جاتا اور رشیدہ کے بارے میں پوچھتا تو میں بے دھڑک جھوٹ بول دیتی، کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیتی۔ رشیدہ مجھے انہی ملاقاتوں کے قصے نمک مرچ لگا کر سنایا کرتی۔ میں اب بھی پہلے کی طرح گھر کے تمام کام کرتی تھی، سارا دن کام کر کر کے تھکن سے چور ہو جاتی مگر اتنا ضرور تھا کہ اب رشیدہ مجھ سے لڑتی نہیں تھی۔ نہ خود مجھے مارتی، نہ الٹی سیدھی شکایتیں کر کے ابا سے پٹواتی۔ میں اسی میں خوش تھی۔

رشیدہ کی گندی صحبت میں رہ کر اور اس کی باتیں سن سن کر میرا جی بھی چاہنے لگا کہ میری بھی کسی مرد سے دوستی ہو، کوئی مجھے بھی چاہے مگر رشیدہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ میں اپنے طور پر سوچتی رہتی تھی کہ کس سے دوستی کروں۔ آس پاس کے جن مردوں کو میں جانتی تھی، انہی کے بارے میں سوچتی تھی مگر یہ سوچ ذہن میں ہی رہ جاتی۔ ابھی تک کسی مرد سے میرا واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے مجھ میں ایک جھجک سی تھی۔

ابا تو دن بھر انڈے اور سبزیاں بیچتا تھا۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے، رشیدہ انہیں بھی کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیا کرتی تھی۔ گھر میں ہم ہی ہوتے تھے۔ ایک دن رشیدہ کسی مرد سے مل کر آئی تو بولی۔ ''رضیہ آج تو میں پھنستے پھنستے بچی۔''

''کیسے۔۔۔؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہ جو ہماری پڑوسن ہے شیداں، وہ اچانک آ گئی۔ شکر ہے اس کی نظر کمزور ہے ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے مگر کبھی تو بندہ پھنس سکتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اب میں مردوں سے باہر نہیں ملوں گی۔ اس میں بہت خطرہ ہے۔ گھر میں ہمارے علاوہ ہوتا ہی کون ہے۔ اب میں مردوں کو یہیں بلا لیا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا۔'' اس نے میری حمایت چاہی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر

ہمت کر کے بولی۔ ''تو اچھی دوست ہے رشیدہ! خود تو پتا نہیں کس کس سے ملتی ہے۔ میں تیرا ساتھ دوں، تیرے راز چھپاؤں گھر کے کام بھی میں کروں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میری کسی مرد سے دوستی ہو۔ اچھی دوست ہے تو، میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔''

''ہائے۔۔! ایسا سوچنا بھی نہیں۔'' رشیدہ نے خوف زدہ ہو کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''تیرے ددھیال اور ننھیال والے وپسے تو مجھے پوچھتے نہیں مگر کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو میں پھنس جاؤں گی۔''

''مجھے تو کبھی کچھ نہیں ہوا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

''تو ابھی لڑکی ہے، دنیا کی اونچ نیچ کا تجھے کچھ پتا نہیں۔ صرف مجھ سے سن سن کر باتیں بنا سکتی ہے، تجھے ان مردوں کی فطرت کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو دور سے میٹھا سیب نظر آتے ہیں، قریب جاؤ تو پتا چلتا ہے۔''

میری سمجھ میں رشیدہ کی باتیں نہیں آئیں، میں منہ بنا کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس کے بعد بھی کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

کبھی کبھار ہمارے گھر کوئی رشتے دار بھی آ جایا کرتا۔ ایک دن شہر والی خالہ کا منجھلا بیٹا شیراز آ گیا، اس نے بتایا کہ اس کے ابا نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ نویں میں پاس ہی نہیں ہوتا تھا۔

خالہ کا سب سے بڑا بیٹا بھی پانچویں چھٹی سے بھاگ گیا تھا۔ خالو نے گاؤں میں اس کی شادی کر کے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ باقی تین بیٹے اس کے ساتھ شہر میں تھے اور پڑھتے تھے۔ اب خالہ کا ایک بیٹا بھاگ کر ہمارے گھر آ گیا تھا۔

''تو بھائی کے گھر چلا جا۔'' رشیدہ نے تجویز دی۔

''ابا نے اسے منع کر دیا ہے کہ مجھے گھر میں نہ گھسنے دے۔'' شیراز منہ بنا کر بولا۔ ''مامی! اب تو بھی مجھے گھر سے نکال رہی ہے۔''

''نہیں شیراز!'' رشیدہ مسکرائی۔ ''یہ پہلے تیری خالہ کا گھر تھا، رضیہ کا ابا رشتے میں تیری ماں کا بھائی بھی لگتا ہے۔۔۔ تو اب یہ تیرے ماموں کا گھر ہے۔ میں نے تو یونہی کہا ہے۔ تیرا ابا مزاج کا سخت ہے۔ کل کلاں کو ہمیں آ پکڑے تو۔۔۔؟''

''وہ یہاں نہیں آئے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہاں کوئی سہولت نہیں ہے میں بھلا کیسے رہ سکوں گا۔''

پہلے پہل تو رشیدہ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی مگر جلد ہی بے زار ہو گئی۔ اس کی آزادی میں جو خلل پڑ رہا تھا۔ اس نے شیراز کو ابا کے ساتھ بستی میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔

''رضیہ! میں چاہتی ہوں تیرے لیے شیراز ٹھیک رہے گا، شہر میں اتنا اچھا گھر ہے۔ عیش کرائے گا تجھے۔ موٹر میں گھومنا اس کے ساتھ۔''

''خالو مان جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسے نہیں مانے گا، بس میں شیراز سے تیری بات کروا دیتی ہوں۔''

پھر رشیدہ، شیراز کو پتا نہیں کیا پٹیاں پڑھاتی رہی وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ ادھر وہ مجھے سمجھاتی کہ اس سے ایسے باتیں کرو، ایسے باتیں کرو۔ آہستہ آہستہ میری بھی جھجک دور ہو گئی پھر میں اور شیراز تو ایک دوسرے میں گم ہی ہو کر رہ گئے۔ اب تو وہ ابا کے ساتھ بھی نہیں جاتا تھا۔ رشیدہ نے یہ سب کر تو دیا مگر اس کا اپنا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت بے چین، بے چین رہتی تھی۔ شیراز کی وجہ سے وہ کسی کو گھر بھی نہیں بلا سکتی تھی۔ اس نے شیراز کو مشورہ دیا کہ گھر والوں کو لے کر رشتہ مانگنے آؤ۔ دیر مت کرو۔ اس نے کچھ اس طریقے سے یہ بات کی کہ شیراز فوراً شہر چلا گیا۔

اس نے گھر جا کر میرے بارے میں بات کی۔ خالہ تو مان گئیں مگر حکم تو خالو کا چلتا تھا۔ وہ پرلے درجے کے بدمزاج اور لالچی تھے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ شیراز ماں کے پیچھے پڑ گیا تو خالہ مجبور ہو گئیں اور بہانے سے گاؤں آ گئیں۔ اس نے ابا سے بات کی۔ ابا نیم راضی ہو گئے۔ رشیدہ نے مشورہ دیا کہ راتوں رات ان دونوں کا نکاح کر دیتے ہیں کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ وہ بہت چالاک بلکہ مکار

عورت تھی۔ اس نے سب کچھ اپنی مرضی سے کروایا۔

اس کی ایک سوتیلی بہن کافی دور ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ رشیدہ ہم سب کو لے کر وہاں چلی گئی اور میرا نکاح شیراز سے کردیا گیا۔ خالہ وہیں سے واپس شہر چلی گئیں۔ شیراز چند دن چھپ کر ہمارے گھر رہا، پھر وہ بھی واپس چلا گیا۔

رشیدہ نے مشہور کردیا کہ اس نے میرا نکاح اپنے کسی رشتے دار سے کرادیا ہے۔ وہ کراچی میں ملازمت کرتا ہے۔

اب شیراز کو مجھ سے ملنا ہوتا تو پیغام بھیج دیتا۔ ہم رشیدہ کی بہن کے گھر دو چار دن رہتے، پھر وہ اپنے گھر چلا جاتا اور میں اپنے گھر آجاتی۔ جب میں آجاتی تو رشیدہ سب کو یہی بتاتی کہ کراچی سے اس کا شوہر آیا ہوا تھا۔ رضیہ اس سے ملنے گئی ہے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیسی شادی ہے، پھر لڑکا یہاں کیوں نہیں آتا۔ رشتے داروں نے خوب خوب باتیں بنائیں۔ آخر سب تھک ہار کر خاموش ہوگئے۔

پھر میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ بیٹے کی پیدائش پر خالہ شہر سے خوب تحفے تحائف لے کر آئیں۔ شیراز بھی ماں کے ساتھ یوں آیا جیسے خالہ زاد کو بچے کی مبارک باد دینے آیا ہو۔ خالہ نے بتایا کہ شیراز سے چھوٹے بیٹے فاروق کی شادی انگلینڈ کی کسی لڑکی سے ہورہی ہے۔ لڑکی کا باپ خالو کا دوست تھا۔ ان کا سارا خاندان انگلینڈ میں تھا، کاروباری لوگ تھے، فاروق بھی شادی کے بعد انگلینڈ جانے والا تھا۔ خالہ چاہتی تھیں کہ میں بھی شادی میں شرکت کروں اس لیے انہوں نے فاروق کی شادی ملتوی کردی تھی۔

''لڑکی اور فاروق ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اسی کی مرضی سے شادی ہورہی ہے۔'' شیراز خالہ کی طرف دیکھ کر مجھ سے بولا۔

''خالہ! فاروق کی مرضی چل گئی، خالو کو مجھ میں کیڑے نظر آئے تھے۔'' مجھے غصہ آگیا۔

''تو خالو کی نظر میں اس جیسی نہیں ہے نا'' خالہ بے بسی سے بولیں۔

میری حالت سنبھلی تو خالہ نے مجھے شادی میں شرکت کے لیے شہر بلالیا۔

شادی میں شیراز آتے جاتے بچے مجھ سے لے کر اسے پیار کرنے لگتا۔ ایک بار خالو نے دیکھ لیا تو منہ بنا کر بولے۔ ''تو کیا آتے جاتے بھانجے کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ کہا تھا کہ باہر ٹینٹ لگوادے۔''

''بھانجے کو۔'' میں اور شیراز بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

ایک عورت بولی۔ ''لگتا ہے شیراز کو اس بچے سے بہت پیار ہے۔''

''بھانجا ہے تو پیار تو ہوگا۔'' خالو نے کہا۔ ''یہ لڑکی شیراز کی خالہ زاد ہے، گاؤں سے آئی ہے۔''

یہ سن کر شیراز غصے میں مٹھیاں بھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اصولاً تو پہلے شیراز کی شادی کرنا چاہیے تھی۔'' ایک اور عورت بولی۔ ''پرائے بچے اٹھائے پھر رہا ہے۔''

اس بات پر خالو پھٹ پڑے۔ ''زرافے جیسا قد ہے، اس شیراز کا مگر عقل نام کو نہیں ہے۔ نہ تعلیم، نہ نوکری، نہ کوئی اور خوبی۔ اس زرافے کو کون قبول کرے گا۔ یہ کوئی کام دھندا کرے تو شادی کے بارے میں بھی سوچا جائے۔''

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شیراز اکیلے میں ملا تو میں اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گئی اور خالو کی کہی ہوئی بات بتادی۔

''ذرا ذرا سی بات دل پر نہ لے لیا کرو۔'' شیراز نے کہا۔

''میں تیرا ہوں، فکر مت کر۔ میں کہیں شادی کرنے نہیں جارہا۔''

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو میں بیٹے کو لے کر گاؤں لوٹ آئی۔

شادی میں خالو نے محسوس کرلیا تھا کہ شیراز مجھ پہ کچھ زیادہ ہی ملتفت ہے۔ بچے کو بھی وہ سارا وقت

گود میں لیے پھر رہا تھا۔ وہ تجربے کار آدمی تھے۔ انہیں مجھ پہ اور شیراز پہ شبہ ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ انہوں نے شیراز کے کہیں آنے جانے پر پابندی لگا دی۔ رشیدہ مجھے ورغلانے لگی کہ شیراز باپ کے کہنے پر کہیں شادی، منگنی کے چکر میں ہو گا اسی لیے تو آیا نہیں۔ تو اس سے طلاق لے لے۔ میں نے رشیدہ کی ہر بات مانی تھی مگر اس بات پر اسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ اپنے دوستوں کو اب بھی گھر بلاتی تھی۔

ایک دن اتفاق سے میں نے اس کی باتیں سن لیں۔ وہ کمرے میں کسی مرد کے ساتھ تھی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ تو فکر مت کر۔ تیرا کام ہو جائے گا۔ بس میں نے اس کی یہ شادی ہی اس لیے کرائی تھی کہ اسے طلاق ہو جائے اور وہ رلتی پھرے۔ پھر وہ تجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔''

اس کی یہ زہریلی باتیں سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ وہ رشیدہ جس کے کالے کرتوتوں پر میں پردے ڈالتی رہی، اس نے مجھے اس کا یہ صلہ دیا تھا۔

میں ایک بار پھر امید سے تھی۔ انہی دنوں میں ایک بیٹی کی ماں بھی بن گئی۔ خالہ اور شیراز کو اطلاع دی گئی مگر وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ میں ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ بچی شدید بیمار ہو گئی۔ رشیدہ نہ جانے اسے کہاں لے گئی۔ واپس لے کر آئی تو بتایا کہ میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا ہے، دوا بھی لے آئی ہوں۔ ٹھیک ہو جائے گی مگر بچی اسی دن مر گئی۔

ایک تو شیراز کی بے رخی، پھر بچی کی موت کا صدمہ۔ میں اس بری طرح بلک بلک کر روئی کہ ابا گھبرا کر اسی دن شیراز کو لینے شہر چلے گئے۔

دوسرے ہی دن شیراز ابا کے ساتھ گاؤں آ گیا۔ میں نے اسے رشیدہ کی ساری باتیں بتا دیں، شیراز نے کہا۔ ''اب میں تمہیں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ ہم کل ہی شہر جائیں گے۔''

شیراز جوش میں آ کر مجھے اور بچے کو شہر لے تو آیا مگر وہاں پہنچ کر اسے ہوش آیا کہ نہ جیب میں پیسے ہیں، نہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا ہے۔ وہ ہمیں کہاں رکھتا۔ وہ کافی دیر لاری اڈے پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر بہت سوچنے کے بعد بولا۔ ''تم یہیں رکو، میں کسی بہانے سے ابا سے پیسے لے کر آتا ہوں۔''

شیراز کے جانے کے بعد مجھے خوف نے گھیر لیا۔ پہلی دفعہ اس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھی تھی۔ آتے جاتے لوگ مجھے گھور رہے تھے۔

خدا خدا کر کے شیراز واپس آیا اور بولا۔ ''ابا سے تو پیسے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی، چوری کر کے لایا ہوں۔ امی سے کہہ آیا ہوں، دوست کی والدہ بیمار ہیں، رات کو وہیں رکوں گا۔''

''تو خالہ ہی کو ساری بات بتا آتے۔'' میں نے کہا،

''وہ اپنے سیدھے پن میں اگل بیٹھیں تو میں پھنس جاؤں گا۔'' شیراز نے کہا۔

رات گئے تک شیراز کرائے کا مکان تلاش کرتا رہا، اسے ایسے مکان کی تلاش تھی جس کا کرایہ نہایت کم ہو۔ خاصی تلاش کے بعد ہمیں چھوٹا سا ایک مکان مل گیا۔ اس میں مختصر سا صرف ایک کمرا اور چھوٹا سا صحن تھا۔ کچن وغیرہ کی سہولت نہیں تھی البتہ گیس پانی اور بجلی موجود تھی۔ اس سے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ پہلی رات ہم گندے فرش پر سوئے۔

صبح صبح شیراز نکل گیا۔ میں نے گھر کی صفائی ستھرائی کی۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ شیراز کا گیا دوپہر کو لوٹا۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا بھوکی پیاسی تھی، میری بھڑاس نکل چکی تو شیراز کہنے لگا۔ ''غصہ کیوں کرتی ہو۔ میں بارہ سو روپے کی نوکری کرتا ہوں۔ وہ بھی ابا لے لیتے ہیں۔ میں اس امید میں تھا کہ ابا گھر سے نکلیں تو میں پیسے چرا لوں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی ابا نکلے ہیں تو پیسے چرا لایا ہوں۔''

''اب تم چوریاں کر کے ہی گزارا کرنا۔''

نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ایسے کب تک کام چلے گا۔''

''ابھی تو کام چل جائے گا۔'' شیراز نے کہا۔

''اپنے دوست سے دو چارپائیاں مانگ کر لایا ہوں۔ گھر سے بستر چرائے ہیں، دو چادریں لایا ہوں، دو چار برتن، کھانا اور بچے کے لیے دودھ بھی لایا ہوں۔''

''خالہ نے دیکھا تو نہیں؟''

''وہ سوگئی تھیں۔'' اس نے کہا۔

وہ اپنی چوری کا حال سنا رہا تھا اور مجھے غصہ آ رہا تھا۔

پھر اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ شیراز کبھی آتا تھا، کبھی موقع نہ ملتا تو نہ آتا۔ اس کی چوریوں سے گزارا ممکن نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر ماں بننے والی تھی۔ پڑوس کی ایک عورت سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ شوہر کی ملازمت نہیں ہے۔ میں بھی کام کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی کام مجھے بھی لا دو۔ اس نے مجھے لحافوں میں ڈورے ڈالنے سکھا دیے اور کہا کہ تم یہ کام شروع کر دو۔

پھر میں لحافوں میں ڈورے ڈالنے لگی۔ کبھی کام مل جاتا، کبھی کئی کئی دن تک نہ ملتا۔ میں اس کام سے بھی مایوس ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔

پڑوسن نے میری پریشانی دیکھی تو کہنے لگی۔ ''ایسا کرو، لکھ کر دروازے پر لگا دو کہ یہاں لحافوں میں ڈورے ڈالے جاتے ہیں۔''

مجھے تو لکھنا پڑھنا آتا نہیں تھا۔ میں نے اسی سے ایک بڑے سے کاغذ پر لکھوا کر دروازے پر لگا دیا۔ اسی وقت شیراز آ گیا۔ اسے وہ کاغذ دیکھ کر غصہ آ گیا۔ اس نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور چیخ کر بولا۔ ''میں ابھی مرا تو نہیں گیا ہوں۔ یہ بھی کوئی کام ہے۔ تم تھوڑا صبر کرو۔ میں تمہیں سب کچھ لا دوں گا۔''

''اور کتنا صبر کروں۔'' میں چیخ کر بولی۔ ''تمہاری چوریوں سے کب تک گزارا ہوگا۔ تم نہیں آتے ہو تو ہم بھوکے پڑے رہتے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔'' پھر مجھے خیال آیا کہ میں مرغیاں بھی تو پال سکتی ہوں۔ انڈے بیچ کر گزارا کر لیں گے۔ میں نے شیراز سے کہا تو وہ بھی مان گیا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' وہ خوش ہوگیا۔

اس کے پاس سو روپے تھے۔ وہ اسی وقت دو چوزے لے آیا۔ ہم دونوں انہیں دیکھ دیکھ کر منصوبے بنانے لگے کہ آج دو ہیں کل چار مرغیاں ہوں گی۔ آہستہ آہستہ بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی۔

اچانک چوزوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ باہر بھاگی تو دونوں چوزے دو بلیوں کے منہ میں دبے ہوئے تھے۔ وہ دیوار پر بیٹھی تھیں۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھتوں چھتوں نکل گئیں۔

شیراز افسردہ سا اپنے گھر چلا گیا اور میں کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ پڑوسی کی عورت بازار جا رہی تھی۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئی۔ وہاں پیاس لگی تو ہم نے شربت والے سے شربت لے کر پیا، شربت والے کے پاس ریزگاری اور نوٹوں کا ڈھیر تھا۔ وہیں مجھے خیال آیا کہ ہم شربت بھی تو بیچ سکتے ہیں۔

شیراز گھر آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''کل بازار میں مجھے پیاس لگی تو میں نے شربت پیا تھا۔ شربت والے کے پاس نوٹوں اور ریزگاری کا ڈھیر تھا۔ یہ کام تو تم بھی کر سکتے ہو۔''

''ہاں، کام تو مشکل نہیں۔'' شیراز پرخیال انداز میں بولا۔ ''زیادہ پیسے بھی خرچ نہیں ہوں گے۔ ٹھیک ہے، میں بھی یہی کام کرتا ہوں۔''

شیراز نے اِدھر اُدھر سے کچھ معلومات کی، پھر کہیں سے ایک دیگچہ لے کر سڑک کے کنارے جا بیٹھا۔

میں خوش تھی کہ چلو آمدنی کا کوئی ذریعہ تو ہوا۔ میں تصور ہی تصور میں شاپنگ کر رہی تھی، اچھی اچھی چیزیں خرید رہی تھی۔ بہترین کھانے کھا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو شیراز کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ خالی دیگچہ لیے کھڑا

تھا۔ میں خوش ہوگئی کہ اتنی جلدی سارا شربت بک گیا۔ وہ منہ لٹکائے ہوئے گھر میں آ گیا۔

''کتنے پیسے ملے شیراز؟'' میں نے پوچھا۔

''شربت بیچنے کا موقع ہی کہاں ملا۔ اچانک مجھے ابا دکھائی دیے۔ میں تو گھبرا گیا۔ پہلے تو سوچا کہ دیگچہ چھوڑ کر بھاگ جاؤں مگر یہ بھی کسی سے مانگ کر لایا تھا۔ اسے کہیں چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ بس گھبراہٹ میں سارا شربت پھینک دیا اور دیگچہ لے کر بھاگا۔ اگر ابا مجھے دیکھ لیتے تو میری شامت آ جاتی۔''

میرے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خالو ٹھیک کہتے ہیں۔ تم نرے زرافے ہو، اپنے بھائیوں کو دیکھو، دو ملک سے باہر چلے گئے، تیسرا افسر بن گیا، تم یہ ذرا سا کام نہیں کر سکتے۔''

''اچھا کل کچھ کرلوں گا۔ ابھی تو مجھے سکون سے بیٹھنے دو۔''

اگلے دن تو آدھے گھنٹے بعد ہی شیراز خالی دیگچہ اٹھائے لوٹ آیا۔ میں تو خوشی کے مارے بے ہوش ہو رہی تھی مگر اس کو منہ لٹکائے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے پوچھا۔ ''آج کیا ہوا؟''

''ہمارا پڑوسی چاچا کرم دین آ گیا تھا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔'' شیراز افسردگی سے بولا۔

''پھر۔۔۔؟'' میرا دل دھڑکنے لگا۔

''اسے دیکھتے ہی میں نے شربت گرا دیا اور دیگچہ لے کر کھسک آیا۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

شیراز بھی میرے پاس آ بیٹھا۔ ''تجھے پیسوں کی پڑی ہے، ابا میرے لیے کسی لڑکی کی تلاش میں ہے، جو خود پیسے والی اور شہر کی ہو۔''

''تو اسی لیے شربت گراتا پھر رہا ہے۔'' میں رونے لگی۔

''ہاں، بلیوں کو بھی میں نے ہی بلایا تھا کہ چوزے کھا جاؤ'' وہ بھی چیخا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہے۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں کہ ابا سے پیچھا کیسے چھڑاؤں۔''

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' میں نے آنسو صاف کیے۔ ''تم گھر سے بھاگ جاؤ۔''

''کیا۔۔۔؟'' اس نے حیرت سے مجھے گھورا۔

''افوہ۔۔۔ بھاگ کر یہاں آ جانا، مجھے بھی سکون ملے گا، رات ڈر ڈر کر گزارتی ہوں۔''

پھر حالات وہیں آ گئے، پڑوسن سے بات کی تو اس نے مجھے سیدھی سلائی سکھا دی کہ کپڑے جوڑ دیا کرو۔ باقی کام میں خود کیا کروں گی، کچھ پیسے لے لینا۔

میں وہ کام کرنے کو بھی تیار ہوگئی اور پڑوسن کا کام کرنے لگی۔ پڑوسن مجھے کچھ پیسے دے دیا کرتی تھی۔ میں وہ جمع کرتی رہی، کھانے پینے کا سامان تو جیسے تیسے شیراز لا دیا کرتا تھا۔ اس عرصے میں میرے تین بچے ہوگئے تھے، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ دونوں بڑے بچے اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گئے تھے مگر شیراز کو اس کا خیال نہیں آیا۔ مجھے تو یوں بھی کچھ پتا نہیں تھا۔

اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے میں نے کچھ مرغیاں خرید لیں۔ انڈوں ں کا کاروبار اب تک میرے ذہن سے نہیں نکلا تھا۔ پڑوسن سے کاغذ پر لکھوا کر دروازے پر لگا دیا کہ یہاں دیسی انڈے ملتے ہیں۔ لوگ خود ہی آ کر لے جایا کرتے۔ شیراز نے پہلے تو شور مچایا پھر خاموش ہوگیا۔

اس دن تو گویا قیامت ہی آ گئی۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں گھبرا کر دروازے پر گئی تو سناٹے میں رہ گئی۔ وہاں خالو کھڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجرم بنا شیراز بھی کھڑا تھا۔ نہ جانے انہیں کہاں سے میرے بارے میں علم ہوگیا تھا۔ وہ دندناتے ہوئے اندر آئے اور مجھے بے نقط سنانے لگے۔

ڈر تو مجھے بہت لگ رہا تھا میں نے سوچا کہ کبھی تو راز فاش ہونا ہی تھا، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں گھر لے جائیں۔ اس مصیبت سے تو جان

پھوٹے گی۔

خالو تو جیسے انگارے چبا رہے تھے۔ ”تو آوارہ اور بدچلن عورت! تو نے اور تیرے باپ نے مل کر اس احمق زرافے، عقل کے اندھے کو پھنسالیا کہ تو میرے گھر میں عیش کرے، یہ زرافہ بے وقوف ہوسکتا ہے مگر میں نہیں ہوں۔ میں تجھ جیسی بدکردار عورتوں کو خوب جانتا ہوں۔ بھلا ہو اس بے چاری رشیدہ کا۔ وہ بہت نیک عورت ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔“

میں نے زہرخند سے سوچا، ”رشیدہ اور نیک عورت۔۔“ نہ جانے خالو کیا بول رہے تھے۔ میرا ذہن تو رشیدہ میں الجھا ہوا تھا۔ شاید وہ میرا انتظار کرتی رہی کہ میں لوٹ آؤں گی، آخر تھک ہار کر مجھے تماشا بنانے آگئی کہ کہیں میں خالو کے گھر میں عیش نہ کر رہی ہوں۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ مجھے خالو پر حیرت ہو رہی تھی۔ بد اچھے ہوگئے اور بدنام برے، بدمعاشوں پر شرافت کا ٹھپا لگ گیا اور شریف بدمعاش بن گئے۔ میرا سارا وجود کانپنے لگا۔

وہ زرافہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ جیسے گونگا اور بہرہ ہو۔ خالو کہہ رہے تھے۔ ”چل بیٹا! تجھ ہی سے غلطی ہوگئی کوئی بات نہیں، مرد کچھ دن عیش کرنے کے لیے ایسی شادیاں کرہی لیا کرتے ہیں، تیری اصل شادی وہ ہوگی جو ہم دھوم دھام سے کرائیں گے۔“ پھر وہ میری طرف پلٹا۔ ”جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ اس قسم کی شادیوں کے لیے وہ کیا محاورہ ہے بھئی، وہی جو دیسی عورتوں کے لیے بھی کہتے ہیں، رات گئی بات گئی۔“ خالو ہنسے۔ زرافہ یونہی کھڑا رہا۔

”خالو!“ میں پوری قوت سے چیخی۔ ”بس کریں، ٹھیک ہے میں وہ مور ہوں جو جنگل میں ناچا مگر میں کسی کوٹھے سے نہیں آئی، یہ زرافہ تو بے غیرت بن کر سن رہا ہے مگر میری برداشت جواب دے گئی ہے۔ آپ نے اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔“ خالو نے میری بات سنی ان سنی کردی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں پھر چیخی۔ ”ٹھہریں! آوارہ اور بدچلن کی وضاحت تو کرتے جائیں۔ میری بدچلنی اور بدکرداری کہاں دیکھی آپ نے۔ میں نے کیا آوارگی کی؟“

میری بات سن کر خالو گڑبڑا گئے مگر بولے کچھ نہیں۔ شیراز کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

میرے پورے وجود میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی، شیراز میرے سامنے آئے اس کا تو میں وہ حشر کروں گی کہ یاد رکھے گا مگر شیراز نے پلٹ کر ہماری خبر بھی نہ لی۔ پڑوسن کہتی، تم فون کرو، میں نے کہا میں کیوں کروں، اس نے زیادتی کی ہے اسے آنا چاہیے۔ مجھے تو رشیدہ پر بھی غصہ تھا لیکن میں اس کا بھی کیا بگاڑ سکتی تھی۔ مجھے تو مستقبل کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ اب کہیں کوئی ٹھکانا بھی تو نہ تھا۔ تین تین بچوں کا ساتھ۔ میں آنے والے وقت کے تصور ہی سے لرز رہی تھی۔

اس وقت بھی میں یہی سوچ رہی تھی، سوچ کیا رہی تھی، اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی۔ دل ہی دل میں اللہ سے دعا بھی کر رہی تھی کہ اچانک دروازہ پر دستک ہوئی اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ لباس سے خاصی خوش حال دکھائی دے رہی تھی۔

”میں یہاں سے کچھ فاصلے پر رہتی ہوں۔ دیسی انڈے چاہیے تھے۔“ وہ خود ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ میں گم صم سی فرش پر بیٹھی تھی۔ عورت نے کہا۔ ”آج گھر میں بھی کوئی نہیں تھا ورنہ کسی کو بھیج دیتی، گاڑی بچے لے گئے ہیں، گھر تلاش کرتے کرتے میں تھک کر۔۔۔“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔ ”تم رو رہی ہو؟“

پتا نہیں اس کے لہجے میں کیا بات تھی، میں بالکل ہی بے قابو ہوگئی اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیا۔ عورت اٹھ کر میرے لیے پانی لے آئی اور مجھے تسلیاں دینے لگی۔ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے مجبور کرنے پر بتانا پڑا۔

”تم میرے گھر میں کام کروگی۔ کھانا پینا،

کپڑے اور تنخواہ بھی دوں گی۔''

''اس شہر میں میرے سسر کی بہت عزت ہے، خواہ جھوٹی ہی سہی۔ ابھی تو شیراز نے صرف یہاں آنا چھوڑا ہے۔ میں نے آپ کے گھر کام کیا تو فوراً طلاق بھجوادے گا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کچھ سلائی وغیرہ کا کام آتا ہے۔'' عورت نے پوچھا۔

''نہیں جی، مجھے بھلا کون سکھاتا۔''

''میری بیٹی کا بوتیک ہے، اسے کاریگروں کی ضرورت ہے۔ تم گھر بیٹھ کر بھی کام کرسکتی ہو۔''

''آپ کی بیٹی کا۔۔۔ کیا ہے جی۔'' میں سمجھ نہیں پارہی تھی۔

''تم ایسا کرو۔'' اس نے جواب دینے کی بجائے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے گھر کا پتا سمجھاتی ہوں، تم میرے گھر آجاؤ۔ بیٹی سے ملوادوں گی، شاید وہ تمہارے لیے کوئی کام نکال لے۔''

''باجی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' میری آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ ''میرا اور ان بچوں کا کچھ آسرا ہوجائے گا۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

''ارے احسان کیسا۔ تم کام کروگی بھئی، کوئی خیرات نہیں لوگی۔'' انہوں نے محبت سے کہا اور پتا سمجھادیا۔

میں اسی دن باجی کی بیٹی سنبل سے ملی۔ اس نے مختلف کام بتائے مگر مجھے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ پھر سنبل کہنے لگی۔ میں خود ڈیزائنر ہوں۔ ایسا کرو، تم یہ قمیص اور دوپٹا لے جاؤ۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ اس پر کیسا کام ہوگا۔ وہ کام تم خود نہیں کروگی بلکہ کسی ایسی عورت سے کروانا جو یہ کام جانتی ہو۔ چیزیں سب میری ہوں گی۔ سوٹ بنوا کر لاؤ، پھر بات ہوگی۔

سوٹ تو میں لے آئی مگر مجھے پتا کچھ نہیں تھا۔ پڑوسن سلائی کرتی تھی۔ یہ سوچا، وہ بتاسکتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ واقعی وہ ایک دو عورتیں کو جانتی تھی جو میرا کام کرسکتی تھیں۔ سنبل نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ پیسے اچھے دے گی۔ میں نے ان عورتوں سے بات کی تو وہ کام کرنے پر راضی ہوگئیں۔

وہ سوٹ دیکھ کر سنبل بہت خوش ہوئی۔ شہر کے بیچوں بیچ اس کا بوتیک تھا جو خاصا چلتا تھا، پھر سنبل کپڑے سلائی بھی کرنے کا سوچ رہی تھی۔ میں کام والی عورتوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھی۔ اب مجھے کام کرنے والے مرد کاریگر بھی مل گئے تھے۔ سنبل سے کام لاکر میں ان لوگوں کو دیتی اور ان سے سنبل کو، منافع میرا ہوتا تھا۔ یعنی مزدوری دے کر جو پیسے بچتے وہ میرے ہوتے تھے۔ یوں زندگی کچھ بہتر انداز میں گزرنے لگی۔

ایک دن خالہ میرے گھر آگئیں، شیراز بھی ساتھ تھا، اتنے مہینوں بعد وہ آیا تھا۔ میں نے غصے میں خالہ کا بھی لحاظ نہیں کیا اور شیراز کو خوب سنائیں۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

''بیٹا! یہ باپ کے ہاتھوں مجبور تھا۔'' خالہ رونے لگیں۔ ''اور وہ تمہاری لمحے لمحے کی خبر رکھتے رہے کہ تم کرتی کیا ہو، رشیدہ نے نجانے ان کے کان میں کیا پھونک دیا تھا۔ تم بوتیک کا کام کروانی پھر رہی ہو، چھوڑو، تمہارا حق میں تمہیں دوں گی۔'' یہ کہہ کر خالہ نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ اس میں زیور کے دو ڈبے تھے۔ رقم کی ایک گڈی تھی۔ خالہ نے زیور اور رقم میری گود میں رکھ دی پھر کہنے لگیں۔ ''شیراز کے لیے لڑکی تلاش کرتے کرتے تمہارے خالو کی ملاقات ایک دولت مند بیوہ سے ہوگئی ہے۔ اب اس سے خود شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ بچے تو میرے ساتھ ہیں، میں نے انگلینڈ والوں کو بھی بتادیا ہے بڑا بیٹا تو اگلے ہفتے تک آرہا ہے۔ میں اب اپنے حق کے لیے بھی لڑوں گی اور تمہارے لیے بھی۔''

جی تو چاہا لوچھوں خود کو چوٹ لگی تو اب میرا خیال آیا ہے مگر خالہ بہت دکھی ہورہی تھیں اس لیے میں چپ ہوگئی۔

دو دن بعد پتا چلا کہ شیراز کی بہن کا رشتہ آیا تھا، وہ لوگ غریب تھے خالو نے انہیں بے عزت کرکے

گھر سے نکال دیا۔ اگلی رات شیراز کی بہن اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔

میں شیراز کے گھر چلی گئی۔ خالو کی حالت بہت بری تھی، مجھے انہوں نے گھور کر دیکھا تو میں نے کہا۔ ''فکر مت کریں۔ میں ابھی چلی جاؤں گی۔ افسوس کرنے آئی ہوں۔''

''تمہیں تو بات کرنا بھی آ گئی ہے۔'' خالو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وقت بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔'' میں سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''ویسے خالو! میں تو بدچلن ہوں، شرافت کی باتیں تو مجھے نہیں آتیں، پھر میرے باپ نے غلطی یہ کی کہ میرا نکاح کر کے رخصت کیا ورنہ شاید میں کچھ بتا سکتی کہ ایسی حالت میں عزت کو کس طرح بچایا جائے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور خالو کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ ''ابھی یہ بات آپ کے کسی بیٹے کو نہیں معلوم، صرف اس زرافے کو معلوم ہے مگر وہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔''

میری بات سن شیراز نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''ڈریں اس وقت سے جب دوسرے بیٹوں کو پتا چلے گا۔ آپ کا آفیسر بیٹا سرکاری کام سے لاہور گیا ہے، کل پرسوں تک آ جائے گا۔ انگلینڈ والا بھی آ رہا ہے، اس کے غصے کو بھی آپ جانتے ہیں۔ آپ نے زبردستی اسے انگلینڈ بھیجا مگر وہ سسرال کے سائے میں نہیں رہا، اپنا کماتا ہے۔'' میں نے خالو کی طرف دیکھا۔ خالو کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ ''اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے آنے سے پہلے لڑکی کو گھر لے آئیں اور اسی لڑکے کے ساتھ باعزت طور پر رخصت کر دیں۔''

میری بات سن کر خالو کچھ دیر تک میری بات پر غور کرتے رہے، پھر ان کی جان میں جان آئی۔ ''رضیہ! میری بچی! مجھے معاف کر دے۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

وہ شیراز کے ساتھ فوراً کہیں جانے کو تیار ہو گئے۔

میں گھر چلی آئی۔ میں بہت خوش تھی کہ اب خالو نے معافی مانگ لی ہے۔ مجھے خود گھر لے کر جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ بیٹی والے معاملے سے نمٹ کر وہ پھر پہلے جیسے ہو گئے البتہ شیراز کو میرے پاس بھیج دیا۔ کچھ مدد خالہ نے کی، کچھ شیراز کے بھائیوں نے، کچھ ہم دونوں نے محنت کی اور ہم نے پانچ مرلے زمین خرید کر اپنا مکان بنا لیا اور بچوں کو بھی اسکول میں داخل کروا دیا۔

شیراز کے سب بھائی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ حتیٰ کہ خالو نے بیٹی کو سکھ دینے کے لیے بے روزگار داماد کے لیے بھی ملازمت کا بندوبست کر دیا ہے۔ دوسرے بیٹوں سے بھی کچھ نہ کچھ لے کر بیٹی کو دے دیتے ہیں۔ ہماری حالت اب بھی سب سے گئی گزری ہے، وہی کھینچ تان کر زندگی گزر رہی ہے۔

پچھلے دنوں خالو کو اچانک انجائنا کی تکلیف ہو گئی۔ شیراز ہی خالو کی خدمت کرتا رہا۔ وہ اسپتال سے گھر آئے، تب بھی شیراز ہی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

ایک رات شیراز حیران پریشان سا گھر آیا۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگا۔ ''آج پتا ہے کیا ہوا۔ ابا واش روم میں تھے، مجھے ان کی دوا لانا تھی، پرچی کہیں رکھ کر بھول گیا تھا اور وہی تلاش کر رہا تھا کہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے کچھ کاغذات ہاتھ لگے، وہ پانچ مکانوں کے کاغذات تھے، ابا نے وہ مکان اپنے اور میرے بھائیوں کے پیسوں سے بنائے ہیں مگر ایک ایک مکان ہم سب بھائیوں کے نام ہے۔ میں نے ایڈریس نوٹ کر لیے تھے۔ وہی مکان دیکھ کر آ رہا ہوں۔ بہت اچھے مکانات ہیں۔ ان کی ڈائری سے پتا چلا کہ وہ تم سے نفرت نہیں کرتے، انہیں بس یہ دکھ ہے کہ شیراز کی شادی دوسری اولاد کی طرح دھوم دھام سے نہیں ہوئی اور وہ اس شادی میں شریک نہیں ہوئے اس لیے یونہی بولتے رہتے ہیں۔'' یہ سب سن کر میں اللہ کے حضور سجدے میں گر گئی۔

آخر میری قربانیاں رنگ لائی تھیں۔ سچ ہے۔ اللہ کے یہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں ہے۔ پہلے میں رشیدہ کو بددعائیں دیتی تھی کہ یہ ظلم اسی نے مجھ پر کیا تھا مگر اب تو اس کے لیے بھی دعا نکلتی ہے دل سے۔

لاش کا انتقام

کاشف اقبال

ایک شخص جو قتل ہو چکا
تھا لیکن..... اچانک ایک دن
وہ قاتل سے بدلہ لینے واپس
آگیا اور پھر.....

اس عورت کی کہانی جس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا

منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے مکمل دو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن لوسیلی مارٹینز کو سمندری موجوں کا طوفانی شور یہیں سے صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کی کار کے روانہ ہوتے ہی تیز اور طوفانی بارش شروع ہوگئی تھی۔ نیلگوں رات میں کار کی ہیڈ لائٹس راستے کی تاریکی دور کرنے میں مصروف تھیں۔

اس نے رومال سے چہرے کو صاف کیا جس پر بارش کے چھینٹے مسلسل پڑ رہے تھے۔ بوندیں کار کی ونڈ اسکرین کے ایک چھوٹے سے شگاف سے ہوا کے ساتھ اس پر گر رہی تھیں۔ اسے خدشہ تھا کہ بارش کا پانی اس کا میک اپ خراب کر ڈالے گا۔ وہ بے زار کن غصے کے ساتھ یہ بھی سوچنے لگی کہ کہیں بارش کی وجہ سے اس کے سرخی مائل بالوں کا نیا رنگ نہ ڈھل جائے۔

اچانک آسمانی بجلی اسے اپنے قریب ہی کڑکتی

محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے زرد رنگ کی کار پر ایک بہت بڑا بم پھٹ گیا ہو۔ دوسری مرتبہ بجلی کڑکی تو اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس پر روشنی کے تیر برسا رہا ہو۔ آسمانی بجلی کسی اژدہے کی مانند تھی جس کی آتشیں زباں تیزی سے اندر باہر حرکت کر رہی تھی۔ بجلی کی کڑک اور لمحے بھر کو چمکتی ہوئی روشنی میں ریت کے ٹیلوں، درختوں اور جھاڑیوں پر چھائی ہوئی ویرانی، اپنے بھیانک پس منظر کے ساتھ عجیب اور دہشت انگیز محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اس شاہراہ تک پہنچ گئی جو کھاڑی کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی لیکن اس کی کار یہاں پہنچ کر خوف ناک شور کے ساتھ رک گئی۔ سامنے راستہ بند تھا طوفان باد و باراں کے سبب درخت کی ایک شاخ سڑک کے درمیان گر گئی تھی۔ غالباً یہی وہ وقت تھا جب آسمان پر بجلی کی مستقل کڑک اور تیز روشنی میں اسے ایک شخص نظر آیا تھا جو شاید اپنی جان بچانے کے لیے سمندر کی تیز و تند موجوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کا سر خون میں لت پت تھا، بالکل جیمز بولینڈ کے سر کی طرح۔۔۔ جس کے سر پر آج سے سات سال قبل ایک ایسی ہی رات میں لوسیلی نے کشتی کا فولادی ہک دے مارا تھا۔

لوسیلی کو اپنی دھڑکنیں تیز ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے اعصاب پر شدید تناؤ سوار ہو گیا۔ اچانک بجلی پھر کڑکی اور روشنی کا ایک سیلاب سا امڈ پڑا۔ اس کے بعد لوسیلی کو محسوس ہوا کہ جو کچھ اسے نظر آیا تھا وہ کوئی شخص نہیں بلکہ ربر کی ایک سرخ گیند تھی جو تیزی سے چکر کھاتے ہوئے پانی میں اچھل رہی تھی۔

لوسیلی نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ اب ایک بار پھر سکون کی سانس لے رہی تھی۔ اس نے غصے کا رخ خود اپنی ہی جانب موڑ دیا۔ کیا میں ایک کمزور اور ضمیر گرفتہ احمق ہوں۔ کیا میں اس قدر نرم دل اور نرم خو ہو سکتی ہوں کہ ایک ٹیلی فون کال اور طوفانی رات کے خوف سے آسیب کے وجود پر یقین کرنے لگوں۔

اس نے ان خیالات و سوالات کے ساتھ ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید ضمیر کی یہ خلش بالکل اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہے گی جس طرح بوڑھی عورتوں میں جوڑوں کا درد مرتے دم تک ساتھ رہتا ہے۔ یہ ضمیر کی خلش ہی تو تھی جس نے اسے محض ایک فون کال پر بریکر بیچ جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

صبح کے وقت فون آیا تو ایمن مارٹینز ابھی محو خواب ہی تھا اور وہ دوپہر سے پہلے بے دار نہیں ہوتا تھا۔

''کیا آپ مسز ایمن مارٹینز ہیں؟'' کسی نے استفسار کیا تھا۔ ''جی ہاں۔'' لوسیلی نے کچھ اضطراب کے ساتھ جواب دیا۔

''آپ کے نام ایک پیغام ہے۔۔۔ مسٹر جیمز بولینڈ کی جانب سے۔'' لوسیلی کو اپنے اعصاب اور احساسات پر مکمل قابو رکھنے کا فن آتا تھا۔ یہ ایک ایسی خوبی تھی جو ہمیشہ حسین لوسیلی کی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ اسے اپنی اس صلاحیت پر ناز تھا کیونکہ اسی صلاحیت کو استعمال کر کے وہ غربت سے نکل کر آسائش کی دولت سے مالا مال ہوئی تھی لیکن اس فون کال کو سن کر ایک لمحے کے لیے اسے اپنا اعتماد متزلزل ہوتا محسوس ہوا تھا۔

''قطعی ناممکن ہے۔۔۔'' لمحے بھر کی خاموشی کے بعد وہ اچانک بول پڑی کیونکہ مسٹر بولینڈ کو مرے ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔

''مگر یہ پیغام مسٹر جیمز بولینڈ کی جانب سے ہے۔'' دوسری طرف سے فون پر اصرار کیا گیا۔ یہ آواز بڑی عجیب اور کھردری تھی جسے لوسیلی پہچان نہ سکی۔ حالانکہ آواز کچھ کچھ شناسا بھی لگتی تھی۔

''تمہیں آج ہی رات ان سے ملاقات کے لیے بریکر بیچ آنا ہوگا۔''

''بالکل مضحکہ خیز۔۔۔'' لوسیلی نے غصے سے کہا مگر اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے

لگے تھے۔

''پیغام یہی ہے خاتون! مسٹر جیمز بولینڈ آج رات روشن ہاؤس میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔''

''تم کون ہو؟'' بوسیلی نے سوال کیا۔

''اگر تم وہاں نہ پہنچیں تو جائیداد کا تصفیہ روک کر تمہارے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائے گی۔۔۔ پھر ظاہر ہے، ایمن مارٹینز سے پوچھ گچھ بھی ہوسکتی ہے۔'' فون پر اسے دھمکی دی گئی۔

لوسیلی نے خشک ہونٹوں پر زبان کی نوک پھرتے ہوئے کہا۔ ''میں آؤں گی۔ ہوسکتا ہے کل صبح ہی آسکوں۔ کیونکہ فاصلہ بہت زیادہ ہے اور بارش بھی کافی تیز ہورہی ہے۔ مجھے بارش کے رکنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''نہیں۔۔۔ آج ہی رات!'' سنگدلانہ آواز پھر فون پر گونجی۔ ''آج رات نہیں تو پھر کبھی نہیں۔''

پسینہ اب لوسیلی کی پشت پر بھی بہہ رہا تھا۔ وہ چیخی۔ ''تم کون ہو؟'' جواب میں صرف کلک کی آواز آئی اور فون بند ہوگیا۔

لوسیلی پر خوف کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ جم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جم تو وہ شخص تھا جسے اس نے سات سال قبل بریکر بیچ کے گرین رولر میں موت سے بچنے کی جدوجہد کرتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔ اور پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے جم کے زندہ رہنے کی آخری کوشش کو آہنی ہک سے اس کے سر پر وار کرکے ناکام بنادیا تھا اور جب وہ زخم کھا کر سطح آب پر آخری بار ابھرا تھا تو اس کی آنکھوں میں ناقابل فراموش تاثرات تھے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کاش! جم کی دولت اس کی آنکھوں کے ان تاثرات کی یاد کا بدل بن جاتی جو مرتے وقت جم کی آنکھوں میں تھے۔ اس کا گول چہرہ کسی جھلی کی طرح سفید تھا لیکن خون بہہ کر اس کے چہرے اور سر پر یوں پھیل گیا تھا جیسے اس نے قرمزی ٹوپی پہن رکھی ہو۔ جہاز کے کیبن میں موجود لیمپ کی ٹمٹماتی روشنی میں اسے جم کا سر کسی سرخ گیند ہی کی مانند نظر آیا تھا اور پھر وہ پانی کے نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

ایک وحشیانہ جھٹکے سے لوسیلی نے کار کو سڑک پر گری ہوئی شاخ سے بچاتے ہوئے موڑا اور گیئر تبدیل کرکے کار کی رفتار تیز کردی۔

بریکر بیچ چھوٹا سا دور افتادہ شہر بھوتوں کے کسی کیمپ کی طرح تھا۔ سیاحوں کا ہجوم سال میں صرف تین ماہ تک یہاں رہتا تھا اور دسمبر میں مزدوروں کے عالمی دن کی تقریبات کے بعد یہاں ویرانی رقص کرنے لگتی تھی۔ درختوں سے بنے ہوئے راستوں اور ویران شاپنگ سینٹر کے ادھر چوبی فریموں سے بنے ہوئے بے ترتیب چھوٹے چھوٹے ہوٹل تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ ہوٹل سڑک کے مقابل اس طرح ایستادہ تھے، جیسے سمندر کے خوفناک دباؤ سے بچنے کی کوشش کررہے ہوں۔

دور دور تک گھپ اندھیرا تھا۔ لوسیلی کی کار سے وقتاً فوقتاً ساحلی موجیں آکر ٹکراتی رہیں لیکن اس کی منزل ابھی دور تھی۔ وہ اس علاقے سے واقف تھی۔ اس لیے کچھ دیر بعد کسی دشواری کے بغیر روشن ہاؤس کے عقب میں پہنچ گئی۔ کئی سال گزرنے کے باوجود یہاں زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی زرد کار پارکنگ کے لیے مخصوص ایک مختصر سی جگہ پر روک دی۔۔۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا اور تیزی سے تاریک راستے پر دوڑ پڑی۔ اس کی اونچی ایڑی کے سینڈلز دلدلی پانی میں تربتر ہوگئے تھے۔

وہ ایک منقش دروازے کے سامنے رکی اور اسے زور زور سے پیٹنا شروع کردیا۔ بارش سے اس کا جسم بری طرح بھیگ چکا تھا۔

کمرے کے اندر کسی نے روشنی کی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ لوسیلی جلدی سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ دروازے پر ایک بوڑھی عورت موجود تھی۔ اس نے دروازہ بند کرکے کنڈی چڑھادی

یہ دبلی پتلی بڑھیا کسی زندہ لاش کی طرح تھی۔ اس کا چہرہ مصر کی قدیم حنوط شدہ لاش جیسا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر ان گنت باریک اور مہین لکیروں اور جھریوں کا سلسلہ تھا۔ ان جھریوں اور لکیروں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے تبت کے کوہستانی سلسلوں کا نقشہ ہو۔ کمرے میں بغیر شیڈ کا ایک بلب تھا، جس کی روشنی بڑھیا کے زردی مائل بالوں پر پڑ رہی تھی۔

''تو آپ مسز مارٹینز ہیں؟'' بڑھیا نے پوچھا اور بوسیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بڑھیا کی رہنمائی میں خالی کمروں کی راہ داری میں پہنچ گئی۔

تاریک کمرے چونے کے پتھروں کے بنے ہوئے غار لگ رہے تھے۔ فرنیچر کو گرد سے محفوظ رکھنے کے لیے معقول انتظام تھا اور یہ کمرے آرائش کے اعتبار سے بہترین اور قابل دید تھے۔ بڑھیا اسے ایک کمرے میں لے گئی جہاں ایک آتش دان میں انگارے چیخ رہے تھے۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ ''برائے مہربانی اس رجسٹر پر دستخط کر دیجیے۔'' بڑھیا نے بوسیلی سے درخواست کی۔ ''اس کے بعد آپ آگ سے اپنے بدن کو حرارت پہنچا سکتی ہیں۔''

لیکن بوسیلی بڑھیا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آتش دان کے قریب کھڑی ہوگئی۔ وہ شعلوں کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ تاکہ اس کا سرد جسم کچھ گرم ہو جائے اور بھیگے ہوئے کپڑے بھی خشک ہو سکیں۔ ''مجھے رجسٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرا ارادہ یہاں قیام کا نہیں ہے۔'' بوسیلی نے کچھ دیر بعد وضاحت کی۔

بڑھیا ڈیسک تک جا کر روشن ہاؤس کا رجسٹرڈ اٹھا لائی۔ رجسٹر کیا تھا بس ایک پتلی سی کیش بک لگتی تھی۔ اس نے یہ پتلا سا رجسٹر بوسیلی کے سامنے رکھ دیا۔ ''تمہیں یہاں رکنا پڑے گا۔'' بڑھیا کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''تم جس سے ملاقات کے لیے یہاں آئی ہو وہ ابھی پہنچنے ہی والا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بوسیلی کے ہاتھ میں ایک قلم تھما دیا۔

بوسیلی نے انتہائی تنک مزاجی سے رجسٹر ہاتھ میں لے لیا لیکن وہ دستخط کرتے کرتے اچانک رک گئی۔ رجسٹر کے اس صفحے پر ایک نام پہلے سے درج تھا۔۔۔ صرف ایک نام۔۔۔ جیمز بولینڈ۔

بوسیلی کی ننھی سی روح دہشت زدہ ہوگئی۔ ایک لمحے کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس جگہ کوئی بھوت رقص کر رہا ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں آ کر اس نے کتنی بڑی حماقت کی ہے۔۔۔ ایک مردہ شخص سے ملاقات کرنے کی حماقت۔۔۔ لیکن اپنے احساسات کو چھپانے کی دیرینہ مشق اور ریاضت نے یہاں بھی اس کی مدد کی۔ اس نے خوف و دہشت کے جذبے کو بھلانے کی کوشش میں بظاہر بے نیازی کے ساتھ رجسٹر پر درج نام کے نیچے اپنے دستخط بھی کر دیے۔

پھر نہ جانے کیوں اپنی کپکپاتی ہوئی تحریر پر وہ نادم سی ہوگئی۔

بوسیلی پلٹ کر آتش دان کی طرف دیکھنے لگی اور پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''کیا تم اُس شخص کے بارے میں بتا سکتی ہو؟''

''وہ پستہ قامت ہیں اور ان کا جسم گٹھا ہوا ہے، چہرہ مکمل چاند جیسا ہے اور کانوں کے علاوہ ناک پر بھی کہیں نہیں خون کی سرخی جھلکتی ہے وہ ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جو زندگی کا بھرپور لطف اٹھانے کا عادی ہو۔ میرا خیال ہے، تم دونوں پرانے دوست ہو۔''

آگ کی تپش کے باوجود بوسیلی کانپ گئی۔ بڑھیا نے جو کچھ بتایا تھا، وہ جم پر صادق آتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ہاں۔۔۔ جم بھی بھرپور زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے بڑھیا سے کہا۔ ''کیا تم اس ہوٹل کی نگران ہو؟''

''ہاں۔۔۔ تم مجھے نگران ہی سمجھ سکتی ہو۔'' بڑھیا نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بریکر بیچ ہی میں گزارا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں یہاں پر کچھ جائیداد

خریدوں۔۔۔مگر یہ اب بہت پرانی بات ہوگئی ہے۔''

''اوہ۔۔۔کیا واقعی۔'' لوسیلی نے یونہی کہہ دیا حالانکہ سے بڑھیا کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''ہاں۔۔۔'' بڑھیا اپنی ہی جھونک میں بول رہی تھی۔ ''بہرحال جب میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تو میرے بیٹے نے جائیداد کی دیکھ بھال شروع کردی۔۔۔لیکن مستقبل میں کون جھانک سکتا ہے۔'' بڑھیا نے ایک دلدوز آہ بھرنے کے لیے لمحے بھر کو سلسلہ کلام توڑ دیا۔ ''بدقسمتی سے میرا بیٹا قتل کردیا گیا۔ اس نے میری بانہوں میں دم توڑا تھا۔ اسے زندگی نے صرف اتنی ہی مہلت دی تھی کہ وہ اپنے قاتل کے بارے میں مجھے بتا سکے۔''

لوسیلی کو بڑھیا کی کہانی سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ آج کی رات وہ موت یا تشدد کے بارے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی چنانچہ اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔ ''سنیے بی! میں اس طوفانی رات میں تمہاری آپ بیتی سننے نہیں آئی۔ مجھے صرف اس بات سے دلچسپی ہے کہ مسٹر بولینڈ کہاں ہیں؟ آخر وہ وقت مقرر کرنے کے بعد ملاقات کے لیے یہاں کیوں نہیں پہنچے؟''

''مسٹر بولینڈ سے تمہاری ملاقات جلد ہی ہوگی۔۔۔آؤ میں تمہارا کمرہ دکھادوں۔''

لوسیلی خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ چند زینے چڑھنے کے بعد وہ ایک کشادہ غلام گردش سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ ''یہ اس عمارت کا سب سے اچھا کمرا ہے۔'' بڑھیا نے پلٹ کر کہا۔ ''مسٹر بولینڈ نے اس کمرے کو آپ کے لیے مخصوص کرنے کی خواہش کی تھی۔''

لوسیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ شدید بے چینی میں مبتلا تھی کیونکہ اس کمرے میں وہ پہلے بھی آ چکی تھی۔۔۔لیکن اس قیام کو طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ جم بولینڈ اسے دلہن بنا کر لایا تھا تو اس نے بریکر بیچ میں موجود اپنی جائیداد کی سیر کراتے ہوئے اس کمرے کے سامنے آ کر بالکل یہی بات کہی تھی کہ اس ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا ہے۔۔۔یہی وہ کمرہ تھا، جہاں جم بولینڈ نے اس سے ضد کی تھی کہ وہ صبح کے کیبن سے سمندر کا نظارا کرنے کے لیے اس کے ساتھ چلے۔۔۔اور پھر اسی خواہش کے انجام پر وہ موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا۔

اس نے خیالوں کی دنیا سے نکل کر بڑھیا کی طرف دیکھا۔ اس بڑھیا کے لیے لوسیلی کے دل میں بے پناہ نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ حالانکہ اس نفرت کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا، سوائے اس کے کہ بھدی سی اس بڑھیا کو ان بھولی بسری یادوں کا کوئی علم نہیں تھا جن کا اس کمرے سے تعلق تھا۔ لوسیلی سوچ رہی تھی کہ وہ اس کمرے میں سو بھی نہیں سکتی۔ اس میں قوت ارادی کا کوئی دخل نہیں تھا، بات صرف اتنی سی تھی کہ آج کی رات خوف کی وجہ سے وہ اس کمرے میں سو نہیں سکتی تھی۔ اس کے علاوہ سمندری طوفان اور تند و تیز ہوا کی وجہ سے یہاں خاصا شور رہتا تھا۔ ہوا کے ساتھ لہریں کمرے کی کھڑکی سے آ کر ٹکراتی تھیں۔ تو ایسی آوازیں پیدا ہوتیں جیسے ان گنت نقارے بج رہے ہوں۔۔۔ پھر یہ لہریں کھڑکیوں کی درزوں سے یوں اندر آ جاتیں جیسے کمرے کے فرش پر چوری چھپے داخل ہونے والے سانپ کنڈلی مار کے بیٹھ جاتے ہیں۔

''یہ اس ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا ہے؟'' لوسیلی نے کہا اس کے لہجے میں طنز کی تلخی تھی۔ ''میرا خیال ہے، اس کمرے میں تو بطخیں بھی نہیں رہ سکتیں۔''

''مجھے افسوس ہے، مسز مارٹینز!'' بڑھیا نے جلدی سے معذرت کی۔ ''کمرے میں آنے والے پانی کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ دراصل آج شام تک طوفان اتنا شدید نہیں تھا۔ بہرحال میں آپ کے لیے کوئی اور کمرا تیار کردیتی ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئیں۔ ''آپ ٹھہریں۔۔۔میں پہلے آپ

لیے کوئی گرم مشروب لاتی ہوں۔'' بڑھیا نے کہا اور یک دروازے سے گزر کر لوسیلی کی نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔

لوسیلی اب تنہا تھی۔ وہ آتش دان کے قریب پہنچ گئی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں سے اسے فوری طور پر قدرے حرارت کا فرحت بخش احساس ہوا تو اعصابی کھچاؤ اور خوف میں کمی آ گئی۔ وہ گھسیٹ کر آتش دان کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ اس نے پیروں سے سینڈلوں کو اتار پھینکا اور ٹانگوں کو آتش دان کے قریب کرلیا اب وہ بہت دیر بعد اطمینان اور سکون کی سانس لے رہی تھی۔

آنکھیں بند کر کے وہ جم بولینڈ کی اس جائیداد کے بارے میں غور کرنے لگی جس کے حصول میں اب اسے زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔۔۔ پھر منتشر خیالات اسے مضطرب کرنے لگے۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی سے شکایت تھی کہ جم بولینڈ کی جائیداد کی مالک بننے کے لیے اسے مزید سات سال تک انتظار کرنا پڑا۔۔۔ لیکن اسے یقین تھا کہ جم بولینڈ اپنی ملکیت کا دعوا کرنے کے لیے واپس نہیں آئے گا۔

اس جائیداد نے ہی لوسیلی کے دل میں جم کو جہاز کے کیبن سے سمندر میں دھکیل دینے کی خواہش پیدا کی تھی۔۔۔ اس نے فوری طور پر اپنی اس خواہش کو عملی جامہ بھی پہنا دیا اور پھر مسٹر مارٹینز سے شادی کرلی۔ جم بولینڈ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ یہ بات سبھی کے علم میں تھی، اس لیے اس کی موت کو حادثے کا رنگ دینا لوسیلی کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ جم سمندر میں ڈوب گیا تو وہ کسی ایسی دلہن کی طرح ساحل پر آئی تھی جو شوہر سے صرف چند گھنٹوں کی رفاقت کے بعد ہی بیوہ ہوگئی ہو۔ اس نے بڑے رقت آمیز انداز میں لوگوں کو بتایا کہ جم بولینڈ جہاز کے رسوں میں الجھ کر حادثاتی طور پر سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے ہوئے دیکھتی رہی اور اسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کرسکی۔

مسکراہٹیں

ایک خاتون مرغی کی دکان پر پہنچیں اور ایک مرغی خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ دکان دار نے ایک کٹی ہوئی صاف ستھری سالم مرغی اٹھائی اور اسے تولنے کے بعد بولا ''اس کی قیمت تین سو روپے ہے۔''

خاتون نے تنقیدی نظروں سے مرغی کا جائزہ لیا اور بولیں: ''یہ تو بہت چھوٹی ہے کیا آپ کے پاس اس سے بڑی مرغی نہیں ہے۔؟'' اتفاق سے دکان میں وہ واحد مرغی تھی لہٰذا دکاندار نے وہی چھوٹی مرغی اُٹھائی اور عقبی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے مرغی کو کھینچا، پٹخا اس پر ایک چوٹ لگائی، مرغی کی جسامت بڑھنے پر وہ اسے لے کر واپس دکان کے اگلے حصے میں پہنچ گیا' مرغی کا وزن کر کے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ''اس مرغی کی قیمت چار سو روپے ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' خاتون نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''آپ مجھے دونوں مرغیاں دے دیں۔''

وہ نہ صرف ایک اچھی اداکارہ تھی بلکہ اس کا منہ زور اور دل آویز حسن، جسمانی کشش اور شباب، مردوں کی نگاہوں کو الجھانے کی قوت سے مالا مال تھا۔ اس کی سبزی مائل آنکھیں اور چمک دار سنہرے بال کسی بھی مرد کو دام میں پھانس لینے کے لیے کافی تھے۔ وہ انہی خوبیوں کے سہارے اپنی کہانی کو لے کر چل رہی تھی۔

اسی دوران مارٹینز کو اپنی زلف کا اسیر کرنے کے لیے بھی وہ منصوبے بناتی رہی۔۔۔ لیکن جب وہ اس کام پر عمل درآمد کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوئی تو قسمت نے اس کے ساتھ ایک دلچسپ مذاق کیا۔۔۔ جم کی لاش سطح آب یا ساحل پر نمودار نہ ہوئی، پورا ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے۔ ایک مہینہ اور پھر پورا سال بیت گیا۔ لیکن جم کی لاش نہ ملی۔۔۔ اور اسی ایک حقیقت نے لوسیلی کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کردیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ

ایسا کوئی بھی شخص وہاں موجود نہیں تھا جس نے جم کو لوسیلی کے ساتھ سیر کے لیے جہاز پر دیکھا ہو اور قانون کی باریکیوں کے پیش نظر جم کو اس وقت تک مردہ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا جب تک اس کی لاش کا پتا نہ چل جاتا۔۔۔ چنانچہ جم کی تمام ملکیت عارضی طور پر عدالت ہی کی تحویل میں تھی اور اس قانونی کارروائی کو پورا کرنے کے لیے سات سال کا عرصہ درکار تھا۔

عدالت نے لوسیلی کو ٹرسٹی مقرر کردیا۔ سات سال بعد جب قانونی تقاضے پورے ہوجاتے تو بالآخر لوسیلی کے لیے جائیداد کا حصول آسان ہوجاتا کیونکہ جم کی وصیت کے مطابق اس کی جائیداد کی واحد حق دار لوسیلی ہی تھی۔ ابتدا میں تو لوسیلی ٹرسٹ فنڈ کے استعمال میں بے حد محتاط رہی لیکن اسے خدشہ تھا کہ سات سال کی اس مدت میں اس کی جوانی اور شباب ڈھل بھی سکتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ ایمن مارٹینز کو قابو میں کرنا ایک مشکل کام ہے۔ بہرکیف اس نے مارٹینز کی عیاشیوں کے لیے مجبوراً ٹرسٹ کے فنڈ سے رقم نکالنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ یہی بنیادی وجہ تھی کہ وہ بریکر بیچ پہنچنے کی ہدایت کو نظر انداز نہ کرسکی۔ اسے اندیشہ تھا کہ حساب کتاب کی سخت جانچ پڑتال سے وہ اس ٹرسٹ سمیت ایمن ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اس لیے وہ ایمن کے بے دار ہونے سے پہلے ہی وہاں سے کھسک گئی۔ جاتے ہوئے اس نے ایمن کے سرہانے ایک پیغام چھوڑ دیا۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایمن اس سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرے گا کیونکہ بزنس کی باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

آتش دان کے سامنے بیٹھے بیٹھے لوسیلی کے ہونٹوں پر ایک مدہوش سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ پہاڑ پر ایک محل خرید لے گی کیونکہ وہ سمندر کو ہرگز دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی شریر قاتل آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ اسے نیند آنے لگی۔ اس نے ایمن کو راہ پر لانے کے لیے بھی ایک منصوبہ سوچا۔ ایمن کو تو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لوسیلی کے ہونے ہوئے وہ آزادی اور عیش وعشرت کی زندگی سے کبھی محروم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے تو راوی نے عیش ہی عیش لکھ رکھا تھا۔

اچانک چمنی سے ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ آتش دان کے شعلوں سے دھویں کے بادل اٹھنے لگے۔ آگ کے باوجود ٹھنڈی ہوا سے لوسیلی کا بدن ایک لمحے کے لیے نم ہوگیا۔ بادلوں کی خوف ناک گرج سے ہوٹل کی پرانی عمارت لرز اٹھی۔۔۔ دھویں کی وجہ سے لوسیلی کھانسنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے جلدی سے سینڈل پہنے اور آتشدان سے دور ہٹ گئی۔ وہ بے زاری کے عالم میں چلتی ہوئی دہلیز کے دروازے تک پہنچ گئی۔ یہ بڑھیا کہاں غائب ہوگئی۔ اس نے سوچا۔ اسے تو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔

کھڑکی کے شیشوں سے باہر کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی چنانچہ اس نے کوشش کر کے دروازہ کھول دیا۔ اچانک تیز ہوا کے جھونکوں سے اس کے رنگ دار بال اڑنے لگے۔ ہوٹل کے سامنے والی دیوار سے سمندری موجیں خوف ناک شور کے ساتھ ٹکرا کر واپس جارہی تھیں۔

''یہ لکڑی کے تختوں کا راستہ۔۔۔'' لوسیلی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اس تند و تیز طوفان میں تو یہ ایک ہی ریلے میں بہہ سکتا ہے۔'' اس نے گھبرا کر دروازہ بند کردیا۔ اسی لمحے بڑھیا بھی پہنچ گئی۔

''میں تمہارے لیے گرم کافی لائی ہوں۔'' اس کے ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے کپ سے بھاپ اٹھتی نظر آرہی تھی۔ ''جب آپ یہ کافی پی لیں گی تو میں آپ کو ایک ایسے کمرے میں لے چلوں گی جو رہنے کے قابل۔۔۔''

''میں فیصلہ کرچکی ہوں کہ یہاں قیام نہیں کروں گی۔'' لوسیلی نے چیخ کر کہا۔ ''میں گھر واپس جارہی ہوں۔''

''لیکن اس طوفان میں تم گھر نہیں جاسکو گی۔''
بڑھیا نے احتجاج کیا۔ ''پھر ایک شریف آدمی نے آپ کو وقت دے رکھا ہے۔''

''تو پھر اسے اب تک یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔'' لوسلی نے بڑھیا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اتنی دیر بھی یہاں رک کر حماقت کی ہے۔''

''آپ اپنی کار کو ہائی وے پر نہیں لاسکتیں۔ طوفان کے تیور خطرناک ہیں۔'' بڑھیا نے دلیل پیش کی۔

لوسلی نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ کہیں میں پاگل تو نہیں ہو رہی ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا جم بولینڈ سمندر کی تہہ سے نکل کر زندہ سلامت واپس بھی آسکتا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ لوسلی کا ذہن جم کے سلسلے میں بھٹکنے لگا تو اس نے جلدی جلدی کافی پینا شروع کردی۔ کافی اسے حلق میں اٹکتی محسوس ہونے لگی۔ پھر اس نے دیکھا کہ بڑھیا اس کے لیے وھسکی لیے کھڑی ہے۔ وھسکی کی تندی اور گرمی نے لوسلی کی ہمت کو سہارا دیا۔ بڑھیا اسے لے کر اس کمرے سے باہر آگئی۔ وہ غلام گردش کے اداس اور خاموش ماحول سے ہوتے ہوئے ہوٹل کے عقبی حصے میں پہنچ گئیں۔۔۔ پھر تہہ خانے میں پہنچنے کے لیے زینے سے آہستہ آہستہ اترنے لگیں۔ ہوٹل کے عقبی حصے میں ایک اور چھوٹی سی غلام گردش بھی تھی۔ روشنی ہوئی تو لوسلی نے دیکھا کہ شہتیروں پر جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے۔

''مجھے افسوس ہے کہ مہمان خانے کے سوا کوئی متبادل موزوں جگہ مہیا نہ کرسکی۔'' بڑھیا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

یہ کمرا جہاں لوسلی کو لایا گیا تھا، چھوٹا سا تھا۔ اس کی دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور فرش پختہ تھا۔

''یہ ڈریسنگ گاؤن لیجئے۔ بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر اسے پہن لیں۔ میں جاتی ہوں تاکہ اگر وہ شریف آدمی آگئے ہوں تو انہیں یہاں بھیج دوں۔''

بڑھیا یہ کہہ کر مہمان خانے سے چلی گئی۔

لوسلی نے اپنا بھیگا ہوا بھاری بھرکم لباس اتار کر گاؤن پہن لیا اور سوچا کہ بڑھیا واپس آئے گی تو اس سے اپنا لباس آگ کے قریب رکھ کر خشک کرنے کے لیے کہہ دے گی۔۔۔ لیکن اچانک ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے اس مقام سے خوف آنے لگا اور وہ شدت سے خود کو دنیا سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگی۔ اسے سمندر کی طوفانی موجوں کے ہوٹل کی دیواروں سے ٹکرانے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ بلکہ اب تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے لہریں اس کے سر سے ٹکرا رہی ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ موجوں کی تیزی سے کمرا ہل رہا ہو۔ اس نے سوچا کہ پانی پر بنا ہوا چوبی رستہ، موجوں کے تھپیڑے کھا کر تہس نہس ہوچکا ہوگا۔ یہ چھوٹا سا کمرا ہوٹل کے آخری حصے میں واقع تھا۔

لوسلی نے ایک بار پھر اپنے سر پر موجوں کا شور سنا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ چھت پر لگا ہوا برقی بلب اس طرح جھولنے لگا جیسے کٹھ پتلی کا تماشا ہو رہا ہو۔۔۔ پھر اچانک شور دب گیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی گھمانی چاہی لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ خوف و دہشت کی ایک بے رحم لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے دروازے کو توڑنے کا ارادہ کیا لیکن دروازہ ٹھوس اور بے حد مضبوط تھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو محسوس ہوا کہ دروازے کے باہر جو کنڈی لگی ہے وہ کمزور ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دروازے کی بیرونی کنڈی سے اس کا خیال کمرے میں جمع ہونے والے سمندری پانی کی طرف چلا گیا پھر اسے میز پر پڑی ہوئی شمع کا خیال آیا۔ اسی لمحے چھت پر لگے ہوئے بلب کی روشنی بھی غائب ہوگئی۔ تاریکی میں وہ اس قدر خوف زدہ ہوگئی کہ اس کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ اندھیرا ہوتے ہی سمندر کا پانی چھت کی دراڑوں سے تیزی کے ساتھ کمرے میں گرنے لگا۔

اندھیرے میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے لوسلی

نے بمشکل شمع تک رسائی حاصل کی اور اپنے لائیٹر سے اسے روشن کر دیا۔ کمزور اور بیمار سی روشنی میز پر پڑے ہوئے کانسی کے ایک منقش گل دان پر پڑی جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

''جیمز بولینڈ کی یاد کے لیے وقف۔۔۔ جو ۱۰ جولائی ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوا اور ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

اس کی پیاری ماں سارہ بولینڈ کی جانب سے۔''

لوسیلی کا دماغ خطرناک حد تک تخریبی ضرور تھا لیکن وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ اس کا ذہن آئندہ آنے والی حقیقت کو کھل کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کے ذہن میں فون کی مبہم سی آواز گونجنے لگی اور اسے یاد آیا کہ وہ آواز بڑھیا کی آواز جیسی ہی تھی۔ یہ بڑھیا کی جم بولینڈ سے مشابہت و تعلق کا ایک حوالہ تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ بڑھیا ہی سارہ بولینڈ ہے اور وہ جم ہی تھا جو اپنی ماں سے آخری ملاقات تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی ماں کو بتا دیا کہ اسے اس کی نو بیاہتا دلہن نے کس طرح قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''تو یہی وجہ تھی کہ جم کی لاش نہ مل سکی۔'' لوسیلی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

سارہ بولینڈ نے اسے چپکے سے دفن کر دیا تھا۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کی موت کے بعد طویل عرصے تک انتظار کیا۔ سات سال اس نے ایک ایسی عورت کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے گزار دیے جو اس کے بیٹے کی جائیداد پر حریصانہ نگاہ گاڑے ہوئے تھی۔ سات سال اور اس کے بعد لوسیلی کی موت۔۔۔

آج کی طوفانی شب، لوسیلی کو دہشت اور موت کا سامنا تھا۔ سمندر کی ایک بپھری ہوئی لہر اوپر واقع دہلیز سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی چھت سے پانی کا ریلا اندر گھس آیا۔ پھر کمرا تیزی سے بھرنے لگا۔ لوسیلی کے اعصاب پر فون پر سنی ہوئی آواز مسلط تھی۔ یہی وہ آواز تھی جس پر وہ بریکر پیچ تک کھنچی چلی آئی تھی۔ یہ پیغام فون پر سارہ بولینڈ ہی نے دیا تھا اور وہی بڑھیا اس کے لیے موت کی قاصد بن گئی تھی۔

ادھر بوڑھی سارہ بولینڈ نے لوسیلی کے بند کمرے کی چھت پر ہتھوڑے برسانا شروع کر دیے۔ شگاف میں سے پانی کے گرنے کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ آج رات لوسیلی کی روشن ہاؤس میں واقع جم بولینڈ سے ملاقات ہو رہی تھی لیکن موت کی صورت میں۔۔۔ وہ موت کی آغوش میں جا رہی تھی جہاں جم بولینڈ اس کا منتظر تھا۔ لوسیلی نے چیخ چیخ کر کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہا لیکن وہاں اس بڑھیا کے علاوہ سننے والا کون تھا جو اس کی زندگی چھین لینا چاہتی تھی۔ اسی اثنا میں لوسیلی نے زندگی کی خاطر ہیجانی کیفیت میں خود کو دروازے سے ٹکرا دیا۔ وہ پوری قوت سے مضبوط چوبی دروازے کو کھولنے کے جتن کرتی رہی لیکن تھک ہار کر بستر پر جا گری۔ وہ خوف اور تھکن کے باعث کانپ رہی تھی۔ تاہم اس میں زندہ رہنے اور موت سے فرار ہونے کی تڑپ اب بھی موجود تھی۔ سمندر کا ٹھنڈا پانی اب اس کے گھٹنوں تک پہنچ چکا تھا۔ دیوانگی کے اس خوف ناک ماحول میں بھی لوسیلی کے ذہن نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ اس پانی سے بچ کر نکل سکتی ہے۔

لوسیلی نے اداس نظروں سے کالے پتھروں کی دیواروں کو دیکھا پھر بھاری بھرکم شہتیروں والی چھت پر نظریں گاڑ دیں۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا خفیہ غار نما تھا۔ جس میں سے کوئی بھی بدنصیب مجرم زندہ سلامت بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔۔۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسے اچانک ہی ایک راہ فرار سجھائی دے گئی۔ چھت کے ایک کونے میں شمع کی مدھم روشنی میں اسے ایک سوراخ نظر آیا اسے یہ ایک چھوٹا سا روشن دان محسوس ہوا۔ وہ اچھل کر میز پر کھڑی ہو گئی اور اس سوراخ کا جائزہ لینے لگی۔ یہ واقعی ایک روشن دان تھا اور اسے لکڑی کے بولٹ لگا کر بند کیا گیا تھا۔ اس روشن دان کی

کنڈی کمرے کے اندر ہی تھی۔۔۔ لیکن کاش! وہ اس تک پہنچ سکتی۔ روشن دان کھول کر وہ اس قید سے فرار ہوسکتی تھی اور یہ اس کی زندگی کا واحد راستہ تھا۔ وہ میز کو گھسیٹ کر اس کو روشن دان کے نیچے لے آئی۔ اس پر چڑھ کر دیکھا تو اس کے ہاتھ اور روشن دان کے درمیان تقریباً ایک گز کا فاصلہ تھا۔ اس کا ذہن منصوبے پر منصوبہ تیار کرتا رہا۔ وہ یہاں سے ہر چال میں فاتحانہ انداز میں نکل جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ جم بولینڈ کی بوڑھی ماں کتنی احمق ہے۔ اس بڑھیا کو معلوم نہیں تھا کہ لوسیلی تیراک بھی ہے۔ لوسیلی نے اپنے اعصاب مکمل طور پر پرسکون رکھے۔ وہ اب خوف زدہ نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ جوں جوں پانی اوپر آئے گا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ خود بخود اوپر اٹھتی چلی جائے گی۔ یہ پانی اور زندہ انسان کے درمیان ایک ازلی رفاقت کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ پانی روشن دان کے قریب پہنچ جائے گا تو وہ تیرتی ہوئی روشن دان تک پہنچ کر اس راستے سے نکل جائے گی۔ اس کے بعد بڑھیا کو اس شرارت کا ایسا مزا چکھائے گی کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔ آہستہ آہستہ شمع کی مدھم روشنی بھی ختم ہونے لگی اور پانی کے شمع دان تک آتے آتے کمرے میں ایک بار پھر تاریکی چھا گئی۔ لوسیلی کی دنیا ایک بار پھر اندھیر ہوگئی لیکن وہ اندھیرے میں اعتماد کے ساتھ میز پر کھڑی، پانی کے چڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔ پانی آہستہ آہستہ اس کے گھٹنوں سے اوپر چڑھنے لگا پھر اس کی کمر بھی پانی میں ڈوب گئی۔ اور پھر اس کا سینہ۔۔۔ آخر میں اس نے اپنا بھاری ہوتا ہوا گاؤن اتار پھینکا اور اپنے بے لباس جسم کے ساتھ موت کی اس وادی سے فرار ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

بریکر بیچ کی بدمست موجیں اس کے سر پر ٹکرانے لگیں۔ لوسیلی نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تاریک کمرے میں اس کا مرمریں بدن پانی میں تیر رہا تھا۔ پانی کچھ فٹ اور چڑھ آیا۔ آخر کار کمرے کی چھت تک پانی بھر گیا۔ بڑھیا نے سوچا ہوگا کہ لوسیلی ڈوب چکی ہوگی اور اس کی مثال اس چوہے کی سی ہوگی جسے صرف برساتی نالے میں پھینکنا باقی تھا۔۔۔ لیکن اندر لوسیلی زندگی اور موت کی سرحد پر ابھی زندہ تھی۔ اس کا ہاتھ اچانک روشن دان کے بولٹ پر پڑا۔ اس نے کنڈی گھمادی۔ اس کے ساتھ ہی فتح مندی کا ایک احساس اس کے نڈھال بدن میں سرایت کر گیا۔ امید کی کرن نمودار ہوئی اور وہ سوچنے لگی کہ اب موت نہیں آئے گی۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر دوڑتی چلی جائے گی۔ اس نے ایک بار پھر روشن دان کو کھولنے کے لیے اپنی قوت مجتمع کی۔ روشن دان کھلا۔ امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ اس نے خود کو روشن دان سے نکالنے کی کوشش کی لیکن روشن دان کے باہر اتنی ہی جگہ تھی کہ وہاں اس کا نڈھال بدن ہی سما سکتا تھا۔ دوسری جانب زمین تھی، ریتلی زمین کے بجائے نم آلود اور دلدلی زمین۔ کائی اور کیچڑ سے لت پت زمین۔ یہ جگہ غالباً اس کی قبر کے لیے خاص طور پر تیار کی گئی تھی۔ اس نے اپنے انجام پر نظر ثانی کی۔ تاریک قبر کو دیکھنے کی آخری کوشش کی۔۔۔ بالآخر تھک کر موت کا انتظار کرنے لگی۔ زندگی کی طرف جانے والا آخری راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اب اسے جم بولینڈ کی روح کے ساتھ ساتھ موت کا بھی شدت سے انتظار تھا۔ اس کی مسلسل کوششوں اور چڑھتے ہوئے پانی کی وجہ سے روشن دان کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ بند ہوگیا اور لوسیلی نے موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ اس قبر میں زندہ دفن ہوگئی تھی۔

اس کے بعد لوسیلی کا کوئی پتا نہ چلا۔ اس کی زرد رنگ کی کار کھاڑی کے قریب پچاس فٹ گہرے پانی میں کھڑی تھی۔ وہ خود بھی جم بولینڈ کی طرح خاموشی کے ساتھ غائب ہوگئی۔ ایمن مارٹینز کو لوسیلی کے شوہر کی حیثیت سے اس کے سابق شوہر جم کی جائیداد کا وارث بننے کے لیے مزید سات سال انتظار کرنا ہوگا۔

متی

کرشن چندر

میری اولاد میں صرف لڑکے ہی لڑکے ہوئے' لڑکی کوئی نہیں ہوئی پر اب متی کے آجانے سے لگتا ہے' جیسے وہ کمی پوری ہوگئی ہو مگر گابالین والے میری اور متی کی دوستی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے

کرشن چندر کے قلم سے ایک دلچسپ تحریر

میں گابالین کے نکڑ پر رہتا ہوں اور اوپر کی منزل کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر دنیا کا تماشا دیکھا کرتا ہوں' جب عمر ساٹھ برس سے اوپر ہو جائے تو پھر خود کچھ کرنے کو نہیں رہتا' پاجامے کے اوپر بنیان پہنے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دھیرے دھیرے ہاتھ جھلاتے ہوئے گزرتی بہتی دنیا دیکھنے میں مزا آتا ہے۔ نکڑ والے اس بنگلے کی مشرقی سڑک ائرپورٹ جاتی ہے' مغربی سمت ایڈور ایونیو کے بنگلے میں جن کے آخر میں عیسائی راہباؤں کا کانونٹ ہے' نکڑ کی مخالف سمت یعنی گابالین کے دوسرے سرے پر ایک بے حد بانکی چھریری خوجن اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ رہتی ہے اور تین بچوں کے باوجود بے حد خوب صورت ہے' بال کٹے ہوئے ہیں' لہرا کر چلتی ہے' جیسے اپنے آپ کو عورت نہیں بادِ نسیم کا جھونکا سمجھتی ہے۔ پہلے تو وہ میری تاک جھانک سے بدکتی تھی مگر اب میرے اور اسکے درمیان ایک خاموش مفاہمت سی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ میری کھڑکی کے قریب آکر وہ ایک لمحوں کے لئے رک کر دیکھتی ہے پھر ایک عجیب ادا سے مجھے اپنا رخ دکھا کر بریدہ گیسو جھلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

خوجن کے گھر کے سامنے ایک مشہور پاپ سنگر رہتا ہے۔ اس کی دو بہنیں ہیں' جون اور مارتھا۔ مارتھا نام رکھنے والی لڑکی کو میں نے آج تک پسند نہیں کیا۔ ایک اسی مارتھا کو کیا کہیے میں نے آج تک جتنی مارتھائیں دیکھی ہیں' سبھی کو معمولی شکل و صورت کا پایا ہے مگر دل بے حد گداز ہوتا ہے ان کا اور بے حد شوہر پرست اور بچوں پر جان چھڑکنے والی مائیں ہوتی ہیں۔ جون کو البتہ میں پسند کرتا ہوں' خوب صورت تو نہیں ہے یوں کہنا چاہیے کہ خوب صورت بنتے بنتے رہ گئی ہے' ہاں اتوار کو جب گرجا کے لئے سج سنور کر جاتی ہے تو خاصی دل کش معلوم ہوتی ہے جانے کیا بات ہے سجنے سنورنے سے عورت کا رنگ روپ نکھر آتا ہے، مرد پہلے سے زیادہ بدصورت ہو جاتا ہے۔

خوجن سے تو علیک سلیک بھی نہیں ہے مگر جون سے ہے۔ ایک روز میں ٹیکسی میں آموں کی ٹوکری لا رہا تھا' بنگلے کے آہنی گیٹ پر جب ٹیکسی روک کر میں نے آموں کی ٹوکری اٹھانا چاہی تو ٹوکری میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر الٹ گئی اور بہت سے آم ادھر اُدھر لڑھکنے لگے۔ کم بخت ٹیکسی ڈرائیور نے ذرا بھی مدد نہیں کی مڑ کے

سے ٹیکسی میں بیٹھا بیڑی پیتا رہا' مجھے اس قدر غصہ آیا کہ میں نے جیب سے چھرا نکال کر اسے وہیں جان سے مار دیا یعنی خیال ہی خیال میں اب تک میں درجنوں قتل کر چکا ہوں اور جس طرح کا مزہ اس قسم کے قتل میں ہے' وہ اصل قتل میں بھی کیا ہوتا ہوگا پھر نہ کورٹ جانا پڑتا ہے نہ مقدمہ چلتا ہے نہ سزا ہوتی ہے نہ لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں نہ ضمیر سرزنش کرتا ہے' چھری اٹھاؤ قتل کرو پھر مزے سے وہ چھری صاف کر کے اسی سے آم کاٹ کے کھاؤ۔

چنانچہ جب اس خیالی چھری سے ٹیکسی ڈرائیور کو ہلاک کر کے میں سڑک پر لڑھکتے ہوئے آم کو اکٹھے کرنے لگا تو جون کہیں سے آ گئی' اس نے آ کر پہلے تو ٹیکسی ڈرائیور کو ڈانٹا پھر میرے ساتھ لگ کر آم اکٹھے کر کے میری ٹوکری میں ڈالنے لگی۔ جون کی رنگت میرے آموں کی طرح سنہری ہے اور بڑی بڑی سیاہ پلکیں اسکی آنکھوں کی جھیلوں پر سایہ کیے ہوئے دور کنپٹی تک چلی گئی ہیں' پلکیں نقلی ہیں تو کیا ہوا رنگت میک اپ سے بدلی ہے تو کیا ہوا' لگتی تو اچھی ہے اور سڑک سے آم اٹھاتے اٹھاتے اس کے اوپر کے ہونٹ پر پسینے کی بوندیاں نمودار ہو چلی ہیں۔ بہت پیاری لگتی ہے آم ٹوکری میں جمع کر کے چلی جائے گی تو کیا؟ ایک دن سب کو جانا ہے لیکن یہ خوب صورت لمحہ میں نے ایک خوش رنگ تتلی کی طرح پکڑ کر اپنی زندگی کی کتاب میں رکھ لیا ہے' جب یہ صفحہ کھولوں گا اس تتلی کے رنگ میری آنکھوں میں تھرتھرائیں اور آرام کی خوشبو سے میرے سارے احساس بھر جائیں گے۔

دو برس ہو گئے اس واقعے کو..... وہ جب بھی مجھے ملتی ہے ہیلو انکل کہتی ہے میں کہتا ہوں ہیلو جون یعنی انکل کہہ کر اس نے مجھ سے اپنا فاصلہ برقرار رکھا ہے' میں جون کہہ کر اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہوں اور یوں ہی یہ کشمکش چلتی رہے گی۔ سوچتا ہوں ایک روز ایئر پورٹ جا کر اپنے تینوں لڑکے جو ولایت میں پڑھتے ہیں انہیں جمع کر کے ٹیکسی میں بھر لاؤں گا۔ گھر کے آہنی گیٹ کے باہر جب ٹیکسی رکے گی تو تینوں لڑکے ٹیکسی سے آموں کی طرح لڑھک پڑیں گے اور جون کہیں سے آتی ہوئی ان میں سے کسی ایک کو چن

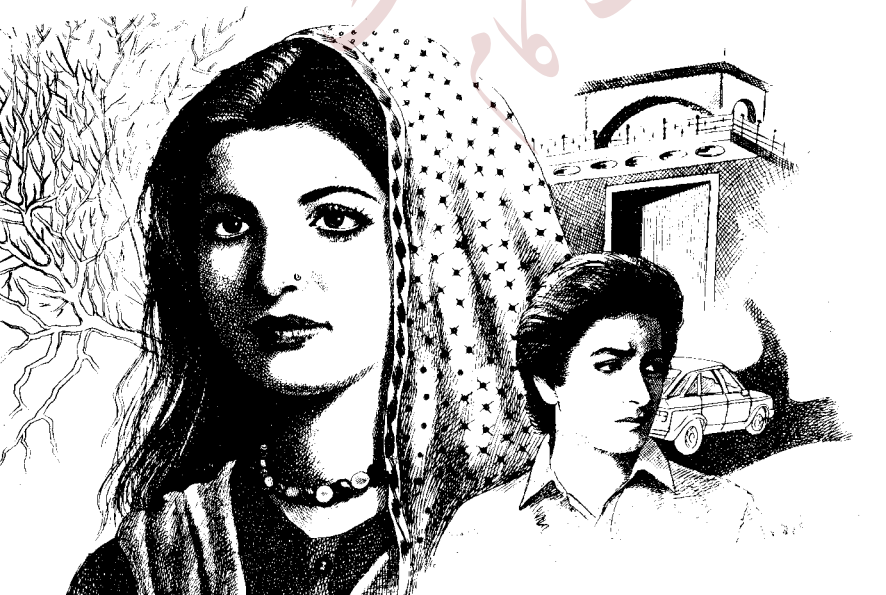

لے گی اور اس کے ساتھ گرجا چلی جائے گی۔
جون بے حد قدامت پرست شریف لڑکی ہے وہ ہر اتوار کو اپنے بوائے فرینڈ نہیں بدلتی' دوسرے تیسرے مہینے جا کر بدلتی ہے اور اپنے بوائے فرینڈ کے سامنے مجھے ذلیل نہیں کرتی ہے یعنی انکل نہیں کہتی صرف اکیلے میں انکل کہتی ہے' دوسرے ہو ں تو بس چور نظر سے دیکھ کر خاموشی سے گزر جاتی ہے' اسکی خاموشی نئے کپڑوں میں بسی ہوئی مہک کی طرح میرے نتھنوں میں پھیل جاتی ہے اس کا ہیلو کہنا مجھے اتنا اچھا نہیں لگتا جتنا ہیلو نہ کہنا کیونکہ کبھی کبھی نہ کہنے کی بلاغت کہہ دینے کی فصاحت سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

خوجن کے شوہر کے پاس ایک گاڑی ہے ایک اور ایک لاری ٹمپو اور لاری وہ کرائے پر دیتا ہے اور گاڑی بالعموم اس کی بانکی خوجن چلاتی ہے اور آلو یا پیاز تک کے لئے اسکی گاڑی مارکیٹ تک لے جاتی ہے خوجن کو میں اکثر اپنی طرح بس میں جاتے دیکھتا ہوں اب میرے پاس بھی اگر گاڑی ہوتی تو میں گرے ہوئے آم کی طرح سڑک پر نہ لڑھکتا ہوتا خود عورتیں ہمک کر میری گاڑی میں آ بیٹھتیں' ہمارے سماج کا الجبرا ہی کچھ اس قسم کا ہے' گاڑی کو عورت سے ضرب دو تو مرد کی عمر آدمی ہو جاتی ہے۔

جون اور مارتھا کا بھائی جو مشہور پاپ سنگر ہے اور اکثر شام کو اپنی کوٹھی کی چھت کی منڈیر پر ٹانگیں پھیلائے گٹار گود میں لیے گاتا نظر آتا ہے اس کے پاس بھی زرد رنگ کی لوہاک کی گاڑی ہے یہ گاڑی بھی اسٹائلش ہے اور اسے دیکھ کر آج کل زرد دھاری والی پتلون کا خیال آتا ہے جو ہندوستانی ہپیوں میں بہت پاپولر ہے۔

مارسیا کے پاس زینڈا گاڑی ہے' اسے مارسیا کے پاس آئے ہوئے اتنے ہی سال ہو گئے جتنے سال مارسیا کے شوہر کو مرے ہوئے ہیں زینڈا کو مارسیا کا شوہر انگلینڈ سے لایا تھا، اس کا عہدہ چیف انجینئرنگ کا تھا رونڈا ڈیم کی تعمیر میں ڈائنا مائٹ کا ایک بچہ فلیتا بے وقت پھٹ جانے سے اس کی موت ہوگئی۔ تین برس کا ایک بچہ چھوڑ کے وہ مارسیا کو داغ مفارقت دے گیا۔ گھر کا امیر تھا اس لئے گابالین کا سب سے خوب صورت گھر مارسیا کو دے کر چلا گیا۔ ہماری طرح کا دو منزلہ بنگلہ ہے' اوپر کی منزل میں مسٹر اور مسز ایش وڈ رہتے ہیں۔ وہ اکثر اپنی زینڈا میں کسی کورٹ شپ کے لئے آنے والے مرد کے ساتھ گھومتی دکھائی دیتی ہے' اس کے بوائے فرینڈ بدلتے رہتے ہیں' اسکی گاڑی کا رنگ بھی سال میں دو مرتبہ بدلتا ہے' جوں ہی اس کی گاڑی کا رنگ بدلا میں سمجھ جا تا ہوں کہ اب اس کا بوائے فرینڈ بھی بدلے گا۔

گابالین میں اپر مڈل کلاس رہتی ہے' دو ایک کو چھوڑ کر سب کے پاس اپنے بنگلے ہیں' اپنی گاڑیاں ہیں' اپنی مطمئن زندگی ہے' گابالین میں دو ایک کو چھوڑ کر سبھی کرسچین رہتے ہیں۔ ہر گھر میں پیانو ہے' مغربی موسیقی کا شوق ہے' مغرب سے آئے ہوئے فیشن سب سے پہلے گابالین اور ایڈورڈ ایونیو میں نمودار ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومتی ہیں' مرد اپنی محبوباؤں کے ساتھ..... میں کھڑکی میں کھڑا دیکھتا ہوں۔

مگر کچھ دنوں سے اس طمانیت اور فراغت بھری زندگی میں غریبی گھس آئی ہے' کوئی بیس پچیس مزدور میونسپل کمیٹی کی طرف سے مامور کیے گئے ہیں۔ گابالین کے دونوں طرف کنکریٹ کی ڈرین پائپ ڈالنے کے لئے ان لوگوں نے میری کھڑکی کے بالکل سامنے سڑک کے اس پار گڈھے پار کر کے بنگلے کے باغیچے کی باڑھ سے لگ کر چھپر باندھ لیے ہیں' لگتا ہے گابالین کا ایک حصہ مسلم میں بدل گیا ہے' کالے کالے ننگے بدن نیکر اور پھٹی ہوئی بنیان پہنے ہوئے کدال سے زمین کھودتے رہتے ہیں' چٹائی کے چھپروں میں کھانا پکاتے ہیں' وہ چھپر پرانے زنگ آلود ٹین

کے پتروں سے بنے ہیں' ایک میں تو دروازہ بھی ہے اور اس پر کبھی کبھی تالا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ ٹین کے اس چھپر میں سیمنٹ کے بورے رکھے جاتے ہیں' اس کے قریب آٹھ بڑے بڑے لوہے کے ڈرم پانی سے بھرے رکھے ہوئے ہیں یہی پانی سیمنٹ ریت اور بجری ملانے کے کام آتا ہے۔ اسی پانی میں مزدور نہاتے ہیں' یہی پانی وہ پیتے ہیں' ہر روز صبح پانی سے بھری ہوئی ایک لاری آتی ہے اور ڈرم بھر جاتی ہے۔

رات کو کھلے چھتروں میں مزدور چولہے پر روٹی پکاتے ہیں۔ کھانا کھا کے اسی جھلملاتی روشنی میں جس میں تاریکی زیادہ ہوتی ہے اور روشنی کم' وہ ہجر و فراق کے گیت گاتے ہیں کیوں کہ ان کی بیویاں ان کے گاؤں میں ہیں اور وہ اپنے گاؤں سے سینکڑوں میل دور گابالین کی پکی سڑک کے دو رویہ ڈرین پائپ کے کیڑے ہیں' ہم لوگوں کو بہت برا لگتا ہے۔ گابالین کے افق پر دور دور تک ایسی بدصورتی اور غریبی نہ تھی' لگتا ہے اب تک اخباروں میں جو پڑھتے تھے دن رات ایکا ایکی وہ پرابلم ہمارے سامنے آ گیا ہے مگر ہمارا اس پرابلم سے کوئی واسطہ نہیں بہت عرصہ ہوا ہم لوگ اپنے اپنے پرابلم حل کر کے گابالین میں آ کر بس گئے تھے ہمیں کیوں تنگ کیا جا رہا ہے؟ کوئی آٹھ دس دن کی بات ہو تو آدمی دانت بھینچ کر آنکھ بند کر کے گزار دے مگر یہ لوگ تو سنا ہے چار مہینے تک یہاں رہیں گے اور نہ صرف گابالین بلکہ ایڈورڈ ایونیو کی دونوں گلیوں میں کنکریٹ کے پائپ ڈالیں گے۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ راتوں رات نالیاں کھد جائیں سیمنٹ کے بستر بن جائیں اور ان میں کنکریٹ کے پائپ جما دیے جائیں؟ سائنس کی دنیا میں کیا ممکن نہیں مگر میونسپل کمیٹی ہمیں تنگ کرنے پر تلی ہوئی ہے یہ پانچ روپے یومیہ مزدوری پانے والے مزدور جانے کہاں سے ایک کانٹے دار جھاڑی کی طرح ہمارے باغیچے میں اگ آئے ہیں' یہ لوگ ہماری گابالین کی خوب صورت زندگی میں ایک بدنما دھبے کی طرح ابھر آئے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ناک سکوڑ کر ان کے قریب سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ جن کے پاس گاڑیاں ہیں وہ اس نکڑ سے جلدی سے نکل جاتے ہیں مگر مزدوروں کو ہماری زندگی سے کوئی علاقہ نہیں' ہماری رائے کی کوئی پروا نہیں جیسے یہ لوگ کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوئے ہوں۔

یہ لوگ آپس میں چہلیں کرتے ہیں' ہنستے ہیں' گیت سناتے ہیں' کام کرتے ہوئے گیت گاتے ہیں۔ دال بھات یا دال روٹی کھا کر اپنے چھپر میں یا سڑک کے کنارے لیٹے ہوئے بڑے بڑے ڈرین پائپوں کے اندر بڑے مزے سے سو جاتے ہیں۔ امیر لوگوں کو ہر دم خیال رہتا ہے کہ وہ امیر ہیں لیکن ان غریب لوگوں کو کبھی خیال نہیں آتا کہ یہ غریب ہیں۔ ان کے ہنستے بشاش چہرے اور تن درست جسم دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید ان لوگوں نے کوئی ایسی امیری ڈھونڈ لی ہے جسے پیسے کی حاجت نہیں۔

چند دنوں سے ان مزدوروں میں ایک لڑکی شامل ہو گئی ہے' گہرا سیاہ رنگ' بٹن جیسی چمکتی آنکھیں اور ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ اور صاف ستھرے ہاتھ پاؤں۔ میں اسے اکثر ایک چڈی پہنے پانی کے بڑے ڈرم کے قریب نہاتے دیکھتا ہوں' بال اکثر کھلے ہوتے ہیں' کبھی کبھی پھول دار کاٹن کا ایک چیتھڑا اس میں بندھا ہوتا ہے۔ نہا کر وہ اکثر سڑک پر بیٹھ کر پتھر کے ٹکڑے جمع کرنے لگتی ہے' کبھی مادر زاد ننگی ہو کر ناچنے لگتی ہے نہیں نہیں' وہ پاگل نہیں ہے' وہ محض تین سال کی ایک بچی ہے۔ اس کا نام متی ہے اور اس کے مزدور باپ کا نام گھولو ہے۔ گھولو بالکل ایک نوجوان سا لڑکا ہے۔ تین سال ہوئے اس کی بیوی نمونیا سے مر گئی۔ متی کو اس کی بیوی کی

بڑی بہن نے پالا ہے جو سولہویں روڈ پر تعمیر ہونے والی یونائٹڈ بلڈنگ میں کام کرتی ہے مگر گھولو اپنی بیٹی کے بغیر نہ رہ سکا' اس لیے اب وہ اسے یہاں لے آیا ہے۔

مجھے متی بہت بھاتی ہے' کھڑکی سے میں اسے اکثر دیکھتا ہوں' اسے نہانے کا بھی بے حد شوق ہے۔ بھرے ہوئے ڈرم سے اپنی چھوٹی سی لٹیا میں پانی لے لے کر نہاتی رہتی ہے' نہا کر پھر سڑک پر کھیلتے ہوئے خاک میں لوٹتے ہوئے اتنی ہی گندی ہوجاتی ہے مگر اسے اس کا کوئی احساس نہیں ہے۔ سڑک کی خاک اس کے لیے گھس کی لان کے برابر ہے یا کسی عمدہ باغیچے کی طرح۔

شروع شروع میں مجھے اس کا عریاں رہنا بہت کھلا' میں اس کے لیے ایک دن دو چڈیاں لے آیا' پھر ایک فراک لایا' پھر مٹھائی لایا' پھر بالوں کے لیے ربن لایا۔ بڑی مشکل سے وہ کافرادا رام ہوئی' پہلے پہل وہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر چھپر میں چھپ جاتی اور چھپر کے دروازے کی آڑ سے جھانک کر مجھے دیکھتی۔ بات تو اب بھی وہ مجھ سے نہیں کرتی کیوں کہ متی ہندی نہیں جانتی۔ گھولو مدھیہ پردیش کا قبائلی ہے' وہ شہروں میں رہ کر ہماری بولی سیکھا ہے۔ مگر متی تو ابھی تین سال کی ہے' میری اور اس کی گفتگو اس کے باپ کے ذریعے ہوتی ہے یا اس کی چمکتی آنکھوں کے ذریعے یا اس کی گردن کی جنبش کے ذریعے جس سے وہ ہاں یا ناں کرتی ہے مگر دھیرے دھیرے وہ میری محبت کی رشوت کی قائل ہوتی جارہی ہے۔ اس نے طے کرلیا ہے کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف مجھ سے۔ دو نئے فراک' ایک نئی چڈی' چند ربن اور کچھ پیسے جو میں اسے دیتا ہوں' اس نے الگ ایک پوٹلی میں باندھ کر رکھ دیے ہیں۔ کہتی ہے' یہ میرا جہیز ہے۔ کبھی تو ہمک کر میری گود میں آجاتی ہے' کبھی انگلی پکڑ کر میرے ساتھ ساتھ سڑک پر چند قدم چلتی ہے پھر جہاں پانی کے ڈرم رکھے ہیں' وہاں جا کر رک جاتی ہے اور مجھ سے بازار سے کھلونے لانے کی فرمائش کرتی ہے۔ اب اس کے پاس لکڑی کا گھوڑا ہے' کپڑے کا خرگوش ہے' بھالو ہے اور ایک بہت پیاری گڑیا ہے اور پلاسٹک کا ایک ببوا ہے جسے وہ اکثر اپنے ساتھ نہلاتی ہے اور نہلا کر اسے اپنی کمر کے خم میں لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح چلتی ہے۔

میری اولاد میں صرف لڑکے ہی لڑکے ہوئے' لڑکی کوئی نہیں ہوئی پر اب متی کے آجانے سے لگتا ہے' جیسے وہ کمی پوری ہوگئی ہو مگر گاؤں والے میری اور متی کی دوستی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ انہوں نے میرے گھر والوں کو سمجھایا اور میرے گھر والوں نے مجھے سمجھایا مگر کچھ اثر نہیں ہوا مجھ پر۔ میں متی کے اور متی میرے بہت نزدیک آتے گئے۔ میں نے متی سے کہہ دیا ہے کہ ہم شادی تو کرہی لیں گے مگر وہ بار بار پوچھتی ہے۔ ''کب؟''

میں جواب دیتا ہوں۔ ''جب اس سڑک کے دونوں طرف ڈرین پائپ لگ جائیں گے مگر ایک پائپ ہم رکھ لیں گے اپنے رہنے کے لیے ورنہ ہم سوئیں گے کہاں۔''

متی کو چھپر کی زندگی پسند نہیں ہے۔ اسے کنکریٹ کا ڈرین پائپ زیادہ پسند ہے' صاف ستھرا ہے' دو طرف سے کھلا ہے۔ متی کو اس میں کھیلنا بہت پسند ہے۔ جب سے میں نے اسے لوہے کے ہک میں پھنسا ہوا لال لنگور لادیا ہے' وہ اسے اکثر ہک پائپ میں پھنسا کر لنگور کو ڈوری سے اوپر نیچے پھلانگتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

ایک روز جب میں بنارسی مٹھائی والے سے متی کے لیے تھوڑی سی مٹھائی لے کر چلا آرہا تھا تو نکڑ پر متی مجھے دیکھ کر دونوں بانہیں پھیلا کر بے تحاشا کلکاریاں مارتی خوشی سے دوڑتی میری طرف بھاگی۔ سڑک کراس کرتے ہوئے اسے آس پاس کا کوئی دھیان نہ رہا' اس کی چمکتی

آنکھیں صرف مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت نکڑ سے مارسیا کی موٹی تیز ٹرن کاٹتی ہوئی سب وے سے آ کر اس کے گھر کی طرف نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے منہ سے زور کی چیخ نکلی کیوں کہ متی موٹر کے نیچے آ چکی تھی۔ موٹر مارسیا کا نیا بوائے فرینڈ چلا رہا تھا۔ وہ یونائیٹڈ کنگ ڈم سے بیس روز کی چھٹی پر آیا تھا اور چند دن بعد مارسیا کو انگلینڈ لے جانے والا تھا جہاں اس کا اور مارسیا کا فائنل کورٹ شپ ہونے والا تھا۔ مارسیا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور اس کے بوائے فرینڈ نے موٹر سے اتر کر ان ان پڑھ جاہل گندے غلیظ مزدور کو ہزاروں گالیاں سناڈالیں جو اپنے بچوں کو سڑک پر ننگ دھڑنگ ناچنے گانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

میں نے اور گھولو نے اور مزدوروں نے مل ملا کر متی کو موٹر کے نیچے سے نکالا مگر وہ مر چکی تھی۔

ہم لوگ متی کو دفن کر آئے ہیں۔

گابالین میں سناٹا ہے۔ آج کسی چھپر میں چولہا نہیں جلا۔ سب مزدور گھولو کے گرد جمع ہیں جو اپنا منہ بازوؤں میں چھپائے چپ چاپ لیٹا ہے۔ ڈرین پائپ میں لٹکا ہوا لنگورا کیلا ہے اور متی کی گڑیا چھپر کے ایک کونے میں الٹی پڑی ہے' وہ لوگ گھولو سے بات کرنا چاہتے ہیں مگر وہ کسی سے بات نہیں کر رہا' چپ چاپ لیٹا ہے۔

میں نے ایک مزدور کو چھ روپے دیے۔

''اسے شراب پلاؤ۔ اس سے باتیں کرو' اسے بہکنے دو ورنہ یہ بھی جان سے چلا جائے گا۔ غم زدہ گھولو۔''

مارسیا کے بنگلے کی کھڑکیاں کسی مجرم کے ضمیر کی طرح اندر سے بند ہیں۔ لین میں آنے والے نکڑ کے قریب سر جھکائے گزر جاتے ہیں۔ رات گہری ہوتی جاتی ہے۔ غم زدہ گھولو کے سینے میں سسکیاں بھری ہیں مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلتی' وہ اسے شراب پلاتے ہیں' وہ چپکے چپکے پیتا جاتا ہے۔

پھر ایک مزدور نے گھولو کے سامنے متی کی پوٹلی رکھ دی۔ گھولو نے اسے دھیرے دھیرے کھولا۔ نہ اس کی آنکھ نم ہے' نہ ہاتھ کانپتے ہیں۔ وہ ایک ایک چیز الگ کرتا ہے۔ اودے پھولوں والا فراک' بادامی ریشم کا فراک' لال چڈی' ہری چڈی' ہاتھوں سے تالی بجانے والا بھالو' لمبے لمبے کانوں والا خرگوش' سونے کے پالش والا جھمکا۔

ایکا ایکی وہ اک زوردار چیخ کے ساتھ اٹھا اور اٹھتے ہی اس نے چھپر کی آہنی دیوار سے لوہے کا ایک پترا کھینچ لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل گیا۔

مسکراہٹیں

''میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی بہت خطرناک ڈرائیونگ کرتی ہے۔'' ایک دوست نے دوسرے کہا۔

''درست ہے۔'' دوسرے نے اطمینان سے کہا۔

''جس وقت وہ ڈرائیونگ کرتی ہے چوراہے کی سرخ بتی بھی اسے دیکھ کر زرد پڑ جاتی ہے۔''

☆☆☆

چار ڈاکو ریل کے مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے ایک مسافر سے پوچھا۔

''تمہارے پاس کیا ہے۔؟''

مسافر نے جلدی سے کہا۔ ''بھائی! آہستہ بولو' میرے پاس تو ٹکٹ بھی نہیں ہے۔''

☆☆☆

ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی بیوی کو ٹیلی فون کا ریسور ٹی وی سے لگاتے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔

بیوی بولی ''حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ ممی کے ٹی وی پر آواز نہیں آ رہی بس ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام ہے صرف۔''

وقت شناس

سیدہ عطیہ زاہرہ

اُسے پیار تھا تو صرف دولت سے، نہ اُس نے
اپنے شوہر کی قدر کی نا اُس کی محبت کی۔ وہ
صرف پیسوں کی پجارن تھی۔۔۔ اُسے چمکتی
چیزیں پسند تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ
ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔۔۔۔
معاشرے میں رشتوں کی ناقدری کی ایک
زندہ مثال۔۔۔ ایک زندہ کردار۔ قارئین کے پیش
خدمت ہے سیدہ عطیہ زاہرہ کے قلم سے

ایک محبت۔۔۔ ایک دھوکا۔۔۔ اور ایک قتل کی کہانی

مایا تیرے تین نام۔ پرما، پرسی، پرس رام
پرانی کہاوت ہے شازل اس کہاوت کو زندہ دیکھ رہا تھا۔ وہ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا جبکہ شائلہ اس کی خالہ زاد بہن دولت مند والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جسے وہ بچپن سے چاہتا تھا اور جب اس کی والدہ نے اس کا رشتہ اپنی بہن کی بیٹی کے لیے دیا تو خالہ نے انہیں بری طرح ذلیل کر کے انکار کر دیا۔
تب شازل نے فیصلہ کیا کہ پرسا سے پرسی، پھر پرس رام بن کر دکھائے گا۔ وہ سعودی عرب چلا گیا۔ اسے بہترین ملازمت مل گئی، لیکن تھوڑی عرصے کے بعد اس کی بہن نے فون پر اسے بتایا کہ شائلہ کا رشتہ تسکین سے طے ہو گیا جو ان کا رشتہ دار تھا۔ اسی دوران شازل کا نظریہ بدل چکا تھا مگر پھر ایک اور خبر سننے کو ملی اور وہ یہ تھی کہ تسکین کسی حادثے میں اپاہج ہو گیا ہے تیسری خبر یہ تھی کہ شائلہ نے تسکین سے شادی کرنے سے منع کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک اپاہج کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی اس دوران شازل نے دوسرے کام شروع کر دیئے اس نے وطن میں ایک بڑا پلاٹ خرید کر اس کی تعمیر شروع کر دی۔ اب اس کے والدین بھی عیش کر رہے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ خالہ جان کی محبت عود کر آئی تھی۔ انہوں نے ان سے ملنا شروع کر دیا تھا۔ شازل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا پھر وہ ایک دولت مند انسان کی حیثیت سے وطن واپس آیا تو پورا خاندان ایئرپورٹ پر اس کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔
کاروں کا کارواں جب بنگلے کے سامنے جا کر ٹھہرا تو شازل نے دیکھا کہ پورے بنگلے کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا ہے اور گلاب کے پھولوں سے گندھا خوب صورت ہار لیے شائلہ دلہن ہی جیسے لباس میں گیٹ کے قریب کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ قریب پہنچا تو اس نے آگے بڑھ کر ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لیے شازل نے اس کی جگمگاتی مسکراتی شوخ آنکھوں کو دیکھا اور بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ برآمدے سے گزر کر کمرے میں قدم رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شائلہ وہیں گیٹ کے پاس کچھ حیران، کچھ پریشان سی کھڑی تھی اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس شام بڑی شان دار دعوت ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر شازل نے سب کو ان کے تحائف دیے چھوٹی خالہ کے لیے وہ ایک قیمتی شال لایا تھا۔

''یہ لیجئے خالہ! یہ آپ کے لیے۔'' اس نے شال دیتے ہوئے کہا۔

''جب آپ کی اپنی چادر کم پڑ جائے تو اس میں پیر پھیلا لیجئے گا۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔'' خالہ اس کا طنز نہ سمجھ سکیں اور یہ بات ہنسی میں اڑ گئی۔ شائلہ کو شازل نے ایک بیوٹی بکس دیا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے۔'' وہ بولا۔ ''اپنے آپ کو چھپانے اور دکھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہوتی، کبھی استعمال کر کے میرے سامنے آنا۔ مجھے یہ جاننے سے بڑی دلچسپی ہے کہ تم اپنے آپ کو چھپانا چاہتی ہو یا دکھانا۔''

''میک اپ تو میں نے اب بھی کر رکھا ہے۔'' شائلہ نے جواب دیا۔

''یہ مجھے پسند نہیں آیا۔''

''کیوں۔۔۔؟''

''تم نے اسے تیسری طرح استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''تیسری طرح۔۔۔؟''

''ہاں، دوسروں کو بے وقوف بنانا، یہ اس کا تیسرا استعمال ہے اور میں بے وقوف بننا پسند نہیں کرتا۔'' دعوت رات کے گیارہ بجے بڑے خوش گوار انداز میں ختم ہوئی۔ خالو جان کو کوئی کام تھا۔ وہ کچھ پہلے چلے گئے تھے اور ان کے ساتھ کار بھی۔ امی نے شازل سے کہا کہ وہ خالہ اور شائلہ کو گھر چھوڑ آئے اور شازل بڑی سعادت مندی سے آمادہ ہو گیا۔ خالہ اور شائلہ تو یقیناً بڑے آرام سے پیچھے بیٹھ سکتی تھیں اور بیٹھتی ہوں گی مگر اس وقت خالہ کچھ اکسا کر بولیں۔

''شائلہ بیٹی! آگے بڑھ جاؤ میں کچھ تھک سی گئی ہوں پھیل کر بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' شازل دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ دراصل خالہ، شائلہ کو پھیلنے کا مشورہ دے رہی تھیں، اگرچہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ شازل کی بہن اپنے خطوط میں شائلہ کی جن خوبیوں کا مسلسل تذکرہ کرتی رہی تھی، ان میں سے اس کی بے باکی اور آزاد خیالی سرفہرست تھی اور اتنا تو شازل بھی جانتا تھا کہ کالج کے زمانے میں شائلہ کی دوستی لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں سے بھی تھی، پھر وہ کلب وغیرہ بھی جاتی رہتی تھی اور خاندان کے بیشتر کزنز باری باری اس کی رفاقت سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔ پورے راستے کے دوران شائلہ نے مختلف باتیں چھیڑنے کی کوشش کی مگر شازل نے ہوں، ہاں سے زیادہ جواب نہیں دیا۔ خالہ اپنی بیٹی سے زیادہ تجربے کار تھیں۔ انہوں نے شازل کی بے رخی کو محسوس کر لیا۔

''بیٹی۔۔۔! زیادہ باتیں مت کرو، شازل کو پوری توجہ سے کار چلانے دو۔'' وہ بولیں۔ ''ڈرائیونگ کرتے ہوئے باتیں کرنا اکثر کسی حادثے کا سبب بن جاتا ہے۔'' گھر پہنچ کر خالہ نے شازل اور شائلہ کو ایک بار پھر گفتگو کا موقع دینے کے لیے چائے بنانے کا بہانا کیا اور غائب ہو گئیں۔ شازل نے بھی سوچا کہ چلو بات کر ہی لی جائے۔ وہ بہانے ہی تلاش کرتی رہ گئی کہ اس نے براہ راست سوال کر دیا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے تسکین سے منگنی توڑ دی ہے۔''

اس نے سرسری لہجے میں پوچھا شائلہ صرف لمحہ بھر کے لیے گڑبڑائی مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں چوکنے والی نہیں تھی۔

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔''

''وجہ۔۔۔؟''

شازل مسکرایا۔

''کیا اب اس کے پاس ہزار گز کا بنگلہ اور منہ دکھائی میں دینے کے لیے پچاس تولے سونے کے زیورات نہیں ہیں۔''

''تو تم نے امی کی وہ حماقت گرہ میں باندھ لی ہے۔''

''حماقت۔۔۔''

''ہاں، میرے نزدیک خالہ جان سے یہ مطالبہ کرنا حماقت ہی تھی۔'' شائلہ نے جواب دیا۔

''دولت اہم چیز ہے مگر کچھ چیزیں اس سے بھی

زیادہ اہم ہوتی ہیں۔''

''وہ کیا۔۔۔؟''

''بچپن کا ساتھ اور سب سے بڑھ کر پسندیدگی کا جذبہ۔''

''تو یہ بات تم نے اپنی امی کو کیوں نہیں سمجھائی۔''

''میں تعلیم یافتہ اور آزاد خیال ہونے کے باوجود ایک مشرقی لڑکی ہوں، ہمارے یہاں بیٹیوں کو والدین کے حکم پر سر جھکانا سکھایا جاتا ہے۔''

''بہت خوب۔۔۔! مگر میں نے سنا ہے کہ تسکین سے شادی کرنے سے انکار تو تم نے کیا ہے جب کہ خالہ یہ رشتہ برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔''

''دل سے وہ بھی انکار کے حق میں تھیں مگر مروت لحاظ کی وجہ سے کہہ نہیں سکتی تھیں۔'' شائلہ نے جواب دیا۔

''چنانچہ میں نے کہہ دیا اس کے علاوہ فرماں برداری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔''

''تو تم نے انکار کیوں کیا؟''

''اوّل اس لیے کہ تسکین مجھے شروع سے ناپسند تھا۔ دوسرا اس لیے کہ اب وہ نارمل زندگی گزارنے کے قابل نہیں۔ میں ایک اپاہج انسان کی لاٹھی بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔''

''حالانکہ اُس وقت وہ تمہاری خدمت اور محبت کا زیادہ مستحق تھا۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں جو بس وعظ و تلقین کی حد تک ہی اچھی لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر اس کا مجھ پر کوئی حق تھا تو میرا اپنی ذات پر بھی کوئی حق ہے۔''

''تمہاری صرف منگنی ہوئی تھی۔ اس لیے تم نے آسانی سے تسکین کو چھوڑ دیا۔ بالفرض شادی ہو جاتی۔''

''میں پھر بھی اسے چھوڑ دیتی۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا۔۔۔''

شازل نے پھر براہ راست بات کی۔ ''کہ اگر تم سے شادی کے بعد میں خدانخواستہ کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں تو تم مجھے بھی چھوڑ دو گی۔''

''ہر بار ویسے حادثے نہیں ہوتے۔''

شائلہ بولی۔ ''مزید یہ کہ تمہاری حیثیت وہ نہیں جو تسکین کی تھی، میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

''شکریہ۔'' شازل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''ویسے میں نے سنا ہے کہ ظفری، اسد اور خادم نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔''

ظفری دوسرے ماموں اور اسد چچا کا بیٹا تھا۔ جب کہ خادم تایا زاد بھائی تھا۔ شائلہ نے نام سن کر بڑا برا منہ بنایا اور بولی۔

''مجھے شادی کرنا ہے، بندر نہیں پالنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ان تینوں کے پاس دولت کے سوا کیا ہے۔ پھر دولت بھی اپنی نہیں، ماں باپ کی۔''

''گویا اب یہ یقین کر لیا جائے کہ اگر میں کسی طرح اپنی امی کو آمادہ کر لوں تو خالہ انہیں انگوٹھا دکھا کر واپس نہیں کر دیں گی۔''

''نہیں۔۔۔'' شائلہ ہنسنے لگی۔ ''اتنے بہت سے لوگوں کو انگوٹھا دکھا دکھا کر ان کا انگوٹھا درد کرنے لگا ہے۔ اب چینج کے لیے کسی کو انگوٹھی دکھانا چاہتی ہیں۔''

''صرف دکھانا؟''

''نہیں، اگر دیکھنے والا اس قابل ہوا تو پہنانا بھی۔''

شائلہ نے جواب دیا اور پھر موضوع بدل کر فوراً پوچھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ کیا سعودی عرب سے بالکل واپس آ گئے؟''

''نہیں سروس کی حد تک۔ وہاں میری بزنس پارٹنر شپ ہے جو ابھی کچھ عرصہ جاری رہے گی۔''

''بزنس بھی کرتے تھے؟''

''ظاہر ہے، صرف ملازمت سے تو ہزار گز کا بنگلہ اور چھ تولے سونے کے زیورات نہیں آ سکتے تھے۔''

''معلوم ہوتا ہے یہ بات تمہارے دل میں چبھ کر رہ گئی ہے۔''

''یقیناً وہ کہی بھی چبھنے کے لیے ہی تھی۔'' شازل نے جواب دیا۔ یہ باتیں شاید ابھی جاری رہتیں مگر خالہ چائے کی ٹرالی لے کر آ گئیں تو شازل خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

شائلہ اور شازل کی شادی طے پانے کی خبر کو خاندان میں ملے جلے جذبات کے ساتھ سنا گیا جو غیر جانبدار تھے وہ خوش ہوئے اور جنہیں منگنی ٹوٹنے سے کچھ آس پیدا ہو گئی تھی وہ دوسری مرتبہ مسترد کیے جانے پر ناراض ہوئے اور اپنی خفگی کا برملا اظہار بھی کیا۔ یوں تو شازل کی امی بھی خوش نہیں تھیں۔ بیٹے کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ شائلہ تمہارے لیے مناسب نہیں وہ ہمارے گھر کے ماحول میں نہیں کھپ سکے گی۔ شازل نے جواب دیا۔

''امی۔۔۔! مجھے آپ کی، اپنی، ہم سب کی توہین کا قرض چکانا ہے، آپ نے ایک مرتبہ شائلہ کو ڈیکوریشن پیس کہا تھا نا، اگر یہ ڈیکوریشن پیس ہمارے گھر میں نہیں سجا تو واپس اسی شوکیس میں چھوڑ آئیں گے۔''

خیر امی بے چاری تو پہلے بھی مان گئی تھیں۔ اب بھی خاموش ہو گئیں، مگر اس مرتبہ جو رقیب میدان میں تھے، شاید وہ باز نہیں آئے کہ شازل کو فون پر دھمکیاں ملنے لگیں۔

''ہیلو مسٹر شازل۔۔۔!''

''جی، فرمایئے۔''

''تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے؟''

''یقیناً ہے۔''

''تو پھر شائلہ کے ساتھ شادی سے انکار کر دو۔''

''کیوں۔۔۔؟؟ اس سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔''

''مجھے اپنی نہیں، تمہاری صحت کی فکر ہے۔''

''بہت بہت شکریہ! میں اپنا خیال رکھ سکتا ہوں۔''

''تمہاری مرضی۔ میں نے آگاہ کر دیا اب اپنے انجام کے تم خود ذمے دار ہو گے۔''

اس طرح کے تین چار فون آئے اور ہر بار مختلف آواز میں تو شازل کو سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ اسے دھمکیوں کی پروا نہیں تھی مگر انجانے میں ناتجربہ کاری کے باعث مار کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بجائے کہ وہ فون کرنے والوں کا کھوج لگاتا، اس نے اپنی تیاری شروع کر دی، یولی ٹیکنک کے دوران تعلیم اس نے نیشنل گارڈز کی تنظیم میں حصہ لیا تھا، جہاں ہتھیاروں کا استعمال اور شوٹنگ بھی سکھائی گئی تھی۔ شازل نے نشانہ بازی میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی اور کئی انعامات بھی حاصل کیے تھے۔ اس وقت اس نے اپنی اسی صلاحیت کو آزمایا۔ رائفل کلب کا ممبر بن گیا اور بہت جلد اپنی پرانی مہارت کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ شازل کی ترکیب اس اعتبار سے کامیاب رہی کہ فون آنے یک لخت بند ہو گئے اس کا خیال تھا اور غالباً حقیقت بھی یہ ہی تھی کہ ناکام عاشق اسے صرف دھمکا ہی سکتے ہیں۔ اس کی تائید اس امر سے ہو گئی کہ جب شازل نے نشانہ بازی کے لیے رائفل کلب جانا شروع کر دیا تو وہ تیاریاں دیکھ کر خود سہم گئے اور دھمکیاں دینا چھوڑ دیں۔ شازل اور شائلہ کی شادی دھوم دھام سے ہوئی اور اگر کسی کو یہ خیال تھا کہ کسی طرف سے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ اندیشہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا اور شائلہ بخیر و عافیت شازل کے خوب صورت بنگلے کے شان دار حجلہ عروسی میں پہنچ گئی۔ یوں اس نے ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد جسے چاہا اسے پالیا۔ لیکن اس کی مسرتوں کی یہ انتہا بہت مختصر ثابت ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ دشمن جو کوئی بھی تھا کسی مصلحت کے تحت وقتی طور پر خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ شازل مطمئن ہو جائے کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا ہے اور واقعی شازل مطمئن ہو گیا۔ خاص طور پر شادی ہو جانے کے بعد کہ اب جو کام ہونا تھا وہ تو

ہوگیا۔ ان دھمکیوں کا مقصد اگر اسے ڈرا کر شائلہ کے ساتھ شازل سے باز رکھنا تھا تو اب بھلا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ شادی کو صرف ایک ماہ ہوا تھا۔ ایک شام شازل اور شائلہ دونوں بن سنور کر ایک عزیز کی دعوت میں شرکت کے لیے گھر سے روانہ ہوئے وہ مکان جس میں انہیں جانا تھا ایک تنگ گلی میں تھا جہاں کار نہیں جاسکتی تھی۔ اس لیے کار انہوں نے روڈ پر ہی چھوڑ دی۔ شام کا ملگجا اندھیرا گلی میں کچھ زیادہ ہی نظر آرہا تھا جسے دور فاصلے پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی دور کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ شازل اور شائلہ آگے پیچھے احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ کسی مکان کی آڑ سے اچانک ایک طویل قامت شخص شازل کے سامنے آگیا اور اس سے پہلے کہ شازل اس کے مقصد کو سمجھ کر اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش کرتا اس آدمی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل کا تیزاب شازل کے چہرے پر چھڑک دیا۔ شازل کے دونوں ہاتھ مدافعت کی کوشش میں اپنے چہرے کی طرف اٹھے اور وہ بری طرح چیخیں مارتا ہوا زمین پر گر کر تڑپنے لگا جب تک لوگ شازل کی مدد کو پہنچے حملہ آور گلی کے دوسرے کنارے سے نکل کر فرار ہوچکا تھا۔ شازل کو فوراً قریب ترین پرائیویٹ اسپتال میں پہنچایا گیا۔ جہاں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ تیزاب چہرے کے بالائی حصے یعنی پیشانی اور آنکھوں پر پڑا ہے اور دونوں آنکھیں بری طرح جل گئی ہیں۔ کچھ تیزاب ہاتھوں پر بھی آیا تھا مگر کسی دوسرے زخم یا نقصان کی آنکھوں کے مقابلے میں کیا اہمیت تھی۔ ابتدا میں جب تک یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی کہ آنکھوں کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے۔ شائلہ بڑی محبت اور توجہ سے اس کی تیمارداری کررہی تھی۔ اسپتال میں ڈیوٹی پر موجود نرس کے باوجود وہ خود اپنے ہاتھ سے شازل کو دوا پلاتی تھی۔ کھانا اور پھل کھلاتی تھی۔ بستر کی چادر اور تکیے کا غلاف بدلتی تھی۔ صبح سے رات گئے تک اس کے پاس اسپتال میں بیٹھی رہتی، مگر جیسے ہی پہلی پٹی کھلی اور ڈاکٹروں کو یقین ہوگیا کہ دونوں آنکھیں تقریباً ضائع ہوچکی ہیں، عدسے خرید کر صرف ڈھیلے رہ گئے ہیں اور پھر انہوں نے یہ انکشاف عزیز و اقارب پر بھی کردیا تو اس کے بعد شائلہ کی توجہ بہت تیزی سے کم ہوتی چلی گئی۔ آخر میں تو وہ دو تین دن کے بعد کھڑے کھڑے اور رسمی طور پر خیریت دریافت کرکے چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ شازل تقریباً بیس دن اسپتال میں رہ کر گھر آگیا۔ دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔

شہر کے ایک بہترین آئی اسپیشلسٹ کو گھر پر بلا کر دکھایا گیا۔ ڈاکٹر حامد صرف ایک سال پہلے کیے بعد دیگرے کئی بیرونی ممالک سے ماہر چشم ڈاکٹر و سرجن کی تعلیم و تربیت حاصل کرکے واپس آئے تھے اور سردست ایک پرائیویٹ اسپتال سے وابستہ تھے۔ ذاتی پریکٹس بھی کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی توجہ سے دیکھا۔ پھر دوسرے دن اسپتال بلا کر مختلف مشینوں سے معائنہ کیا۔

''کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب!'' شائلہ نے پوچھا۔ ''کیا یہ دوبارہ سے دیکھنے کے قابل ہوسکیں گے؟''

''ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔'' ڈاکٹر حامد نے جواب دیا۔ ''سردست یہ اسپتال میں ایڈمٹ ہوجائیں۔ آنکھ کے ڈھیلوں پر گوشت کی ایک باریک تہ آگئی ہے اسے آپریشن سے الگ کرکے یہ دیکھنا ہوگا کہ قرنیے اور عدسے وغیرہ کی کیا پوزیشن ہے، اگر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو تو شاید۔۔۔ خیال رہے کہ میں ''شاید'' کا لفظ استعمال کررہا ہوں، تو شاید کسی دوسرے کی آنکھوں کے قرنیے اور عدسے کی پیوند کاری سے شازل دیکھنے کے قابل ہوجائیں۔''

''آپ کے خیال میں اگر قرنیے اور عدسے درست ہوں تو کامیابی کا کتنے فیصد امکان ہے۔'' شازل نے سوال کیا۔ یہ گفتگو اس کے کمرے میں ہورہی تھی اور اس وقت کمرے میں شائلہ کے علاوہ

شازل کی امی اور خالہ یعنی شائلہ کی والدہ بھی موجود تھی۔

''اس سوال کا جواب میں ابتدائی آپریشن کے بعد دے سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر حامد نے کہا۔

''میں نے پوچھا تھا اگر قرینے اور عدسے درست ہوں تب۔۔۔'' شازل نے زور دے کر کہا۔

''یہ ایسی چیز نہیں جس کا محض اندازے سے جواب دیا جاسکے۔'' ڈاکٹر حامد نے ہمدردانہ لہجے میں سمجھایا

''قرینے اور عدسے اگر ٹھیک بھی ہوں یا ان کا عطیہ مل جائے تب بھی یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کی آنکھ انہیں قبول بھی کر سکے گی یا نہیں۔ خدا کی ذات سے صحت کی امید رکھیں اور درست علاج کریں۔ بینائی واپس آسکتی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے کہا پہلے میں آنکھوں کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ مل تو جائیں گی ڈاکٹر صاحب۔'' شازل کی امی نے پوچھا۔

''ضرور ملیں گی امی!''

شازل کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''جس شخص کے اتنے چاہنے والے ہوں، جنہیں اس طور سے اتنی محبت کرنے والی بیوی ہو، اسے آنکھوں کی کیا فکر۔ میں اور شائلہ ایک دوسرے کی آنکھیں بھی تو ہیں اگر کہیں سے کوئی عطیہ نہ بھی ملا تو شائلہ اپنی ایک آنکھ مجھے دے دے گی۔ ہم دونوں اس دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھ کر بھی جی لیں گے بلکہ محاورے کے اعتبار سے تو سب کو ایک آنکھ سے دیکھنا زیادہ اچھا ہے۔''

شائلہ اور اس کی ماں کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بس منہ پھیر کر دوسری طرف متوجہ ہوگئیں۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹے!'' شازل کی امی نے جلدی سے کہا۔ ''خدا شائلہ کی آنکھیں سلامت رکھے اور تمہیں بینائی دے۔ اللہ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے ہم ہر قیمت پر تمہاری آنکھوں کی روشنی حاصل کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

''آپ فکر مند نہ ہوں۔'' ڈاکٹر حامد نے تسلی دی۔

''آپریشن ہونے دیں۔ قرینے اور عدسے کا عطیہ خدا نے چاہا تو ضرور مل جائے گا۔''

مگر آپریشن کے بعد معلوم ہوا کہ تیزاب نے آنکھ کو اس بری طرح سے جلا دیا ہے کہ بینائی کی بحالی تقریباً ناممکن ہے۔ یہ بات ڈاکٹر حامد کو آپریشن کے دوران ہی معلوم ہوگئی تھی مگر انہوں نے شازل اور اس کے گھر والوں کو نہیں بتائی۔ وہ یہ ہی کہتے رہے کہ جب پٹی کھلے گی تب وہ آنکھوں کا معائنہ کر کے کوئی بات زیادہ وثوق سے بتا سکیں گے۔ شائلہ اس دن اسپتال سے فارغ ہوتے ہی اپنا ضروری سامان سمیٹ کر میکے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اسپتال تو آتی رہی مگر سسرال لوٹ کر نہیں آئی اور اس کی اسپتال میں آمد و رفت بھی شازل کے لیے نہیں، ڈاکٹر حامد کے لیے ہوتی تھی۔ ڈاکٹر حامد نے اپنی تیس سالہ زندگی کا بیشتر حصہ پہلے انگلینڈ اور اس کے بعد یورپ و امریکا میں گزارا تھا اور وہاں کی تہذیب اور طرز معاشرت کے گہرے اثرات قبول کیے تھے۔ ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی اور اس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ دوسرے ممالک میں اس کی فلرٹیشن کی داستانیں خاندان میں اتنی پھیل چکی تھیں کہ کوئی بھی اس کا رشتہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر حامد بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور اس کے والد اپنی جائیداد کا حصہ بلکہ بہت بڑا حصہ اسے تعلیم دلانے پر خرچ کر چکے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی جب کسی نہ کسی طرح تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آیا تو اپنا کلینک بھی نہیں کھول سکا اور اسے ایک پرائیویٹ اسپتال میں سروس کرنا پڑی۔ ان دنوں وہ کسی دولت مند گھرانے کی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جس کے ماں باپ، بیٹی کو جہیز دیں نہ دیں مگر داماد کو آنکھوں کا

ایک جدید اسپتال کھلوا دیں۔ اس نے شمائلہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایک دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔

☆☆☆

ایک سہ پہر جب کہ شمائلہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہو کر گھر سے باہر نکلی تو اس نے بنگلے کے گیٹ سے ایک پرانی سی کار کو اندر داخل ہوتے دیکھا وہ آگے بڑھی اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کار کو تسکین ڈرائیو کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا مگر جب کار اس کے قریب آ کر رک گئی اور تسکین اپنے چھوٹے بھائی کے بازو کا سہارا لے کر نیچے اترا تو اسے یقین کرنا پڑا کہ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ کوئی فریب نظر نہیں ہے۔ تسکین کی اپاہج ٹانگیں کم سے کم اس حد تک ضرور ٹھیک ہو چکی ہیں کہ وہ کار چلا سکتا ہے اور کسی کا سہارا لے کر کھڑا ہو سکتا ہے۔

''میرا خیال ہے تم نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا۔'' تسکین نے کہا۔ اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو۔'' شمائلہ چڑ گئی۔

''شاید کہیں جا رہی ہو۔'' تسکین نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی، اگر کچھ کہنا سننا ہے تو امی کے پاس جاؤ۔'' شمائلہ نے قدم بڑھایا۔

''ایک منٹ مسز شازل!'' تسکین نے اپنا مضبوط بازو پھیلا کر اس کا رستہ روک لیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میں تم سے ہی ملنے آیا ہوں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''مگر میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔'' شمائلہ تیزی سے بولی۔

''میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

''وہ تو میں ہٹ چکا ہوں یا یوں کہنا چاہیے کہ ہٹا دیا گیا ہوں لیکن مسز شازل! تم مجھ سے بات کرنا چاہو یا نہ چاہو، میں جو کہنے آیا ہوں کہہ کر ہی واپس جاؤں گا۔''

''تو میرا وقت خراب مت کرو، جلدی سے بولو کیا بکواس کرنا چاہتے ہو؟''

''تم نے مجھے اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ میں اپاہج ہو گیا تھا اور تمہاری ماں نے اس لیے کہ میرے پاس دولت نہیں رہی تھی، لیکن شاید تمہیں یاد ہو کہ شازل کے آنے سے پہلے میں تمہارا آئیڈیل تھا۔ یہ خود تمہارے الفاظ ہیں۔''

''شازل کے آنے سے پہلے نہیں، اپاہج ہونے سے پہلے۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''کوئی معذور اور دوسروں پر بوجھ آدمی میرا آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔''

''اس لیے تم نے شازل سے شادی کر لی۔''

''ہاں۔''

''لیکن قدرت کا انصاف دیکھو کہ وہ اندھا ہو چکا ہے اور جسے تم۔۔۔ عضو معطل سمجھ کر ٹھکرا چکی تھی پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہوں، اتنا ہی نہیں تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں مجھے اس عمارت کے انہدام سے بری الذمہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ٹھیکے دار اور میرے منیجر کی سازش تھی کہ مسالے میں سیمنٹ کا تناسب کم کر کے بجری زیادہ شامل کر دی جائے۔ مزید یہ کہ کاروبار کی بگڑتی ہوئی صورت حال بھی رفتہ رفتہ بہتری جا رہی ہے۔

''تو شازل کے منہ پر تیزاب تم نے ڈلوایا تھا۔''

''نہیں۔۔۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ میں اس وقت تک تمہاری خود غرض فطرت سے واقف ہو چکا تھا۔''

''پھر مجھے یہ سب سنانے کے لیے کیوں آئے ہو؟'' شمائلہ نے تیزی سے کہا۔

''میں پچھتانے والوں میں سے نہیں ہوں، شازل اگر اندھا ہو چکا ہے تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں ہے۔ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے یہ کہنے آیا تھا کہ اس مرتبہ فیصلہ کرنے میں اتنی خودغرضی اور جلد بازی سے کام مت لینا، کم سے کم یہ ضرور سوچنا کہ حادثات کسی کی دوستی یا دشمنی کو پیدا نہیں کرتے، کوئی حادثہ تمہیں بھی پیش آسکتا ہے۔''

''مجھے دھمکا رہے ہو؟''

''نہیں، سمجھا رہا ہوں۔''

''میں اپنا فائدہ نقصان خود سمجھ سکتی ہوں۔ تمہیں میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ ہی جواب دوگی، پھر بھی چلا آیا۔'' تسکین نے گہری سانس لی۔ ''صرف یہ سوچ کر کہ شاید تمہارے دل میں کوئی نرم گوشہ باقی ہو، مگر یہ میری خوش فہمی تھی تمہاری فطرت کتنی مسخ ہوچکی ہے اور تم کتنا گر چکی ہو، تمہیں اس کا بھی احساس نہیں ہے، جاؤ چھوڑ دو شازل کو اور بڑھتی جاؤ تباہی کی طرف۔۔۔ جو خود اپنی عافیت کا دشمن ہو اس کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا، اللہ حافظ!''

وہ واپس کار میں بیٹھا اور کار کو بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ شائلہ نے نفرت اور حقارت سے اپنی تنی ہوئی گردن کو ایک جھٹکا دیا اور پھر تیزی سے کیرج کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

حامد کے تعلقات شائلہ سے کیسے ہی ہوں مگر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ دوٹوک الفاظ میں شازل اور اس کی غم زدہ ماں کو مایوس کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔

''آپ کی آنکھوں کی موجود کیفیت کسی آپریشن کی متحمل نہیں ہوسکتی۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کو کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہوں انہیں پابندی سے استعمال کریں۔ مخصوص ڈائٹ تجویز کردوں گا اس کی پابندی کریں ایک نرس آپ کے ساتھ کردوں گا جو ہمہ وقت آپ کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ ایک اچھی کمپنین بھی ثابت ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اس پروگرام پر عمل کیا تو بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ تب پھر میں شاید کسی دن آپ کی آنکھوں کا آپریشن کرسکوں۔'' اور یوں شازل گھر آگیا۔ اسپتال سے جس نرس کو اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا اس کا نام یاسمین تھا اور وہ ایک ہمدرد، مخلص اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں مستعد لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور سمجھ دار بھی معلوم ہوتی تھی۔ شازل جب بہت زیادہ بوریت محسوس کرتا تو اس سے باتیں کرنے لگتا۔ یاسمین بڑی لگن اور توجہ سے اس کی دیکھ بھال اور تیمار داری کررہی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے شازل اور شائلہ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ شازل کی امی بھی اس کی خدمت سے بہت مطمئن تھیں اس لیے جب کبھی انہیں اپنے بیٹے کا خیال اور شائلہ کا طرزِ عمل بہت زیادہ افسردہ کرتا تھا تو وہ یاسمین کے سامنے اپنا دکھ بیان کرکے دل ہلکا کرلیا کرتی تھیں۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے ایک صبح شائلہ آندھی، طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی اور سیدھی شازل کے کمرے میں پہنچی۔

''میں اب اس نام نہاد رشتے سے زیادہ دن بندھی نہیں رہ سکتی۔'' اس نے کہا۔

''ہر چند تم اس آزمائش اور ضرورت کے وقت دامن چھڑا کر اپنے گھر چلی گئی ہو۔'' شازل نے تحمل سے کہا۔ ''پھر بھی تمہیں اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خداوند کریم کو اپنا فضل کرتے دیر نہیں لگتی، میں نے سنا ہے تسکین تقریباً ٹھیک ہوچکا ہے جب ایک اپاہج انسان ٹھیک ہوسکتا ہے تو ایک اندھے کو بھی اس کی بینائی واپس مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر حامد نے بہت امید دلائی ہے۔ خود مجھے بھی اپنی آنکھوں کی حالت بہت بہتر محسوس ہوتی ہے اب نہ وہ پہلے سی کھٹک ہے اور نہ ہی جلن، تھوڑا تھوڑا روشنی کا احساس بھی ہونے لگا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو ماہ میں میری آنکھیں آپریشن کے قابل ہوجائیں گی۔ ڈاکٹر حامد نے کہا تھا۔''

''ڈاکٹر حامد نے بالکل جھوٹ کہا تھا۔'' شائلہ چیخ کر بولی۔

''میں خود ان سے بات کر چکی ہوں۔ وہ ہی نہیں، آنکھوں کے جن دوسرے ڈاکٹروں نے تمہاری رپورٹیں دیکھی ہیں ان سب کی متفقہ رائے ہے کہ اب تم کبھی نہیں دیکھ سکتے، تم ہمیشہ کے لیے اندھے ہو چکے ہو۔''

''پلیز مسز شازل۔۔۔!'' یاسمین نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''اتنی بے رحمی سے کام نہ لیں۔ بالفرض شازل صاحب کو بینائی واپس نہ مل سکے تب بھی یہ کوئی اتنی بڑی کمی نہیں ہے۔ آپ کی ذرا سی توجہ اور کوشش سے یہ ایک نارمل انسان کی طرح نارمل انداز میں اپنے معمولات انجام دیتے ہوئے بڑی خوش گوار زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' شائلہ دانت پیس کر بولی۔

''مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے، اپنی حیثیت پہنچانو، تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کی جرات کیسے ہوئی۔''

''آئی ایم سوری مسز شازل! مجھے بولنے کا کوئی حق نہیں تھا۔'' یاسمین نے آہستگی سے کہا۔

''سن لیا تم نے۔'' شائلہ پھر شازل کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اب تم کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے اور میں ایک اندھے آدمی سے وابستہ رہ کر اپنی خوشیاں برباد نہیں کر سکتی۔''

''پھر تم کیا چاہتی ہو۔''

شازل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''طلاق۔۔۔ تم مجھے طلاق دے دو۔ میں تم سے کسی مہر یا جہیز کی واپسی کا مطالبہ نہیں کروں گی۔''

''کیا کوئی نیا شکار مل گیا ہے؟''

''شٹ اپ۔ تمیز سے بات کرو۔ تمہیں مجھ پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' شائلہ نے تیزی سے کہا۔

''اور تمہیں خاندان کی عزت اچھالنے کا حق ہے؟''

''مجھ سے بحث مت کرو۔ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم میری بات کا جواب دو۔ طلاق دیتے ہو یا نہیں؟''

''اگر میں انکار کر دوں۔۔۔؟''

''تب مجھے مجبوراً عدالت تک جانا پڑے گا۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم عدالت جاؤ۔''

شازل نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آئندہ تم سے وہیں ملاقات ہوگی اور اب دفع ہو جاؤ۔ یاسمین! مس شائلہ کو باہر جانے کا رستہ دکھا دو۔''

''تم سے سمجھ لوں گی۔'' شائلہ نے پیر پٹخے۔

''تم تو مجھ سے کیا سمجھو گی اس سے پہلے میں تمہارے تمام کس بل نکال دوں گا یہ دھمکی نہیں ہے۔ وارننگ ہے۔'' شائلہ تیزی سے گھومتی اور کمرے سے باہر نکل گئی اس کی اونچی ایڑھی کی سینڈل کی آوازیں راہداری میں گونجتی ہوئی معدوم ہوتی چلی گئیں۔

''میں کچھ کہوں تو آپ برا تو نہیں مانے گے شازل صاحب!'' یاسمین نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' شازل نے نرمی سے جواب دیا۔

''مجھے لوگوں کی باتیں سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔ تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو ضرور کہو۔''

''میرا خیال ہے کہ زندگی میں آپ کی بینائی دوسری بار گئی ہے۔'' یاسمین نے کہا۔ ''جب آپ نے شائلہ سے شادی کی تھی تب بھی آپ دیکھ نہیں رہے تھے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے جب آپ اسپتال میں تھے تو شائلہ وہاں روز آتی تھی۔''

''اچھا۔۔۔ مگر میں نے کمرے میں کبھی اس کی موجودگی محسوس نہیں کی تھی۔''

''اس لیے کہ وہ آپ سے ملنے نہیں آتی تھی۔''

''تو پھر۔۔۔؟''

''وہ ڈاکٹر حامد کے پاس آتی تھی اور گھنٹوں ان کے آفس میں بیٹھی رہتی تھی۔'' یاسمین نے کہا۔

''وہ دونوں شام کو اکٹھے جاتے تھے پھر شاید ڈاکٹر حامد نے اسے منع کردیا اور وہ اسپتال کے بجائے ڈاکٹر حامد کے گھر جانے لگی۔''

''ہوں۔۔۔! تو یہ بات ہے۔'' شازل کچھ سوچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ''یہ ڈاکٹر حامد کیسے انسان ہیں یاسمین!''

''اس دور میں کوئی کیا کسی کی حیثیت متعین کرے شازل صاحب! جو بھی تنقید کرنے لگتا ہے خود اپنے گریبان میں جھانکنا بھول جاتا ہے۔ میں بھی خامیوں سے پاک نہیں ہوں لیکن پھر بھی منافقت اور پشت میں خنجر اتارنے کو جائز نہیں سمجھتی کہ یہ گراوٹ کی انتہا ہے۔ ڈاکٹر حامد کسی معیار اخلاق کو دل سے تسلیم نہیں کرتے ہر موقعے سے فائدہ اٹھانا اور ہر بہتے دریا میں ہاتھ دھونا ان کی زندگی کا معمول رہا ہے۔ اپنی کم ترانیوں کے دوران انہوں نے مجھے اپنی اب تک کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ ڈاکٹری اور سرجری کی جتنی ڈگریاں ان کے پاس ہے ان میں سے ایک چوتھائی انہوں نے اپنی محنت سے حاصل کی ہیں اور وہ پھر بھی سب سے نچلے درجے میں، باقی کی تمام اسناد جعلی اور نقلی ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے انگلینڈ، یورپ اور امریکا کے بہت سے اسپتالوں میں کام کیا ہے مگر ہر جگہ سے نکالے گئے ہیں ان کے والد کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ واپس آکر اپنا ایک اچھا اسپتال قائم کرسکتے تھے لیکن ڈاکٹر حامد نے اس دولت کا زیادہ حصہ اپنی رنگین مزاجی پر خرچ کردیا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ ایک اسپتال کا مالک بننے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہوسکتے ہیں۔''

''ان کی رہائش کہاں ہے؟''

''ڈیفنس سوسائٹی میں، جہاں ان کے والد کا بنگلہ ہے۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''لیکن یورپ اور امریکا میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کی وجہ سے ان کے مزاج، عادات و معمولات پر وہی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔''

''تمہیں ان کی مصروفیات کا کچھ علم ہے۔ میرا مطلب ہے معمول کی مصروفیت اسپتال سے باہر۔۔۔''

''وہ دو گھنٹے صبح اور تین گھنٹے شام اسپتال میں گزارنے کے علاوہ بیشتر وقت گھر سے باہر رہتے ہیں۔''

''بہت خوب۔'' شازل مسکرانے لگے۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

''تمہیں ان کی کوئی پسندیدہ پرفیوم کا پتا ہے؟''

''وہ عموماً چارلی یا ایونگ اِن پیرس لگاتے ہیں۔''

''اور سر میں تیل کون سا استعمال کرتے ہیں۔''

''وہ تیل نہیں ڈالتے۔'' یاسمین نے بتایا۔ ''ہیئر کریم لگاتے ہیں مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''تمہیں ڈاکٹر حامد کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔'' شازل نے اس کا سوال نظر انداز کردیا۔

''معلوم ہوتا ہے، بہت قریب رہ چکی ہو۔''

''بہت سے انسان دانستہ فریب کھانا پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لڑکیاں جنہیں کوئی درست مشورہ دینے والا کوئی نہ ہو۔ میں نے زندگی کے ہاتھوں جتنے بھی دھوکے کھائے ہیں ان میں سے ایک ڈاکٹر حامد بھی ہے۔''

''تم بڑی عجیب لڑکی ہو یاسمین!'' شازل نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں تم سے ایک درخواست کرسکتا ہوں۔''

''درخواست کیا آپ مجھے حکم دے سکتے ہیں۔''

''نہیں میری بات کا تمہارے پیشہ ورانہ فرائض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''جی فرمائیے۔''

''تم مجھے ایک بار اپنے ساتھ ڈاکٹر حامد کے فارم ہاؤس پر لے چلو۔''

''کیوں؟''

''بس یوں ہی میں ذرا اس جگہ اور اس فضا کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔'' شازل نے جواب دیا۔ مجھے فارم ہاؤس کے اندر جانے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے اور نا ہی میں ڈاکٹر حامد۔۔۔ یا کسی اور کی موجودگی میں جانا چاہتا ہوں۔ بولو لے چلوگی نا؟''

''آپ کہتے ہیں تو میں آپ کو ضرور لے چلوں گی۔'' یاسمین کچھ الجھ کر بولی۔ ''لیکن آپ کی اس خواہش کی کچھ وجہ سمجھ نہیں آئی۔''

''تم نے خود بھی کچھ کام ایسے ضرور کیے ہوں گے جن کی وجہ دوسروں کو نہیں سمجھا سکی ہوگی۔''

''آپ نے سچ کہا۔'' یاسمین نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں آپ کو ضرور وہاں لے چلوں گی۔''

☆☆☆

اور اسی دوپہر یاسمین اور شازل اپنی کار میں نہیں ایک ٹیکسی میں فارم ہاؤس گئے۔ شازل تمام راستے یاسمین سے پوچھتا رہا کہ اب وہ کہاں ہے اور پھر فارم ہاؤس کے قریب ٹیکسی رکوا کر یاسمین نے کہا۔

''یہ سامنے ڈاکٹر حامد کا فارم ہاؤس ہے۔''

''مجھے اس کے قریب لے چلو بالکل قریب۔''

پاس جا کر اس نے فارم ہاؤس کی دیوار کو چھو کر دیکھا اس کے دروازے پر ہاتھ پھیرا، جیسے انگلیوں کے لمس سے موصول ہونے والی معلومات کو ذہن نشین کر رہا ہو، تین چار منٹ کے بعد وہ پیچھے ہٹ گیا۔ یاسمین اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد شازل نے فارم ہاؤس کے اردگرد تین چار چکر لگائے جیسے اندازے سے اس کا حدود اربع جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر چند منٹوں بعد اس نے واپسی کا حکم دے دیا۔

''بس اب واپس چلو۔'' اچانک شازل نے کہا۔

''آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ یہاں کیوں آئے تھے؟''

یاسمین نے دوبارہ اس کا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ڈاکٹر حامد مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہا، میرا مطلب ہے جھوٹی تسلیاں دے کر۔'' شازل نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔ ''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' یاسمین نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔''

''جبکہ دوسری جانب میری پشت میں خنجر اتارنے میں لگا ہوا ہے۔'' شازل کی آواز میں بلا کی تلخی تھی۔

''میں اس کی صفائی پیش نہیں کروں گی۔'' یاسمین نے کہا تو شازل بولا۔ ''اچھا تم پندرہ دنوں کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو، لیکن اسپتال معمول کے مطابق جاتی رہو۔''

''مگر آپ یہ سب کیوں چاہتے ہیں؟''

''میں ان پندرہ دنوں میں سکون سے اپنے، شائلہ کے اور تمہارے بارے میں سوچ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں کیوں؟''

''اس اندھیری زندگی میں مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ وہ شائلہ تو نہیں بن سکی، مگر تم بن سکتی ہو۔''

''میں۔۔۔؟'' یاسمین چونک گئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہاں آپ، کہاں میں اور پھر میرے حالات کا کچھ نا کچھ اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہے۔''

''ہم دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ٹھوکر کھائی ہے اور ایک ہی شخص کے ستم رسیدہ ہیں۔ خیر ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے اور یقین کرو کہ میں اپنی حیثیت سے غلط فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی تم پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔''

''مسلط کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا شازل صاحب! اگر آپ نے خلوص سے سوچا ہے تو یہ مجھ پر آپ کا احسان ہوگا۔''

''نہیں یاسمین۔۔۔!'' شازل کے لہجے میں ایک افسردہ سنجیدگی تھی۔ ''میں نہیں جانتا کہ میں پندرہ دن کے بعد کس مقام پر کھڑا ہوں گا لیکن اگر کوئی ایسا فیصلہ ہوا تو وہ احسان نہیں ہوگا نہ میرا اور نہ تمہارا، ہم اس سفر کا آغاز صرف اور صرف خلوص کی بنیاد پر کریں گے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

☆☆☆

مغرب کے بعد جب یاسمین گئی تو شازل نے اپنے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ ''ابھی بازار جاؤ اور جہاں سے ہو سکے انسانی چہرے کی پانچ ڈمی خرید لاؤ۔'' اس نے ضروری رقم دیتے ہوئے کہا۔ ''تین مردانہ چہرے اور دو زنانہ چہرے، تم نے ٹیلر وغیرہ کی دکانوں پر ایسے نصف مجسمے دیکھے ہوں گے جن میں صرف سر اور کندھے ہوتے ہیں۔''

''وہ تو میں نے دیکھے ہیں۔'' بھائی نے جواب دیا۔ ''مگر کہاں فروخت ہوتے ہیں مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''جس دکان پر ایسے نصف مجسمے رکھے ہوں وہاں پوچھنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔'' شازل بولا۔ ''اور ہاں اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہیں یہ مجسمے میرے کمرے میں لاتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔''

''بہت اچھا بھائی جان!'' چھوٹے بھائی نے سعادت مندی سے کہا۔ رات کے دس بجے شازل کے مطلوبہ مجسمے اس کو مل گئے تھے۔

☆☆☆

یاسمین شازل کے رویے سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ آخر کار ایک فیصلہ کرتے ہوئے وہ اپنے بھائی جو کہ اب اس دنیا میں نہیں تھے، ان کے دوست جو اب پولیس ہیڈ کوارٹر میں متعین تھے، سے ملاقات کی۔ ساری تفصیل شازل سے متعلق بتانے کے بعد وہ بولی۔ ''ہاشم بھائی مجھے شائلہ یا ڈاکٹر حامد سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ شازل قانون ہاتھ میں نہ لے۔''

''اتفاق سے شازل میرا بھی دوست ہے۔ انسپکٹر ہاشم نے کہا۔ ''لیکن تم نے جو کچھ بتایا ہے، غیر واضح ہے، میں وقت نکال کر شازل سے ملاقات کروں گا۔''

''دھیان سے ہاشم بھائی! اس میں میرا تذکرہ نہ ہو۔''

''بے فکر رہو بہن۔۔۔!'' ہاشم نے تسلی دی۔

☆☆☆

پھر ایک دن شازل سے ملنے کے لیے انسپکٹر ہاشم نے وقت نکالا اور اس کی کوٹھی پہنچ گیا۔ حال احوال معلوم کرنے کے بعد ہاشم نے اس سے ڈاکٹر حامد اور شائلہ کی تفصیل سنی اور پھر زیادہ کریدے بغیر واپس آ گیا۔ اسی شام وہ ڈاکٹر حامد کے فارم ہاؤس گیا۔ اس کے بعد روز شازل دو مرتبہ صبح شام فارم ہاؤس پر جاتا اور ایک ہفتے کے اندر ہی اس نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ٹیکسی سے اترنے کے بعد اسے چھڑی سے راستہ ڈھونڈنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ وہ بڑے آرام و اطمینان سے قدم اٹھاتے ہوئے فارم ہاؤس تک پہنچ جاتا اگر کوئی اسے دور سے دیکھتا تو ہرگز یقین نہیں کر سکتا تھا کہ آنکھوں سے محروم انسان اس طرح بھی کر سکتا ہے۔

☆☆☆

پھر ایک دن اس نے سہ پہر پانچ بجے اسپتال میں ڈاکٹر حامد کو فون کیا اس نے کبھی دوسروں کی نقل اتارنے کی کوشش نہیں کی تھی، مگر اسے اتنا ضرور یاد تھا کہ ایک مرتبہ کئی برس پہلے پولی ٹیکنک کے دوران اس نے ایک شرط جیتنے کے لیے ایک نیوز کاسٹر شکیل احمد کی آواز کی بڑی کامیاب نقل اتاری تھی۔ اب بھی اس نے اپنی یادداشت میں شائلہ کی آواز ابھاری اور بالکل اسی جیسے لب و لہجے میں بات کرنی چاہی۔

''ہیلو ڈیئر کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے رابطہ ملنے پر کہا۔

''شائلہ۔'' حامد کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ ''میں کل سے تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں کہو اپنے

[illegible] وہ آمادہ ہو گئے ہیں۔'' یہ اشارہ شادی کی طرف بھی ہو سکتا تھا مگر شمائلہ کو جتنی آزادی حاصل تھی اس میں شادی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جب تک مقدمے کا فیصلہ شمائلہ کے حق میں نہ ہو جائے اور اس کے بعد بھی وہ جب تک مقررہ مدت پوری نہ کر لے وہ حامد سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے شازل کے ذہن میں فوراً ایک ہی بات ابھری۔ حامد نے ضرور کوئی رقم مانگنے کی کوشش کی ہوگی جس کے لیے وہ شمائلہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے احتیاط سے کام لیا۔

''ہاں بات کی تھی۔'' اس نے شمائلہ کی آواز میں جواب دیا۔

''پورے پچاس لاکھ کے لیے۔'' حامد کی بے تابی نے خود ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔

''ابھی رقم طے نہیں ہوئی اس کے لیے ان کی ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں فون پر نہیں بتا سکتی۔''

''تو کہیں ملاقات کر لو۔''

''کہاں۔۔۔؟''

''جہاں تمہارا دل چاہے۔'' حامد نے کہا۔ ''تم نے خود ہی مقدمہ کے دوران پابندی لگا رکھی ہے۔''

''احتیاط کا تقاضا یہ ہی ہے، ہمیں اس اندھے کو یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ ہمارے تعلقات سے مقدمے کے سلسلے میں کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ اب بھی میں کسی عام جگہ ملنا نہیں چاہوں گی۔'' شازل نے کہا۔

''تو پھر فارم ہاؤس کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' حامد نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم خود ہی وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے سات بجے وہاں پہنچ جانا، میں زیادہ نہیں ٹھہر سکوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک دم ریسیور رکھ دیا۔ زیادہ باتیں کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ حامد نے اپنی بے تابی اور پھر جوش میں یقیناً اس کی آواز پر غور نہیں کیا ورنہ اس کی نقل بہت ہی بھونڈی تھی۔ چند منٹ اپنے تصور میں ڈاکٹر حامد کی آواز کو تازہ کر کے شازل نے شمائلہ کو فون کیا۔

''ہیلو کون ہے؟'' شمائلہ کی آواز ابھری۔

''میں بول رہا ہوں ڈارلنگ!''

''حامد۔۔۔!'' شمائلہ کے لہجے میں کچھ حیرت تھی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ انتہائی ضرورت کے بغیر گھر میں فون مت کرنا۔''

''میں نے ضرورت سے مجبور ہو کر ہی فون کیا ہے۔ شازل کے وکیل نے میرے وکیل کو مقدمے کے سلسلے میں ایک پیش کش کی ہے۔''

مقدمہ بے شک شمائلہ کا تھا مگر اس کی پیروی حامد کا ایک دوست وکیل کر رہا تھا۔

''وہ کیا۔۔۔؟'' شمائلہ نے دل چسپی سے پوچھا۔

''نہیں، میں فون پر نہیں بتا سکتا، تمہیں پتا ہے۔ میں اسپتال سے بات کر رہا ہوں۔'' شازل نے کہا۔

''تم مجھے کہیں اور نہیں مل سکتی۔''

''جب تک مقدمہ چل رہا ہے ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔''

''وہ میں جانتا ہوں۔'' شازل نے بات کاٹی۔ ''اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ تم کچھ دیر کے لیے فارم ہاؤس پر آ جاؤ۔''

''فارم ہاؤس پر۔۔۔؟''

''ہاں صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔''

''اچھا ٹھیک ہے کس وقت آؤں؟''

''ساڑھے سات بجے۔''

''اوکے، میں پہنچ جاؤں گی۔''

''وقت کی پابندی کے معاملے میں تم ذرا۔۔۔''

''فکر مت کرو، آج دیر نہیں ہوگی مجھے ساڑھے آٹھ بجے لازماً گھر آ جانا ہے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔''

''گڈ۔۔۔ تو میں ساڑھے سات بجے انتظار

لڑوں گا۔''

شازل نے جواب دیا۔ ''بس ایک بات کا خیال رکھنا۔''

''وہ کیا۔۔۔؟''

''میں نے ایک نجومی سے فال نکلوائی تھی اس نے بتایا ہے۔۔۔سوری کوئی آ رہا ہے۔ نجومی کی بات ملاقات پر بتاؤں گا۔ تم ہیر کریم لگا کر ضرور آنا۔ بہت اہم بات کرنی ہے۔''

شازل کو پتا تھا کہ شائلہ کو نجوم، پامسٹری اور ایسے ہی علوم پر اندھا اعتقاد تھا اس لیے اس نے نجومی کا شوشا چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اس نے روانگی سے قبل ایک مرتبہ پھر اپنے منصوبے کو پرکھا۔ آواز پر نشانہ لگانے میں غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ یوں بھی سیدھے سادے طریقے سے حامد اور شائلہ کو بولنے پر مجبور کر کے اپنا کام کر سکتا تھا، لیکن وہ بولنے کے بعد فوراً ہی حرکت کر کے کسی بھی طرف ہو سکتے تھے۔ اس کا کوئی تدارک شازل کے ہاتھ میں نہ تھا پھر یہ کہ وہ دونوں اسے اپنا دشمن جانتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی کوئی ہتھیار بھی نکال سکتے تھے، لیکن فارم ہاؤس پر پہنچنے کے بعد اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ کوئی غلطی نہیں کرے گا ان دنوں سورج سات بجنے میں چند منٹ پہلے غروب ہو رہا تھا۔ شازل نے اپنی دانست میں تمام تیاریاں مکمل کر لیں تھیں لیکن اسے ان نادیدہ عوامل و عناصر کا علم نہیں تھا جو ہر وقت مصروف کار رہتے ہیں اور کبھی انسانی کوشش کے حق میں اور کبھی اس کے خلاف ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ شازل ٹھیک چھ بجے بنگلے سے نکلا۔ ٹیکسی وہ پہلے ہی منگوا لیا کرتا تھا۔ وہ گیٹ سے گزر کر ٹیکسی میں بیٹھا اب یہ اتفاق ہی تھا کہ ٹھیک اسی لمحے انسپکٹر ہاشم اپنے کسی کام کے سلسلے میں اس طرف سے گزر رہا تھا نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے اپنی کار شازل کے بنگلے کی طرف موڑ دی۔ ادھر اس کی کار بنگلے کے قریب آئی اُدھر شازل ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ ہاشم نے اسے جاتے دیکھا۔ یوں ہی عادتاً ٹیکسی کے نمبر پر نگاہ پڑی اور ذہن میں نوٹ کر لیا اسے تعجب ہوا کہ اس وقت شازل اکیلا اور وہ بھی ٹیکسی میں کیوں اور کہاں جا رہا ہے وہ کار سے اترا اور کال بیل کا بٹن دبایا اور جب شازل کا چھوٹا بھائی باہر نکلا تو اس سے شازل کے بارے میں پوچھا۔ بھائی نے بتا دیا کہ وہ سیر کے لیے گئے ہیں۔ روز جاتے ہیں مگر آج کچھ دیر سے جا رہے ہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ انسپکٹر شکریہ ادا کر کے کار میں آ بیٹھا، مگر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ شازل کو روزانہ بالکل اکیلے جانے کی کیا ضرورت پیش آ رہی ہے۔ یہ کہا جائے کہ وہ سیر و تفریح کو جاتا تھا تو پھر بھی اکیلا جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بینائی سے محروم ہے، اسے تو قدم قدم پر ایک راستہ دکھانے والا ساتھی چاہیے۔ ضرور کوئی اور بات ہے، اور اس اور بات نے ہاشم کے ذہن کو اتنا پریشان کیا کہ وہ سیدھا یاسمین کے پاس پہنچ گیا اسے پوری بات بتائی وہ بھی گھبرا سی گئی۔

''وہ یقیناً فارم ہاؤس جا رہے ہیں۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''جب وہ میرے ساتھ گئے تھے تب بھی بھائی کو یہ ہی کہہ کر انہوں نے ٹیکسی منگوائی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے ہاشم علی بھائی کہ وہ روزانہ ڈاکٹر حامد کی تلاش میں اس کے فارم ہاؤس پر جاتے ہیں اور کیوں جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

''تم فوراً ڈاکٹر حامد کے اسپتال یا وہ وہاں نہ ہو تو ان کے گھر فون کرو۔'' ہاشم نے تیزی سے کہا۔

حامد اسپتال میں نہیں تھا۔ گھر سے معلوم ہوا کہ وہ فارم ہاؤس پر گئے ہیں۔ اس سوال پر کہ وہ آج ہی گئے ہیں یا روزانہ جاتے ہیں تو پتا چلا وہ پچھلے دو ہفتے سے نہیں گئے تھے جبکہ اس سے پہلے اسپتال کے بعد ان کا بیشتر وقت وہیں گزرتا تھا۔ ہاشم اور یاسمین دونوں کے لیے یہ اطلاع خطرے کی گھنٹی تھی۔ ہاشم

نے خود بھی فارم ہاؤس جانے کا فیصلہ کیا۔ یاسمین بھی تیار ہوگئی۔ حامد کے فارم ہاؤس کی نشان دہی کے لیے اس کا ساتھ چلنا ضروری تھا۔ وہ دونوں ہاشم کی کار میں روانہ ہوئے تو اس وقت سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

☆☆☆

حامد اپنے فارم ہاؤس میں انتظار کر رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی وہ سمجھا کہ شائلہ آ گئی مگر دروازہ کھولا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ البتہ ایک شخص پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر اس کی جانب سے پشت کیے کھڑا تھا۔ حامد آگے بڑھا دفعتاً وہ شخص گھوما اور حامد شازل کو پہچان کر ٹھیک سے حیرت زدہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک ہلکی سی آواز اسے سنائی دی جیسے کوئی کھٹکا ہوا ہو۔ گولی حامد کی کنپٹی پر لگی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی ریت پر گر گیا۔ شازل بھاگتا ہوا آیا۔ حامد دروازے سے چند قدم آگے پڑا تھا۔ شازل نے اس سے ٹھوکر کھائی، سنبھلا اسے چھو کر دیکھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ شازل نے اسے گھسیٹ کر فارم ہاؤس کے اندر ڈال دیا۔ دروازہ بند کیا باہر سے کنڈی لگا دی اور دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار اس کی توقع سے کہیں کم ثابت ہوا۔ شائلہ جو عموماً وقت کی اتنی پابند نہیں تھی غالباً اپنے مہمانوں کے خیال سے وقت سے پہلے آ گئی تاکہ جلدی سے گھر واپس جا سکے۔ شازل نے اس کی کار کے آنے، رکنے اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اگر وہ ہوا کے رخ پر کھڑا نہ ہوتا تو شاید سمندر کی لہروں کے شور میں یہ آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شائلہ فارم ہاؤس کے دروازے پر آئی اسے باہر سے بند دیکھا تو حامد کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر کوئی شخص نظر آیا وہ اسے حامد سمجھی اور آواز دیتے ہوئے اس کی طرف بڑھی وہ شخص ایک دم سے گھوما۔ شائلہ نے ایک نظر میں اسے پہچان لیا۔ اس کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی یہ گویا شازل کے بے خطا نشانے کی مزید حوصلہ افزائی تھی۔ شائلہ کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ رہا ہے۔ سر میں درد کی تیز لہر کے ساتھ وہ گری اور ساکت ہوگئی۔ شازل نے اسے بھی گھسیٹ گھسیٹ کر فارم ہاؤس کے اندر لٹا دیا اور باہر آ کر ایک بار پھر فارم ہاؤس کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

☆☆☆

ہاشم نے کچھ فاصلے سے ہی اس ٹیکسی کو نمبروں سے پہچان لیا جس میں اس نے شازل کو بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔ وہ قریب آیا جتنا کرایہ بنتا تھا۔ اس سے دگنی رقم دے کر ٹیکسی کو واپس کر دیا۔ ڈرائیور کو اس نے یہ ہی بتایا کہ تم جس شخص کو لائے ہو ہم ان کے عزیز ہیں اور اب جبکہ ان کی کار موجود ہے تو ٹیکسی کی ضرورت نہیں مگر اس نے ٹیکسی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا، اور ڈرائیور کا نام بھی، ٹیکسی کو چھٹی دے کر وہ اور یاسمین جلدی سے فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ قریب پہنچے تو یاسمین نے شازل کو دور سے دیکھ لیا۔ وہ اسے آواز دینا چاہتی تھی مگر ہاشم نے اسے روک دیا شازل ان کی موجودگی سے لاعلم اپنے جانے پہچانے راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہاشم اور یاسمین تیزی سے ہٹ تک پہنچے۔ دروازہ کھولا اندر روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں دروازے سے تقریباً تین چار فٹ کے فاصلے پر انہیں حامد اور شائلہ کی لاشیں نظر آ گئیں۔

''اف میرے خدا۔۔۔! یہ کیا ہوگیا۔'' یاسمین کی زبان سے ایک دم نکلا۔ ہاشم نے جھک کے دونوں کو دیکھا اور افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ''ہمیں تھوڑی دیر ہوگئی ہے۔'' وہ بھاری لہجے میں بولا۔ ''مگر میں بڑا حیران ہوں کہ شازل یہ سب کچھ کیسے کر سکا۔'' فارم ہاؤس کا دروازہ ایک بار پھر باہر سے بند کر کے وہ کار میں آ بیٹھے اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ راستے میں انہیں شازل ملا مگر ہاشم اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔

''آپ نے کار کیوں نہیں روکی؟'' یاسمین نے

پوچھا۔ ''میرے ذہن میں اسے روکنے کے لیے ایک دوسری مناسب جگہ ہے۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

''اب کیا ہوگا ہاشم بھائی۔۔۔!'' یاسمین بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کا منصوبہ کس حد تک مکمل تھا۔'' ہاشم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بارے میں کوئی بات کہنا نہیں چاہتا کہ حامد اور شمائلہ اس انجام کے سزاوار تھے یا نہیں لیکن ایک پولیس افسر ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں شازل کو گرفتار کرلوں پھر قانون اس کے ساتھ جو بھی انصاف کرے۔''

''آپ کے خیال میں عدالت انہیں سزا دے گی۔'' یاسمین نے پوچھا۔

''اور دے گی تو کیا اور کتنی؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی میں نے شازل سے بات بھی نہیں کی مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خلاف تمام شہادتیں واقعاتی ہیں، کوئی گواہ نہیں، جس نے اسے یہ جرم کرتے دیکھا ہو ہم بھی صرف اتنا ہی بیان دے سکتے ہیں کہ وہ اس وقت فارم ہاؤس سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عدالت کو یہ باور کرانے میں بڑی مشکل پیش آئے گی کہ کوئی اندھا انسان تن تنہا بیک وقت دو افراد کو قتل کرسکتا ہے اور وہ دو ہونے کے باوجود اپنی مدافعت میں کچھ نہ کرسکے اور چپ چاپ قتل ہوگئے۔''

''میرے نزدیک شازل صاحب نے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر چاہے کتنی سنگین غلطی کی ہو۔'' یاسمین بولی۔ ''مگر انہوں نے ایسے افراد سے اپنا انتقام لیا ہے جو ہر طرح اور ہر اعتبار سے اس سزا کے قابل تھے۔''

''پھر بھی مجھے اپنا فرض پورا کرنا ہے۔'' ہاشم نے گہری افسردگی سے کہا۔ وہ تقریباً پانچ منٹ پہلے اس جگہ پہنچ گئے جہاں شازل نے ٹیکسی کو چھوڑا تھا۔ ہاشم نے ٹیکسی کی پوزیشن کو نگاہ میں رکھا تھا۔ اس لیے واپسی پر اس نے اپنی کار ٹھیک اس انداز میں اور اس رخ کے ساتھ اسی مقام پر کھڑی کردی اور وہ اور یاسمین چند قدم ہٹ کر شازل کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب شازل قریب آیا تو یاسمین نے آگے بڑھ کر اسے آواز دی۔

''تم۔۔۔!'' شازل تیزی سے گھوما۔ ''تم یہاں کیا کررہی ہو؟''

''کچھ نہیں، ذرا سیر کرنے آئی تھی۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''اور آپ بھی غالباً سیر و تفریح کے لیے ہی آئے ہوں گے۔''

''نہیں۔۔۔ مجھے ڈاکٹر حامد نے بلایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یاسمین کے سلسلے میں کوئی مصالحتی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ٹول بیریئر کے پاس مل جائے گا مگر نہیں ملا۔ میں اپنی یادداشت کے سہارے خود ہی اس کی ہٹ کی طرف چل دیا اور کچھ دشواری سے وہ مل گئی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ فارم ہاؤس کا دروازہ باہر سے بند تھا میں نے کئی آوازیں دیں جب کوئی جواب نہیں ملا تو واپس لوٹ آیا۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے میرے اندھے پن کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی۔ خیر اسے چھوڑو میرے ساتھ گھر چلو مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔''

یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف شازل کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف بڑھ گئی۔ شازل نے ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ کھولا اور پہلے یاسمین کو اندر بیٹھنے کا موقع دیا۔ انسپکٹر ہاشم جوان دونوں کی پوری گفتگو سن چکا تھا کچھ حیران سا اپنے خیالات میں غرق ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ شازل نے بھی یاسمین کے ساتھ بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔ کار ایک خفیف جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ اب آگے کا کام انسپکٹر ہاشم کا تھا۔